اردو ادب کی
تصویری تاریخ
مرتب
ڈاکٹر عرفان پاشا
معاونین
ڈاکٹر زینت افشاں، ڈاکٹر عمارہ طارق
فاطمہ جلال، میمونہ ریاض، ڈاکٹر عمارہ رشید
شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
فیصل آباد کیمپس، بنک روڈ کیمپس
UNIVERSITY OF EDUCATION

اُردو اَدب کی تصویری تاریخ

مرتب ڈاکٹر عرفان پاشا

شعبہ اُردو، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
فیصل آباد کیمپس، بنک روڈ کیمپس

اشاعت اول: نومبر 2020ء
نام کتاب : اُردو اُدب کی تصویری تاریخ
مرتب : ڈاکٹر عرفان پاشا
سرورق : قیصر علی
ناشر : ڈاکٹر محمد عرفان احسن پاشا
شعبہ اُردو، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور۔
فیصل آباد کیمپس۔
فون: +92-321-4758717
+92-335-4758777
ای میل ایڈریس: pashajee4u@yahoo.com
طابع : قیصر علی
معراج دین پرنٹرز، اُردو بازار، لاہور۔
قیمت: 2500 روپے (پاکستان)
45 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
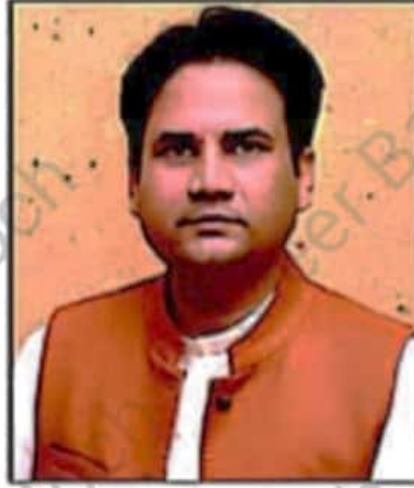
اُردو اَدب کی تصویری تاریخ
مرتب ڈاکٹر عرفان پاشا
معاونین
ڈاکٹر عمارہ رشید
ڈاکٹر عمارہ طارق
میمونہ ریاض
فاطمہ جلال
ڈاکٹر زینت افشاں
شعبہ اُردو، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
فیصل آباد کیمپس، بنک روڈ کیمپس
UNIVERSITY OF EDUCATION

اِنتساب

اُن تمام شاعروں، اُدیبوں کے نام جنھوں نے اُردو اَدب کی تخلیق کے لیے قلم اُٹھایا

اور

اُن تمام طالب علموں کے نام جنھوں نے اِس "تصویری تاریخ" کے لیے تعاون کیا۔

فہرست

معروضات

"اُردو اَدب کی تصویری تاریخ" میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے شعرا اور اُدبا کی تصویریں شوقیہ طور پر جمع کرنے کے دوران دیکھا تھا۔ میرے پاس اب بھی اُردو اَدب کے بیش تر لکھاریوں کی تصویریں موجود ہیں جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے محفوظ کی ہیں۔ ابتدا میں میرا ارادہ تھا کہ اِن تصاویر کو اچھے طریقے سے خود چینٹ کر کے شعرا و اُدبا کی ایک خوب صورت گیلری بناؤں گا تا کہ اُن باکمالوں کو خراجِ تحسین پیش کر سکوں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے میری سوچ کے لیے نئے نئے دریچے وا کیے۔ یونی ورسٹی کی تدریسی ملازمت میں گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے میرا رنگوں اور برش سے تعلق کم زور پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا اور اِس خواب کی تبدیل شدہ صورت یہ تھی کہ تصویریں کسی ماہر فوٹوگرافر سے اچھے انداز میں اور رنگین گیٹ اپ میں بنوائی جائیں۔ ساتھ یہ بھی سوچ شامل ہو گئی کہ ہر تصویر کے ساتھ اُن ادیبوں کا کچھ مختصر تعارف بھی شامل کر دیا جائے۔ یہ بات جب میں نے اپنے طالب علموں کے سامنے رکھی تو اُنھوں نے اِس پر لبیک کہا۔ میں نے علمی، عملی اور مالی تعاون کی دھمکی بھی دی مگر وہ قائم رہے اور اِس طرح ہم نے اِس منصوبے کا اپنی مدد آپ کے تحت آغاز کیا۔ پہلے مرحلے میں 83 ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر بڑے سائز میں بنوائیں اور اُنھیں فریم کروا کر فیصل آباد کیمپس میں اُردو اَدب کے نامی گرامی مصنفین کے حوالے سے ایک شان دار تصویری نمائش منعقد کی جسے خوب سراہا گیا۔ اُس کے بعد باقی ادیبوں کی تصویریں بنوانے کا مرحلہ تھا جو یقیناً ایک مشکل اور مہنگا کام تھا لیکن میرے طلبا نے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت ہی اُسے بھی پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ٹھان لی۔ اِسی اثنا میں میری، اِس ضمن میں، جنگ روڈ کیمپس، لاہور میں شعبہ اُردو کی سربراہ ڈاکٹر عمارہ طارق سے بات ہوئی تو اُنھوں نے اِس منصوبے کو احسن قرار دیتے ہوئے اِس میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اِس طرح یہ منصوبہ فیصل آباد کیمپس سے نکل کر جنگ روڈ کیمپس تک پہنچ گیا اور وہاں کی طالبات کی شمولیت سے ہمارا کام مزید آسان اور منزل تک پہنچنے کا راستہ مختصر ہو گیا۔

دُنیا بھر میں اَدب کی تصویری تاریخ کی مثال کے طور پر صرف ایک امریکی اَدب کی تصویری تاریخ میرے علم میں آئی ہے وہ بھی اِس طرح کہ اُس میں صرف شعرا و اُدبا کے قلمی خاکے شامل کیے گئے ہیں۔ اُردو میں یہ اولین اَدبی تاریخ ہے جو مصور بھی ہے اور اِس میں اُردو کے 270 نامی اور رُجحان ساز ادیبوں کی رنگین تصاویر شامل ہیں۔ اِس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جس ادیب کو شامل کیا جائے وہ اُردو اَدب میں کسی خاص اہمیت کا حامل یا رُجحان ساز ہو۔ تمام شعرا اور اُدبا کو سنِ پیدائش کے لحاظ سے زمانی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اِس سے ایک تو طلبائے تاریخِ اَدب اور عام شائقین، شعرا و اُدبا کی زمانی تقدیم و تاخیر سے واقف ہو کر سینئر اور جونیئر کا فرق رکھ سکیں گے اور دوسری طرف اُنھیں اُردو کے اَدبی سفر کے دوران رُجحانات اور تحریکوں کے تسلسل کو بھی یاد رکھنے میں سہولت اور آسانی ہوگی۔ ہر تصویر کے ساتھ دیے گئے مختصر مضمون یا شذرے میں چار باتیں شامل کی گئی ہیں۔ پہلے نمبر پر شاعر یا ادیب کے مختصر سوانح ہیں، اس کے بعد اس کی اَدبی اہمیت واضح کی گئی ہے کہ اُسے کس صنف میں دَرک حاصل تھا یا وہ اِس کا بانی تھا یا اُس کا تعلق کس تحریک سے تھا، پھر اُس کی تصانیف کا ذکر ہے اور آخر میں اُس کی شاعری یا نثر یا دونوں کا ایک ایک مختصر اقتباس دیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والے کو اُس خاص ادیب یا شاعر کے اُسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ کتاب میں صرف ادیبوں کو ہی شامل نہیں کیا گیا بل کہ اُردو کے بہترین مقرر، داستان گو، اور قرأت کار بھی موجود ہیں کہ بہر حال اُن کا تعلق بھی اُردو اَدب سے ہی ہے۔ اِس کتاب کی اصل خوبی اِس کی تصاویر ہیں جو بہت تلاش و تجسس سے حاصل کی گئی ہیں۔ اِن پر توجہ مرکوز کی جائے۔ شعرا کے بارے میں لکھے ہوئے شذرات طالب علموں نے لکھے ہیں اور اِن کو طالب

عالمانہ کوشش ہی سمجھا جائے۔ اِن میں آپ کو سنجیدہ طلبا کی محنت بھی نظر آئے گی اور کم زور اور کم سنجیدہ طلبا کی تساہل پسندی بھی۔ پھر بھی میں نے انھیں اپنی نظر کی چھلنی سے گزار کر غلطیوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ایک طرح کی یک سانیت لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوصف کتاب میں آپ کو اُسلوب کی رنگا رنگی دیکھنے کو ملے گی کہ یہ کسی ایک مصنف کی تحریر نہیں بل کہ متعدد طالب علموں کا ایک تحقیقی و اشاعتی منصوبہ ہے۔ کتاب میں خامیوں اور غلطیوں کے نہ ہونے کا کوئی دعوا نہیں۔ اگر آپ کوئی فاش غلطی محسوس کریں تو مجھے ضرور اطلاع کریں اور اگر کوئی معمولی سقم ہو تو اُسے بے شک نظر انداز کر دیں۔ اُردو اَدب کی اس سے پہلے کوئی ایسی باقاعدہ جامع تاریخ موجود نہیں جو آغاز سے لے کر اِکیسویں صدی تک کے اَدب کا احاطہ کرتی ہو۔ اس حوالے سے بھی ''اُردو اَدب کی تصویری تاریخ'' اہم ہے کہ اس میں گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر اِکیسویں صدی عیسوی تک کے ایک ہزار سالہ اُردو اَدب کے تقریباً سبھی زاویوں، تحریکوں اور رُجحانات کو شامل کیا گیا ہے اور وہ بھی مصور صورت میں۔ چند اہم اور قابلِ ذکر اَدیبوں کی تصاویر نہیں مل سکیں اِس لیے اُن کو اِس تاریخ میں فی الحال شامل نہیں کیا گیا۔ اگر اُن کی تصاویر دست یاب ہو جائیں تو یقیناً انھیں بھی سر آنکھوں پر بٹھا کر کتاب کی زینت بنایا جائے گا۔ ان ادیبوں میں پیر صدرالدین، سعد اللہ گلشن، جعفر زٹلی، خانِ آرزو، شاہ حاتم، شیر علی افسوس، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، رجب علی بیگ سرور اور امانت لکھنوی شامل ہیں۔ اگر کسی کے ذخیرہ میں اِن میں سے کسی اَدیب کی تصویر ہو تو اَزراہِ کرم دیے گئے پتے پر مجھے عنایت کیجیے تا کہ اِن کی وجہ سے پیدا ہونے والا ''اُردو اَدب کی تصویری تاریخ'' کا یہ خلا پورا ہو سکے۔

یہ کتاب کسی بھی مرحلے پر رُک جاتی اور یہ منصوبہ ختم ہو جاتا، اگر میرے لائق اور ہونہار شاگرد، ابدال رضا مجھے مہمیز نہ کیے رکھتے۔ یونی ورسٹی میں اِس منصوبے کے حالات مسلسل خراب ہوتے رہے اور کیے جاتے رہے۔ بہت سی ناگفتہ بہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں اور کئی بار میرا دل بھی اُچاٹ ہو گیا لیکن ابدال رضا نے مجھے اِس منصوبے سے دست کش ہونے سے باز رکھا اور میری ڈھارس بندھائے رکھی۔ اِس منصوبے میں مالی معاملات کو بہ حسن و خوبی انجام دینے، تصاویر ڈھونڈنے، فوٹوگرافر سے انھیں بہتر انداز میں بنوانے اور فریم کروانے، نمائش کے انتظامات کرنے، طلبا کے لکھے ہوئے شذروں کی اِدارت اور کتاب کی چھپائی کے تمام مراحل میں ابدال رضا نے میرے دستِ راست کا کردار ادا کیا ہے۔ میں اُن کا شکر گزار بھی ہوں اور اُن کی مزید کام یابیوں کے لیے دعا گو بھی ہوں۔ اس منصوبے میں بھرپور معاونت کے لیے اپنی رفقائے کار ڈاکٹر زینت افشاں، محترمہ فاطمہ جلال، محترمہ میمونہ ریاض اور بنک روڈ کیمپس سے ڈاکٹر عمارہ طارق اور ڈاکٹر عمارہ رشید کا بھی شکر گزار ہوں۔ تصاویر کی فراہمی کے سلسلے میں میرے دوست محمد نوید انور (لائبریرین جی سی یو، لاہور) پروفیسر محمد اکرام خالد، پروفیسر مہر محمد الیاس اور جناب عقیل عباس جعفری کا شکریہ ادا کرنا میرا خوش گوار فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ تصاویر کو خوب صورت بنانے، بلیک اینڈ وائٹ سے کلر کرنے اور اِن کی اعلا پرنٹنگ کے لیے میں فوٹوگرافر عمران مغل اور شامی سٹوڈیو کے مہتمم جناب اطہر شامی کا بھی شکر گزار ہوں۔ آخر میں اِس کتاب کو دیدہ زیب انداز میں ڈیزائن کرنے اور خوب صورت انداز میں طبع کرنے کے دوران ہماری طرف سے کی جانے والی ہر گستاخی کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے اور بار بار تبدیلی کرنے اور اس کی اطلاع پہنچانے اور اس منصوبے کے آخری مرحلے کو اَحسن طریقے سے انجام دینے کے لیے برادرم قیصر معراج بھی شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دعا گو ہوں کہ خدائے ذوالجلال اِس منصوبے میں کسی بھی حوالے سے مددگار ثابت ہونے والے ہر فرد کو اپنی برکتوں سے نوازے۔

ڈاکٹر عرفان پاشا

اُردو ادب کا اجمالی خاکہ

(از: ڈاکٹر عرفان پاشا)

اُردو اَدب کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو یہ ہمیں گیارھویں صدی عیسوی تک کچھ روشن نظر آتی ہے۔ غزنوی دور میں مسعود سعد سلمان لاہوری کا ذکر ملتا ہے، جنھوں نے اُس وقت فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندوی (موجودہ اُردو) میں بھی دیوان مرتب کیا اور اِس کی شہادت امیر خسرو نے "غرۃ الکمال" اور محمد عوفی نے "لباب الالباب" میں دی ہے۔ اُن کا اُردو یا ہندوی کلام تو موجود نہیں لیکن اُردو اَدب میں فی الوقت تک جو قدیم ترین نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ مسعود سعد سلمان لاہوری کا ہی ہے۔

بارھویں صدی میں صوفیانہ و مذہبی شاعری کے کچھ کچھ نمونے ملتے ہیں لیکن ابھی مقامی زبان ہندوی، حکم رانوں کی زبان فارسی کا مقابلہ کرنے کے لائق نہیں لیکن صوفیا اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنی گفتگو اور شاعری میں اِسی مقامی زبان کا سہارا لیتے تھے۔ ان صوفیا میں خواجہ معین الدین چشتی اور بابا فرید گنج شکر نمایاں ہیں۔

تیرھویں صدی میں امیر خسرو نے اُردو شاعری کو اپنے ریختہ، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں اعتبار بخشا لیکن اُن کے دور کی کوئی دستاویز دست یاب نہیں ہو سکی۔ ان کا بیش تر کلام قوالوں کے ذریعے نسل در نسل سماع کی صورت میں منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا اور کئی صدیوں بعد مرتب ہوا۔ اِس میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تحریف و تبدل ہونے کا قوی امکان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو کی شاعری کی اصلیت کے حوالے سے سوال اٹھتے ہیں۔ اُسی دور میں اِسماعیلیوں کے پیشوا پیر صدر الدین سیہ گرنور نے "گنان شاعری" کا آغاز کیا۔ حمد، نعت اور منقبت کے موضوعات پر مبنی یہ شاعری اُردو (ہندوی) کے علاوہ دیگر کئی مقامی زبانوں میں بھی کی گئی اور یہ مذہبی عقیدت اور قرات کے باعث بہت حد تک محفوظ بھی ہے۔ پیر صدر الدین المعروف پیر ست گرنور کے یہ گنان نا صرف اب بھی موجود ہیں بل کہ آسانی سے دست یاب اور قرات پذیر ہیں۔ اِن کو اُردو کے قدیم ترین دستیاب متون میں شمار کیا جانا چاہیے۔

چودھویں صدی کا زمانہ مذہبی و نیم اَدبی شاعری و نثر کے حوالے سے اہم مانا جاتا ہے۔ اس دور میں صوفی شعرا بھی اپنی شاعری کے توسط سے اپنی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو وحدت اور انسانیت کا درس دے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اُردو نثر کا بھی ڈول ڈالا گیا تھا جب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی کتاب "معراج العاشقین" کے لیے شاعری کی بجائے نثر کو انتخاب کیا تو یہ اُردو میں نثر کی پہلی کتاب وجود میں آئی۔

پندرھویں صدی عیسوی کا زمانہ زیادہ تر بھگتی شاعری سے منسوب ہے۔ یہ بھگتی تحریک کا زمانہ تھا جس میں بھگت کبیر اور گرونانک جیسے بھگتی مت کے پیرو شعرا نے اُردو شاعری میں اپنی ذات کی نفی کر کے لوگوں کی خدمت کا درس دیا اور اپنی عوامی شاعری میں عوامی مسائل، لوک دانش اور تصوف کا رس پیش کیا۔

سولھویں صدی میں ایک طرف تو بھگتی تحریک کا تسلسل ہی جاری رہا اور میرابائی اور شاہ حسین جیسے شعرا نے اِسے آگے بڑھایا اور دوسری طرف دکن کی سرزمین میں اُردو اَدب کا وہ اَکھوا پھوٹا جس نے دکنی اَدب کی صورت میں ایک چھتنار درخت بننا تھا اور جو بعد میں اُردو کا سب سے پہلا بڑا اَدبی پڑاؤ ثابت ہوا۔ ملا وجہی، قلی قطب شاہ اور غواصی جیسے بڑے شعرا نے اس عہد کو اَدبی طور پر زرخیز کیا۔

سترھویں صدی میں دکنی اَدب کی اِس شان دار روایت کو نصرتی، عبداللہ قطب شاہ، ابن نشاطی، علی عادل شاہ ثانی اور رستمی جیسے شعرا نے آگے بڑھایا اور اس دکنی روایت کو انتہائے عروج، ولی دکنی نے بخشی۔ شمالی ہند میں بھی صوفی شعرا اُردو کو بہ طور ذریعہ اظہار شاعری میں استعمال کرتے رہے۔

اٹھارھویں صدی میں دکن میں سراج اورنگ آبادی نے دکنی اَدب کو مزید فروغ دیا اور دوسری جانب ولی دکنی کے دیوان کی دہلی میں مقبولیت کے باعث شمالی ہند میں اُردو اَدب کو بہت فروغ ملا۔ سراج الدین علی خان آرزو کی سرکردگی میں اُردو اَدب کی پہلی تحریک سامنے آئی جو ایہام گوئی کی تحریک کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہندی دوہوں اور فارسی میں صنعت ایہام کے کام یاب استعمال کے تتبع میں اُردو کی یہ ابتدائی تحریک اچھی خاصی متاثر کن اور کام یاب رہی لیکن فحاشی اور ابتذال کی وجہ سے اس کے خلاف ردِ عمل کی تحریک اٹھی جو ایہام گوئی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی۔ حتیٰ کہ شاہ حاتم جیسے شعرا نے اپنے دیوان سے ایہام پر مبنی اشعار کو چن چن کر نکال دیا اور "دیوان زادہ" تیار کیا۔ اس ردِ عمل کے نتیجے میں سادہ گوئی کی تحریک شروع ہوئی جس نے اُردو اَدب کو عروج بخشا اور یہ تحریک زم رو ہونے کے باوجود اتنی کامیاب ہوئی کہ اُس دور کو اُردو کا دورِ زریں کہا جاتا ہے کیوں کہ اُسی زمانے میں میر تقی میر کی غزل، محمد رفیع سودا کے قصیدے اور میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کی صورت میں اِن اصناف کا منتہائے کمال سامنے آیا۔ لکھنو میں اِصلاح زبان کی تحریک شروع ہوئی اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی اور انشا اللہ خان انشا کے ہاتھوں زبان کے اصول اور ضوابط قائم کیے جانے لگے۔ آگرہ میں نظیر اکبر آبادی اُردو نظم کو بامِ عروج تک پہنچانے اور اَدب کو عام انسانوں کے جذبات، حالات، خیالات اور احساسات کا ترجمان بنانے میں منہمک ہوئے۔ اِسی صدی میں دیگر زبانوں بالخصوص فارسی سے نثری تراجم ہونا شروع ہوئے اور میر عطا حسین خان تحسین نے "قصہ چہار درویش" کا اُردو ترجمہ "نوطرزِ مرصع" کے نام سے کیا۔ یہاں تک آتے آتے مغربی سامراجیوں کا رسوخ کافی بڑھ چکا تھا اِس لیے اُن کے علمائے اُردو یا مستشرقین کی اُردو میں دل چسپی سامنے آئی اور مغربی مصنفین اور حکم رانوں نے اُردو اَدب کو سمجھنے کی کوششیں شروع کیں اور اسے اپنے ہم زبانوں کے لیے سہل بنانے کی بھی کوشش کی۔

اُنیسویں صدی کا آغاز ہی فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوا۔ کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں قائم کیے جانے والے اس کالج کا بنیادی مقصد تو انگریز حکمرانوں اور افسر شاہی کو مقامی زبان یعنی اُردو سے روشناس کروانا تھا جس کے لیے اُنھوں نے اُردو میں دل چسپ اَدبی کتابیں لکھوائیں، ترجمہ کروائیں اور قواعد اُردو کو بھی تحریر کروایا۔ اَفسروں کو اُردو سکھانے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و اَدب کا بھی بھلا ہو گیا اور اُردو نثر کا پہلا سب سے بڑا پلیٹ فارم وجود میں آیا جس سے اُردو زبان اور اَدب کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ جان گل کرسٹ نے اُردو انگریزی کی پہلی لغت تیار کی اور اُردو زبان کے قواعد پر بھی کام کیا۔ لکھنو میں آتش و ناسخ کا دور اِصلاح زبان کی تحریک کے طور پر اہم رہا جس میں اُردو زبان پر بالخصوص توجہ دی گئی متعدد قدیم نامانوس اور غیر فصیح الفاظ اور طریقوں کو متروک قرار دے کر اُردو کو "شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا" کہہ کر زیادہ فصیح، واضح، آسان اور جامع زبان بنا دیا گیا۔ لکھنو میں ہی میر انیس اور میرزا دبیر نے مرثیے کی صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ دہلی میں آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر خود شاعر اور شاعر پرور تھا۔ شاہ نصیر، شیخ ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن اور مرزا غالب جیسے شعرا نے اُس دور میں شاعری اور بالخصوص غزل کو وہ مقام عطا کیا کہ یہ اُردو کی سب سے بڑی اور سب سے مقبول صنف بن کر منظرِ عام پر آئی۔ غالب نے نثر میں ایک نئی طرح ڈالی

اور مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ اس طرح اُردو نثر تکلفات کے پردے سے نکل کر بول چال کی زبان سے آنکھ ملانے لگی۔ اٹھارہ سو ستاون میں ہندستان کو اپنے سب سے بڑے سیاسی اور تہذیبی جھٹکے کو برداشت کرنا پڑا جب انگریزوں نے ہندستان پر ساڑھے سات سو سالہ مسلم حکومت کی بساط لپیٹ دی۔ اس سے صدیوں میں وجود پانے اور اپنا عروج دیکھنے والی مشترکہ ہند اسلامی تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ صرف ایک حکومت کا خاتمہ نہیں بل کہ ایک دور، ایک تہذیب اور ایک ثقافت کا خاتمہ تھا۔ اس تبدیلی نے ہندستان کو ایک نئی اینگلو انڈین تہذیب سے روشناس کروایا جس کے مظاہر ہمیں آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی طور پر اُوپر لانے کے لیے سر سید احمد خان نے بے مثال خدمات سرانجام دیں۔ اُن کی علی گڑھ تحریک نے سیاسی اور سماجی کے ساتھ ساتھ اَدبی محاذ بھی سنبھال لیا اور پہلی بار اُردو اَدب میں مقصدیت کو شامل کیا گیا اور یہ باور کیا گیا کہ اَدب کو کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ علی گڑھ تحریک نے اُردو کے عناصر خمسہ (سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد وغیرہ) کی بہ دولت متعدد نئی اصناف کو جنم دیا۔ اِن میں مضمون، انشائیہ، ناول، سوانح اور تنقید وغیرہ شامل ہیں۔ سر سید کی مخالفت میں اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کا رنگ اختیار کیا اور قومی شاعری کی۔ لاہور میں انجمن پنجاب نے اُردو میں طرح مصرع پر غزل کے روایتی مشاعروں کے بجائے خاص موضوع پر نظمیں لکھوا کر اماہ وار مناظموں کی روایت شروع کی جس کے روحِ رواں مولانا محمد حسین آزادؔ تھے اور اس انجمن کے مناظموں میں دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالیؔ بھی شرکت کرتے رہے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے "آب حیات" سے اُردو میں تنقید کا نقشِ اوّل قائم کیا اور مولانا الطاف حسین حالیؔ نے "مقدمہ شعر و شاعری" کے ذریعے اِسے ایک نہایت مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔

بیسویں صدی میں اُردو اَدب کو سب سے زیادہ تحریکوں اور تبدیلیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اِس صدی کا آغاز رومانوی تحریک سے ہوا۔ 1901ء میں شائع ہونے والا سر عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" اس کا اولین نقیب تھا۔ پھر اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی نے رومانوی شاعری اور سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار نے رومانوی نثر کو پروان چڑھایا۔ یہ انگریزی کی رومانوی تحریک کے ٹھیک سو سال بعد شروع ہوئی تھی۔ اُسی دور میں علامہ محمد اقبال، جو اپنی ذات میں خود ایک تحریک تھے، نے قومی شاعری کو معراج عطا کی اور برصغیر کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر بے دار کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خان اور حفیظ جالندھری نے بھی قومی شاعری کے حوالے سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ 1936ء میں اُردو میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے "انگارے" کے نام سے شائع ہونے والی کتاب نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور اس سے ترقی پسند تحریک کی راہ ہم وار ہو چکی تھی۔ کارل مارکس کے نظریات اور انقلاب روس سے متاثر اِس تحریک کا اصل مقصد سیاسی انقلاب تھا لیکن اس کے حصول کے لیے اَدب کو بہ طور ہتھیار یا منادا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سیاسی مقصد تو پورا نہ ہوا، البتہ اُردو اَدب کی سب سے زوردار تحریک ضرور معرض وجود میں آ گئی اور اَدب کو نعرہ بنانے کا بھی تجربہ کیا گیا۔ سجاد ظہیر کی راہ نمائی میں اِس تحریک نے بھرپور توجہ حاصل کی اور سیاسی بے داری کے ساتھ ساتھ اَدب کو بھی ایک بڑے تحرک سے دوچار کیا۔ فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، نے ترقی پسند شاعری اور منشی پریم چند، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر نے ترقی پسند نثر کو فروغ دیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سب سے زیادہ افسانے اور نظم کی ترقی ہوئی۔ 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس سے اِس تحریک کو مجبوری طور پر بند ہونا پڑا جب اس کے راہ نما روپوش اور گرفتار ہو گئے لیکن اس

کے بعد سے یہ ایک مسلسل سرگرمی کے طور پر جاری ہے اور اس کی متعدد شاخیں مختلف ملکوں اور شہروں میں قائم ہیں۔1939ء میں لاہور میں نصیر احمد جامعی کے گھر پر چند ادیبوں نے جمع ہو کر ایک اَدبی جلسہ کیا۔ بعد میں اس کو تسلسل حاصل ہوا اور اُس کا نام "بزم داستان گویاں" رکھ دیا گیا جو بعد میں تبدیل ہو کر "حلقہ اربابِ ذوق" میں ڈھل گیا۔ میراجی نے اس حلقے کو حقیقی معنوں میں ایک اعلا اور ارفع اَدبی سرگرمی میں منقلب کیا اور موقع پر ہی شاعر یا ادیب کی موجودگی میں اس کے پیش کیے گئے فن پاروں پر مجلسی تنقید کا آغاز کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق نے کسی نظریے یا نعرے سے لاتعلقی ظاہر کی اور ہر طرح اور ہر سوچ کے حامل اَدب کی حوصلہ افزائی کی۔ حلقہ اربابِ ذوق کا منشور اَدب برائے اَدب تھا۔ حلقہ اربابِ ذوق نے بھی نشیب و فراز دیکھے۔ اِس کا سیاسی دھڑا اور اَدبی دھڑا الگ الگ ہو گئے مگر کچھ عرصہ بعد یہ پھر یک جا کر دیے گئے۔ حلقہ اربابِ ذوق اُردو اَدب کی تاریخ کی طویل ترین سرگرمی ہے جو دمِ تحریر قریباً اَسّی برسوں سے مسلسل جاری و ساری ہے۔ اسی زمانے میں مغرب سے متاثر ہو کر ن م راشد نے آزاد نظم کے ذریعے اُردو شاعری کو قافیے ردیف جیسی جکڑبندیوں سے آزاد کر دیا اور مجید امجد نے اپنی صدیوں پرانی مقامی تہذیب سے جرأت اور ہیئتوں کے نئے نئے تجربات سے اُردو شاعری کو ثروت مند کیا۔ 1947ء میں ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرض وجود میں آیا۔ یہ سیاسی، تہذیبی اور سماجی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اَدب کے لیے بھی ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت اور فسادات نے اَدب کا رخ تبدیل کیا اور اُردو میں فسادات کا اَدب وجود میں آیا جس میں فسادات کی ہول ناکی اور انسانوں کی بے بسی کے ساتھ ساتھ ان کی بربریت کو بھی موضوع بنایا گیا۔ سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر نے اِس ضمن میں بے باک حقیقت نگاری سے اپنے افسانوں میں فسادات کی حقیقی تصویر پیش کی۔ کچھ ہی عرصے میں اَمی جمی ہونے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ پاکستان بننے کے بعد اَب نئے سماج اور نئے ماحول کے مطابق نئے اَدب کی ضرورت ہے جو پاکستانی معاشرے کے مسائل کے حوالے سے ہو۔ اِس مقصد کے لیے پاکستانی اَدب کی تحریک وجود میں آئی۔ محمد حسن عسکری اور دیگر نے اس کو ایک مضبوط نظریاتی بنیاد فراہم کی لیکن بڑے تخلیق کاروں کی عدم دست یابی کے باعث یہ تحریک زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ ارضی ثقافتی تحریک بھی بیسویں صدی کے نصف کے بعد میں شروع ہوئی جس کا مقصد اَدب میں ارضی اور ثقافتی قدروں کو اجاگر کرنا تھا۔ نئی مملکت جس کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور اس کو اسلامی شعائر کی تجربہ گاہ بنانا تھا، اِس خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلامی اَدب کی تحریک کا آغاز کیا گیا جسے نعیم صدیقی اور ماہر القادری جیسے شعرا نے پروان چڑھایا۔ اَدب کو مذہبی اقدار اور اَخلاقیات کے تابع کرنے کی شعوری کوشش کی گئی جو کافی حد تک کام یاب بھی رہی۔ جدید اُردو فکشن میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین نے اپنے اپنے انداز میں خوب نام کمایا۔ اسی طرح جدید اُردو شاعری میں احمد فراز، منیر نیازی اور ظفر اقبال نمایاں ہیں۔ ستر کی دہائی میں جدیدیت کی تحریک سامنے آئی جس کا مقصد تمام قدیمی سانچوں اور زاویوں، چاہے وہ موضوعی ہوں یا ہیئتی، کو توڑ کر اَدب کے لیے نیا طور طریقہ اور انداز تلاش کرنا تھا۔ اُسی دور میں نثری نظم کی تحریک نے جنم لیا۔ اِس کے بنیاد گزاروں میں افتخار جالب، عباس اطہر، تبسم کاشمیری، سعادت سعید اور زاہد ڈار شامل تھے۔ ابتدا میں نثری نظم کی بہت مخالفت ہوئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اور نثری نظم نگاروں کی لگن اور پامردی کے باعث اِس کو بھی قبول کر لیا گیا اور اب نثری نظم اُردو اَدب کا ایک وسیع حصہ ہے۔ یہی دور تھا جب مروج زبان کو ناکافی سمجھتے ہوئے اُس کے ڈھانچے میں تبدیلی کا اعلان کیا گیا، اور اِسے "لسانی تشکیلات" کا نام دیا گیا۔ اِس کو بھی افتخار جالب نے ہی شروع کیا تھا۔ لسانی تشکیلات کے تحت نئے الفاظ، مرکبات اور افعال کی تشکیل کی گئی اور "تلاش کرنا" جیسے مرکب افعال کو ملا کر ان

سے ''ملاشنا'' جیسے نئے مفرد فعل بنانے کی سعی کی گئی۔ اس دور میں مزید مغربی رُجحانات نے اُردو اَدب میں ورود کیا جن میں ساختیات ایک اہم رجحان تھا جس کا منشا یہ تھا کہ تحریر سے مصنف کو منہا کر کے صرف اس کی بناوٹ اور ہیئت سے ہی مطالب و معانی کا استخراج کیا جائے۔ اس رجحان کی شدت پسندانہ نوعیت کے پیشِ نظر اس کا ردِعمل پس ساختیات کی صورت میں سامنے آیا اور فن پارے کی تفہیم کے لیے مصنف اور اُس کے گرد و پیش اور اُس کے سیاسی و سماجی حالات کو بھی معاون قرار دیا گیا۔ اس عہد میں سب سے زیادہ، ہیئتی و تکنیکی تجربات کیے گئے اور بالخصوص مغرب کے اَدب اور تنقید میں آنے والے رجحانات کی بازگشت اُردو اَدب میں بھی سنائی دینے لگی۔ حقیقت نگاری کے بعد عظیم حقیقت نگاری یا سپر ریلزم کا بھی چرچا ہوا جس کو سرریلزم کا نام دیا گیا۔ اس میں حقیقت اور ماورائے حقیقت کو ملا کر ایک طلسمی، مابعد الطبیعیاتی اور غیر مرئی سی کیفیت پیدا کی گئی۔ سرریلزم پر مبنی افسانوں کے حوالے سے سلطان محمود آشفتہ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اِسی صدی میں ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والے پاپولر لٹریچر یا مقبول عام اَدب نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا اور بہت سے لکھنے والوں کو متعارف کروایا جن میں ابنِ صفی، مظہر کلیم، رضیہ بٹ، عمیرہ احمد وغیرہ شامل ہیں۔ مقبول عام اَدب اپنے حجم میں بہت وسیع تھا کیوں کہ سیکڑوں ماہ وار رسالوں اور ڈائجسٹوں میں ہزاروں کہانیاں ماہ بہ ماہ چھپتی تھیں۔ اِن ڈائجسٹوں نے خاص طور پر گھریلو خواتین کو پڑھنے کی جانب راغب کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی اُردو ڈرامہ نگاری کے لیے بھی بہت اہم ثابت ہوئی۔ سٹیج کے لیے ڈرامے لکھنے کا جو سلسلہ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اِس صدی کے آغاز میں شروع کیا اور جسے آغا حشر کاشمیری نے عروج عطا کیا وہ بیسویں صدی کے آخر تک نا صرف جاری رہا بل کہ اُس کے بہت سے نئے پہلو بھی سامنے آئے اور ریڈیو ڈرامہ، ٹی وی ڈرامہ اور فلم کی کہانی کی صورت میں اس میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ڈرامے کی اِن شکلوں کو پروان چڑھانے والے بھی اُردو کے نامی ادیب اور شاعر ہی تھے۔ اِسی طرح فلمی شاعری بھی اِسی صدی کی دین ہے۔ اِسی صدی میں اُردو صحافت کو بھی بے پناہ فروغ اور عروج حاصل ہوا اور بلا مبالغہ ہزاروں اخبارات اور رسالے منظرِ عام پر آئے۔ عام اخبارات میں اَدبی ایڈیشن شامل کیے گئے اور خالص اَدبی رسائل و جرائد بھی بڑی تعداد میں سامنے آئے۔

اِکیسویں صدی کے پہلے بیس سالوں میں اِنٹرنیٹ کی آمد اور ذرائع نقل و حمل کی تیزی بالخصوص میڈیا کی ترقی کی وجہ سے انسانی زندگی بہت تیزی سے تغیر پذیر ہے۔ اِس صدی کا آغاز ہی نائن الیون جیسے واقعے سے ہوا اور دُنیا بھر میں دہشت گردی کی ایک لہر چل گئی جو ہماری عمومی زندگی میں بھی ظاہر ہوئی اور اُردو اَدب میں بھی۔ اِسی طرح عالم گیریت یا گلوبلائزیشن کی وجہ سے دنیا گلوبل ویلج بن گئی اور ایک دوسرے پر اِنحصار بہت زیادہ بڑھ گیا مقامیت اور مقامی شناخت تقریباً ختم ہوگئی جس سے اُردو اَدب بھی عالم گیر یا گلوبلائزڈ ہوگیا اور اس میں عالم گیر موضوعات اور مسائل کی نشان دہی کی جانے لگی۔ اِسی طرح اَدب میں نوآبادیات کا رُجحان شامل ہوا جس نے اس خطے میں مغربی استعمار کے زمانے میں لکھے اَدب کا از سرِ نو جائزہ لیا اور اس کے بعد پس نوآبادیات کے رُجحان کے ماتحت ایسا اَدب اور تنقید سامنے آئی جو نوآبادیات کے نتائج اور اَثرات کے حوالے سے تھی۔ جدید ترین اُردو فکشن میں شمس الرحمٰن فاروقی، مرزا اطہر بیگ اور مشرف عالم ذوقی نمایاں ہیں جب کہ جدید ترین شاعری میں رفیق سندیلوی، منصور آفاق، افتخار نسیم اور متعدد دیگر نام اہم ہیں جن کا ابھی شمار ممکن نہیں۔ اکیسویں صدی کا پہیہ ابھی برق رفتاری سے رواں ہے، اس کے اختتام تک کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ معاشرے اور اَدب دونوں کی صورت حال کیا ہوگی؟

مسعود سعد سلمان
1048ء تا 1121ء

مسعود سعد سلمان 1048ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباؤ اجداد ہمدان (ایران) سے آئے تھے۔ مسعود لاہور اور غزنی کے درباروں میں شاعر کے طور پر منسلک رہے۔ اُن کی ابتدائی زندگی عہدِ غزنوی میں لاہور دربار میں بسر ہوئی۔ سلطان ابراہیم کے ساتھ معاملات میں پیچیدگیوں کی وجہ سے اُنھیں تقریباً دس سال نائی قلعہ میں قید رکھا گیا۔ رہائی ملنے کے بعد مسعود سعد سلمان دوبارہ لاہور آ گئے۔ آئے دن بادشاہوں کے تخت الٹ رہے تھے اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ایک بار پھر اُن کو اپنی رہائش گاہ پر قید کر دیا گیا۔ قید کے دوران لکھی جانے والی نظمیں ان کی شان دار نظموں میں سے ہیں۔ ان کو "قیدی شاعر" بھی کہا جاتا ہے۔ مسعود سعد سلمان کی مقامی زبان 'ہندی یا ہندوی' تھی اسی وجہ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اِس زبان میں بھی شاعری کی ہوگی۔ بدقسمتی سے اُن کا "ہندوی دیوان" آج موجود نہیں البتہ امیر خسرو' غرۃ الکمال" کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "مسعود سعد سلمان را اگر ہست اما آں دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندی است و در پارسی مجرد' عوفی بھی اُن کے ہندی دیوان کے بارے میں بیان کرتے ہیں: "اُو راسہ دیوان است یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی" اِن دو شاعروں کا بیان اس خیال کو پختہ کرتا ہے کہ مسعود سعد نے ہندوی (اُردو) میں شاعری کی ہے۔ یہ بیان اُردو ادب کی قدیم ترین دست یاب شہادت فراہم کرتے ہیں۔ مسعود کی فارسی شاعری میں بھی ہندی الفاظ کا چلن ملتا ہے مثلاً: "برکت، مارامار، برشکال" وغیرہ۔ اُن کا ہندوی دیوان تو زمانے کی نذر ہو گیا مگر اُن کا فارسی میں اِس زبان کا چلن اِس بات کو عیاں کرتا ہے کہ وہ ہندوی جانتے تھے اور اِس زبان میں لکھتے تھے۔ "بارہ ماسہ" کی روایت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی ایجاد ہے یا پھر اُنھوں نے اِس صنف کو پہلے استعمال کیا جسے آج اُردو میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے 1121ء میں وفات پائی۔

نمونہ کلام:

چو معطو دبر تخم وفور برکت' — بر آمد از پس دیوار حصن' مارامار'

'برشکال' اے بہار ہندستان — از گل سوری رخ تو' یادگار'

تحریر: رائے علی مقدس

معین الدین چشتی
1142ء تا 1236ء
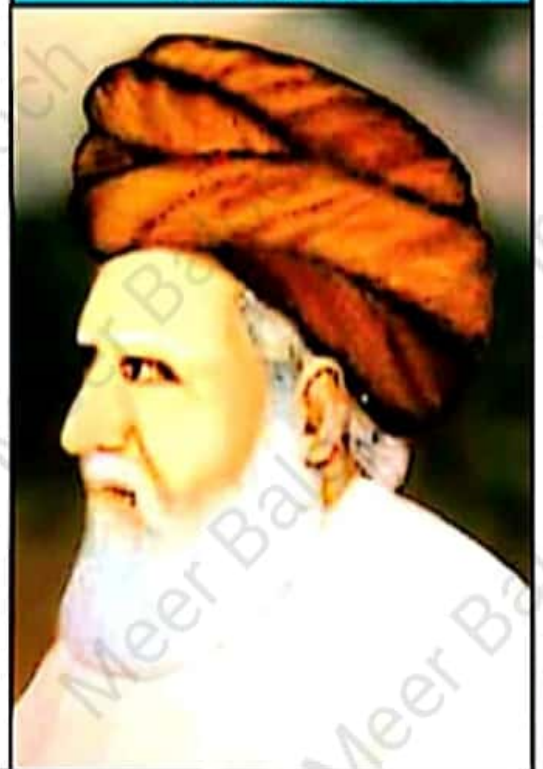
حضرت خواجہ سید محمد معین الدین چشتی اجمیری آپ کا پورا نام ہے۔ آپ خراسان (ایران) میں 12 فروری 1142ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں آپ کا نام حسن تھا۔ آپ نسلی اعتبار سے نجیب الطرفین، صحیح النسب سید تھے۔ آپ کا شجرہ بارہ واسطوں سے حضرت علی سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد خواجہ غیاث الدین حسین امیر، تاجر اور با اثر شخص تھے۔ آپ کی پندرہ سال عمر تھی جب آپ کے والد گرامی کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا، آپ کو آپ کی والدہ محترمہ نے حوصلہ دیا لیکن ابھی والد کے وصال کو ایک سال گزرا تھا کہ آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ والدین کی وفات کے بعد باغ بانی کا پیشہ آپ نے اختیار کیا۔ آپ ہندستان میں سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے۔ آپ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین گنج شکر جیسے عظیم الشان پیرانِ طریقت کے مرشد ہیں۔ غریبوں کی دست گیری اور ہر کہ ومہ کی بندہ پروری کرنے کے باعث عوام نے آپ کو غریب نواز کا لقب دیا جو آج بھی زبان زدِ عام ہے۔ سلسلہ چشتیہ ہندستان میں آپ سے پھیلا اور لاکھوں آدمی آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ علوم ظاہری کے بعد آپ نے علوم باطنی کے لیے عراق کا رخ کیا اور اپنے زمانے کے مشہور بزرگ خواجہ عثمان ہارونی کی خدمت میں اڑھائی سال رہے۔ سفرِ بغداد کے دوران آپ کی ملاقات شیخ نجم الدین کبریٰ سے ہوئی اور آپ اڑھائی ماہ تک ان کے ساتھ رہے اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ آپ صوفی شاعر تھے اور تصوف کی وجہ سے مشہور تھے۔ آپ کا وصال 15 مارچ 1236ء کو اجمیر میں ہوا۔ آپ کی درگاہ مرجع خلائق ہے اور ہندو، سکھ مسلمان سب وہاں حاضری دیتے ہیں۔

تصانیف: انیس الارواح۔ گنج اسرار۔ دلیل العارفین۔ بحر الحقائق۔ اسرار الواصلین۔ رسالہ وجودیہ۔ کلمات خواجہ معین الدین چشتی۔ دیوان معین الدین چشتی۔

نمونہ کلام:

معین برآئی بمعبر بگوی تگینہ عشق — کہ بلبل چمن عشق درز نانہ توئی

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا — ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

تحریر: سونیا نیاز

فرید الدین مسعود گنج شکر
1173ء تا 1266ء

شیخ العالم حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی پیدائش 1173ء میں ہوئی۔ آپ بارھویں صدی کے مسلمان مبلغ، ممتاز صوفی بزرگ اور شاعر ہیں۔ بابا فرید الدین گنج شکر کا اصل نام مسعود اور لقب فرید الدین، شکر گنج، بابا فرید اور شہباز لامکاں تھا۔ آپ کا خاندانی نام فرید الدین مسعود ہے۔ آپ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ مولوی عبدالحق نے آپ کو اُردو ادب کی آب یاری کرنے والے صوفی شعرا میں شمار کیا ہے۔ آپ پنجابی کے پہلے شاعر بھی مانے جاتے ہیں۔ ملتان میں دورانِ تعلیم آپ کی ملاقات خواجہ بختیار کاکی سے ہوئی اور آپ ان کے مرید بن گئے۔ اپنے مرشد کے کہنے پر آپ بین الاقوامی اور سماجی تعلیم کے لیے قندھار اور دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ چشتیہ سلسلے کے تیسرے سربراہ بن گئے۔ آپ خواجہ نظام الدین اولیا کے مرشد تھے۔ آپ سب کچھ چھوڑ کر اجودھن (پاکپتن) جو اس وقت قبرستان تھا، وہاں قیام کیا۔ آپ کے پاس عالم دور دور سے قواعد اور زبان دانی کے مسائل حل کروانے آتے تھے۔ تصوف میں ہی آپ نے اپنا نام پیدا کیا۔ آپ مسجد اقصیٰ کے جاروب کش اور چلہ کش تھے۔ آپ نے شام اور اُس کے گرد و نواح میں انسانوں کو دیکھا تھا جو صلیبی جنگوں سے شکستہ حال تھے۔ آپ بڑی مشکل کے ساتھ اپنے وطن پہنچے تو وہاں بھی آپ نے شکستہ حال انسانوں کو دیکھا۔ ایسے زمانے میں ہی بابا فرید الدین گنج شکر نے روٹی کو دین کا چھٹا رکن کہا تھا۔ اس پر لوگوں نے آپ پر طنز کیا۔ آپ کا کلام اشلوک کی صورت میں سکھوں کی مذہبی کتاب "گرو گرنتھ" میں موجود ہے۔ ان اشلوکوں میں، جو اشعار یا مختصر نظموں کی صورت میں ہیں، آپ نے روحانی معاملات کو نہایت خوبی اور اختصار سے بیان کیا ہے۔ یہ اشلوک معرفت اور سلوک کے لیے راہ نما تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ اشلوک بھی اُردو کے قدیم ترین نمونوں میں سے ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکر نے 1266ء میں وفات پائی۔

تصانیف: اشلوک (مشمولہ گرو گرنتھ صاحب): حکیمانہ کلام۔ بابا فرید: انتخاب کلام۔ کلام بابا فرید۔

نمونہ کلام:
اٹھ فریدا! وضو ساز صبح نماز گزار — جو سر سائیں نہ نوے سو سر کپ اتار

تحریر: عائشہ سرفراز

امیر خسرو
1253ء تا 1325ء

امیر خسرو 1253ء میں بہ مقام پٹیالی پیدا ہوئے۔ اصل نام ابوالحسن یمین الدین تھا مگر بعد میں امیر خسرو کے نام سے شہرتِ دوام حاصل کر گئے۔ اُن کے آبا و اجداد چنگیز خاں کے عہد میں ماوراالنہر سے ہندستان آئے۔ اُن کے نانا عماد الملک سلطان بلبن کے وزیر جنگ تھے۔ جوانی میں امیر خسرو، شمس الدین التمش کے دربار دہلی سے وابستہ رہے۔ امیر خسرو نے یکے بعد دیگرے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور معز الدین کیقباد سے لے کر سلطان محمد تغلق تک خود پانچ بادشاہوں کے دربار سے منسلک رہے۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے ترنم کے ساتھ خواجہ اصیل، نائب کوتوال کے ہاں کلام پڑھا جہاں سے اُن کی شہرت ہوئی۔ اُن کی وجہ شہرت اُن کا موسیقی سے لگاؤ بھی تھا۔ اُنھوں نے طبلہ، ستار، مردنگ اور کئی دیگر آلاتِ موسیقی ایجاد کیے۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں جو ہندستان کا نقشہ اور فضیلت بیان کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ امیر خسرو کو "طوطیِ ہند" کہا جاتا ہے۔ امیر خسرو کو اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیا کے ساتھ گہری نسبت تھی۔ اُن کی وفات کے بعد امیر خسرو صرف چھ ماہ زندہ رہ سکے۔ امیر خسرو نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں مثنوی، قصیدہ، غزل، پہیلیاں، گیت اور دوہے وغیرہ شامل ہیں۔ اُنھوں نے فارسی اور اُردو کی آمیزش سے ریختہ کی بنیاد رکھی۔ غزل میں پانچ دیوان یادگار چھوڑے۔ ہندستانی موسیقی میں ترانہ، قول اور قلبانہ اُن کی ہی ایجاد ہیں۔ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ ستار پر تیسرا تار بھی امیر خسرو نے ہی چڑھایا۔ امیر خسرو نے تقریباً بارہ راگ ایجاد کیے۔ امیر خسرو نے 1325ء میں وفات پائی۔

تصانیف: تحفۃ الصغر۔ وسط الحیات۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ نہایۃ الکمال۔ ہشت بہشت۔ تغلق نامہ۔ قران السعدین۔ مجنوں و لیلےٰ۔ مفتاح الفتوح۔ شیریں خسرو۔ عشقیہ یا خضر خاں و دول رانی۔ نہ سپہر۔ آئینہ سکندری۔ اعجاز خسروی۔ خزائن الفتوح۔ افضل الفواید۔

نمونہ کلام:
گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس — چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس
خسرو دریا پریم کا، الٹی وا کے دھار — جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار

تحریر: آسیہ عنبرین

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز
1321ء تا 1422ء

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز 13 جولائی 1321ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سید محمد حسینی تھا لیکن اُنھیں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ آپ چشتیہ سلسلہ سے متعلق تھے۔ آپ کے والد کا نام سید یوسف حسینی عرف سید راجا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جب چار سال کے تھے تو ان کا خاندان دولت آباد منتقل ہو گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ دلی لوٹ آئے تا کہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے ذریعے ان کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ انیس برس کی عمر میں شرعی علوم سے فارغ ہوئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا خاندانی شجرہ حضرت علی سے ملتا ہے۔ آپ کے القاب سید گیسو دراز، بندہ نواز، شہباز، بلند پرواز اور محرم راز و نیاز تھے۔ آپ نے رشد و ہدایت کے لیے تقریر کے ساتھ ساتھ تحریر کو بھی استعمال کیا۔ آپ کو صوفیا میں بھی بلند مقام حاصل ہے لیکن ان کی اَدبی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ آپ کو عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کے علاوہ کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ آپ کی تعلیمات میں پیر و مرشد کی بہت اہمیت ہے۔ آپ کی تصانیف 105 تا 125 بتائی گئی ہیں۔ ان کی کتاب ''معراج العاشقین'' بہت معروف اور ممتاز ہے جسے اُردو زبان میں لکھا جانے والا پہلا رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے جو نثر میں لکھا گیا۔ نثر میں قدامت کے لحاظ سے ان پر کسی کو فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اُن کی اہم تعلیمات میں سمجھ، شعور اور صبر و استقلال شامل ہے۔ اُنھوں نے 10 نومبر 1422ء کو گلبرگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے جو مرجع خلائق ہے۔

تصانیف: معراج العاشقین۔ ملتفت۔ حواشی کشف۔ شرح مشارق۔ شرح تعارف۔ رسالہ سیرت النبیؐ۔ ترجمہ مشرق۔ معارف۔ ترجمہ عوارف۔ شرح فصوص الکلم۔ ترجمہ رسالہ قریہ۔ جوان الکلم۔

نمونہ کلام: پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا اسے

شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر — اللہ آپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توں

''اے عزیز! اللہ بندہ بنا، یہاں پچھان کو جانا۔ نین تو شرع جاتا ہے۔ اول اپنی پچھانت بعد از خدا کی پچھانت'' (معراج العاشقین)

تحریر: صدف انور

بھگت کبیر
1398ء تا 1448ء
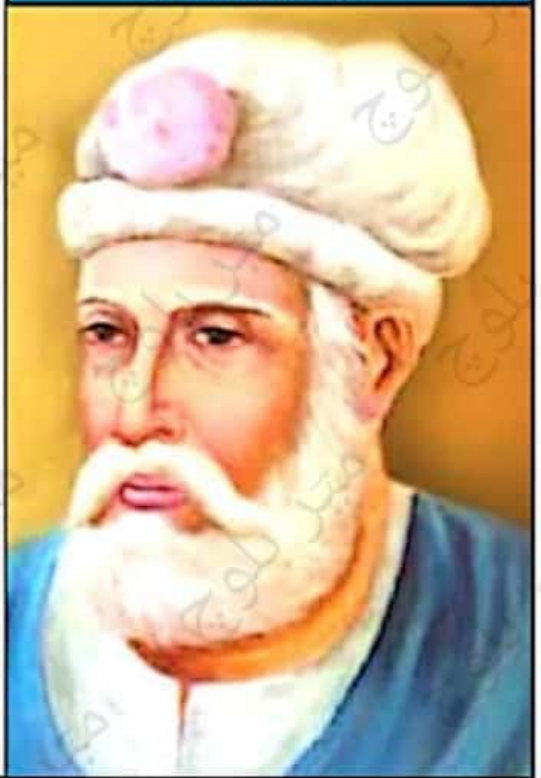
بھگت کبیر 1398ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ آپ پندرہویں صدی کے ایک صوفی شاعر تھے۔ وہ ایک برہمن بیوہ کے بطن سے تھے، جس نے اپنی رسوائی سے بچنے کے لیے بھگت کبیر کو تالاب کے کنارے پھینک دیا۔ ایک مسلمان جولاہے نے آپ کی پرورش کی۔ سن بلوغت کو پہنچنے پر بھگت کبیر نے مسلمان مشائخ و علما سے اکتساب علم کے بعد راما نند کی شاگردی اختیار کی جو ایک ہندو تھے۔ کبیر دوہے کہتے تھے جن میں بھگتی کے معارف بیان کرتے تھے۔ اُنھیں ذات پات کے بندھنوں اور مذہبی تفریق سے نفرت تھی۔ اُنھیں ہندو اور مسلمان ولی کامل سمجھتے تھے۔ کبیر ہندو مت اور اسلام دونوں پر تنقید کے لیے مشہور ہیں۔ سکھوں کی مذہبی کتاب ''گرو گرنتھ صاحب'' میں بھی کبیر کے اشعار، دوہے یا کبت شامل ہیں۔ آپ بھگتی تحریک سے وابستہ تھے۔ آپ اصلاح کے سچے دل سے خواہاں تھے اور ان کا خیال تھا کہ ذات پات کا فرق، پوجا پاٹ اور طبقاتی اونچ نیچ فقط مذہبی بیوپاریوں کے ڈھونگ ہیں۔ ہندستانی اَدبیات کی تاریخ میں کبیر داس واحد ایسی شخصیت ہیں جن سے ان کے بعد کے تمام مفکرین نے کسی نہ کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔ سکھ مت اور کبیر کی تعلیمات میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ اکبر نے جس آزاد خیال دین الٰہی کو متعارف کرانا چاہا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو کبیر نے اپنے دوہوں میں پیش کیا تھا۔ کبیر ایک مصلح تھے اور سماج میں برابری دیکھنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے توحید کے عقیدے کو اپنایا تھا لیکن ان کا عقیدہ مسلم توحید کے عقیدے سے مختلف تھا۔ اُن کا مذہب ہندو اور اسلامی عقیدوں کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ وہ فقط مصلح نہیں تھے بل کہ مفکر بھی تھے۔ کبیر کا فلسفہ زندگی کا فلسفہ ہے۔ بھگت کبیر کے فلسفہ حیات کو ماننے والے لوگ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ اُنھوں نے 1448ء میں وفات پائی۔

تصانیف: کبیر بانی۔ کلام بھگت کبیر۔

نمونہ کلام: سائیں سے سانچا رہو، سائیں سانچ سہائے — بھاویں لمبے بال رکھ بھاویں گھوٹ منڈائے

جات نہ پوچھ سادھ کی، پوچھ لیجیو گیان — مول کرو تروار کا، دھری رہن دیو میان

تحریر: شازیہ انجم

گرو نانک
1469ء تا 1539ء

گرونا نک 15 اپریل 1469ء کورائے بھوئی کی تلونڈی (موجودہ ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔اُن کے والدین مذہباً ہندو تھے اور تاجر ذات سے تعلق رکھتے تھے۔انھیں اپنی بہن بی بی نانکی سے بے حد لگاؤ تھا۔جب ان کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ بھی اپنے بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہنے لگے۔سولہ سال کی عمر میں اُنھوں نے دولت خان لودھی کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیا جہاں اُن کے بہنوئی بھی کام کرتے تھے۔سکھ روایات کے مطابق گرونانک کو پانچ برس کی عمر میں مقدس پیغامات پر مشتمل آوازیں سنائی دینے لگیں۔1487ء میں آپ نے ماتا سلکھنی سے بٹالا میں شادی کر لی جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔مقامی زمین دار رائے بولار اور نانک کی بہن نے کم عمر میں نانک میں مقدس خصوصیات کو پہچان لیا اور نانک کو مطالعہ کرنے اور سفر کرنے کی ہمت بندھائی۔نانک کے مقدس پیغامات اور معجزوں کی وجہ سے انھیں گرو کہا گیا اور یوں سکھ مت نے جنم لیا۔نانک کی تعلیمات ''گروگرنتھ صاحب'' میں موجود ہیں جو ''گرمکھی'' میں لکھے گئے اشعار کا مجموعہ ہے جن میں نانک کی تعلیمات سے متعلق الہامی اور غیر الہامی نظریات پائے جاتے ہیں۔''گروگرنتھ صاحب'' کی اَدبی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں گرونانک کے علاوہ بابا فرید کے بھی اشعار بھی شامل ہیں جو کہ قدیم اُردو اور پنجابی کا اصل ماخذ ہیں۔سکھ مت کی اس مقدس کتاب میں نانک کے کل 974 بھجن یا اشلوک شامل ہیں۔اس کتاب میں شامل اشعار اُردو زبان کے مکمل طور پر قریب تھے۔نانک نے اپنی زندگی میں بہت سفر کیا اور کئی مقامات پر چلے بھی کاٹے۔سکھ روایات کے مطابق نانک نے بھائی لہنا کو اپنا جانشین گرو مقرر کیا اور ان کا نام گرو انگد رکھا جس کے معنی ''بہت ہی اپنے'' یا ''اپنے حصے'' کے ہیں۔گرونانک 22 ستمبر 1539ء میں کرتار پور میں انتقال کر گئے۔

تصنیف: گروگرنتھ صاحب۔

نمونہ کلام:

سو ہرے پیئے کنت کی، کنت اگم اتھاہ　　نانک سو سوہاگنی، جو بھاوے بے پرواہ

تن نہ تپا تنور جیویں، بالن ہڈ نہ بال　　سر پیریں کیا پھیڑیا، اندر پری نہال

تحریر: علی رضا

میرا بائی
1498ء تا 1546ء

میرا بائی 1498ء میں جودھ پور کے کُرکی گاؤں میں پیدا ہوئیں۔اُن کا تعلق راجستھان کے اعلا راجپوت گھرانے سے تھا۔اُن کے والد کا نام رتن سنگھ تھا۔آپ ہندو دھرم کے بھگوان کرشن کی بھگتی والے فرقے کی مشہور شاعرہ تھیں۔اُن کے شوہر کا نام رانا کمار بھوج راج تھا،شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔میرا کو اپنے خاوند کے مرنے پر ان کی چتا پرستی ہونا تھا لیکن اُنھوں نے مذہبی اختلاف کی بہ دولت چتا پر خودکُشی نہیں کیا۔میرا دنیا سے اداس ہو گئیں اور سادھو سنتوں کی سنگت میں ہری کیرتن کرتے ہوئے وقت گزارنے لگیں۔اس کے بعد اُنھوں نے گھر چھوڑ دیا اور تیرتھ یاترا پر نکل گئیں۔میرا بھگتی تحریک سے وابستہ تھیں،اُنھوں نے دوہے بھی لکھے،اس کے علاوہ گیت بھی لکھے۔اُنھیں ابتدائی عمر سے ہی روحانیت سے لگاؤ تھا اور ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی،وہ اس حال میں موسیقی بجاتی تھیں۔میرا اپنے کرشن کی محبوبہ تھیں یعنی میرا کرشن کو اپنا شوہر مانتی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ اس دنیا میں کرشن کے سوا کوئی مرد ہے ہی نہیں۔وہ کرشن کی حیثیت کی دیوانی تھیں۔اُنھوں نے اپنی بہت سی شاعری راجستھانی زبان میں لکھی۔اس کے علاوہ کچھ خالصتاً اَدبی برج بھاشا میں بھی لکھی۔اُنھوں نے پیدائشی شاعرہ نہ ہونے کے باوجود بھگتی کی روح میں شاعرہ کی شکل میں شہرت فراہم کی۔میرا بائی کی شاعری ہجر اور جدائی کے جذبات سے لب ریز ہے۔اُن کے دوہے خالصتاً نسائی جذبے کی نمائندگی کرتے ہیں۔اُنھوں نے خاص طور پر اپنی شاعری میں غم کی فضا اور سکون پیش کیا ہے۔وہ بہت دنوں تک برندرابن میں رہی اور پھر دوارکا چلی گئیں جہاں 1546ء میں ان کی وفات ہوئی۔

تصانیف: برسی کا مائرہ۔گیت گووند ٹیکا۔راگ گووند۔راگ سورٹھ کے پد۔میرا بائی کی پداولی۔کلام میرا بائی۔

نمونہ کلام:

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس　　دو نیناں مت کھائیو پریہ درشن کی آس

دھان نہ بھاوے نیند نہ آوے برہ ستاوے موئے　　گھائل سی گھومت پھروں رے مرا درد نہ جانے کوئے

بسو میرے نین میں نندلال　　موہنی مورت، سانوری سرت نیناں بنے وصال

تحریر: صنوبر بانو

شاہ حسین
1538ء تا 1599ء

شاہ حسین 1538ء کوٹکسالی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام شیخ حسین تھا۔ آپ کے والد شیخ عثمان کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔ آپ حسین جولاہا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اپنی زندگی کے ایک حصے میں شاہ حسین کی مادھولال سے ملاقات ہوئی۔ مادھو ایک برہمن زادہ تھا۔ اُن دونوں کا تعلق اتنا گہرا ہو گیا کہ عوام شاہ حسین کو مادھولال حسین کے نام سے جاننے لگے، گویا وہ دونوں یک جان ہو گئے۔ شاہ حسین تصوف کے فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھنے والے صاحب کرامت صوفی بزرگ اور شاعر تھے، وہ اس دور کے نمایندہ ہیں جب شہنشاہ اکبر مسند اقتدار پر متمکن تھے۔ شاہ حسین اَدب میں کافی کی صنف کے موجد ہیں، وہ پنجابی کے اولین شاعر تھے جنھوں نے ہجر و فراق کی کیفیات کے اظہار کے لیے عورت کی پرتاثیر زبان استعمال کی۔ شاہ حسین نے بے مثل پنجابی شاعری کی اور ان کی شاعری میں عشق حقیقی کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ حسین نے سب سے پہلے داستان ہیر رانجھا کو بہ طور عشق حقیقی کی تمثیل اپنے شعری کلام میں سمویا۔ اپنے پیشے بافندگی کے روزمرہ کے استعمال کی اشیا و آلات کو مثلاً چرخہ، سوت، تانا، بانا وغیرہ کو صوفیانہ اور روحانی معنی پہنائے، ان کے بعد یہ پنجابی کا جزو لازم بن گئے۔ پنجابی کو ایسے مصرعے، تشبیہات اور موضوعات دیے کہ ان کے بعد آنے والوں نے یا تو اُنھیں اپنی طرف منسوب کر لیا یا ان پر طبع آزمائی کی۔ لاہور میں برس ہا برس تک درویشانہ رقص و سرود کی محفلیں آباد کرنے بعد شاہ حسین 1599ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کا مزار باغبانپورہ میں موجود ہے جہاں ہر سال میلہ چراغاں کے موقع پر ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ مادھو لال ان کے بعد اڑتالیس سال تک زندہ رہے اور اُنھیں شاہ حسین کے برابر میں ایک مقبرے میں دفنایا گیا جہاں وہ ابدی طور پر یکجا ہو گئے۔

تصانیف: کلام شاہ حسین۔ کافیاں شاہ حسین۔

نمونہ کلام: رہیے وو! نال سجن دے رہیے وو   لکھ لکھ بدیاں، تے سو طعنے، سبھو سر تے سہیے وو

مائے نی میں کنھوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال

تحریر: سونیا وحید

ملا وجہی
1556ء تا 1659ء

ملا وجہی کا اصل نام اسد اللہ تھا۔ وہ 1556ء میں دکن میں پیدا ہوئے جب ابراہیم قطب شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ وجہی محمد قطب شاہ کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ اُنھوں نے قطب شاہی خاندان کے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اُردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور ایک باکمال نثر نگار بھی تھے۔ فارسی میں ملا وجہی نے اپنا تخلص وجہی اور وجیہہ استعمال کیا ہے۔ اُن کے فارسی دیوان کا مخطوطہ کتب خانہ سر سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ اُن کی مشہور زمانہ کتابیں "قطب مشتری" اور "سب رس" کو آج بھی اہمیت حاصل ہے۔ قدیم بیاضوں میں ان کی غزلیں بھی مل جاتی ہیں جو قطب مشتری یا سب رس میں شامل نہیں ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ "تاج الحقائق" بھی وجہی کی کتاب ہے۔ قطب مشتری اُردو زبان کی مشہور مثنوی ہے جو ملا وجہی نے 1609ء میں تحریر کی۔ اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کی مدح اور ان کے بھاگ متی کے ساتھ عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ شاعری کے میدان میں اس مثنوی نے بہت شہرت پائی اور اس کا شمار اُردو کے کلاسیکی اَدب میں ہوتا ہے۔ "سب رس" اپنے موضوع، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے ایک ایسی تصنیف ہے کہ جسے اس دور کی جملہ تصانیف میں سب سے زیادہ اَدبی اہمیت کی مالک ہونے کا مقام حاصل ہے، جسے موضوع کی دل چسپی، جذبے کی موجودگی، زبان کی دل کشی اور اسلوب کی انفرادیت پر خالص اَدبی تحریر قرار دیا جاتا ہے۔ "سب رس" کو عبداللہ قطب شاہ کی فرمایش پر ملا وجہی نے 1635ء میں لکھا۔ اس کتاب کو اُردو نثر کی اولین اَدبی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے ملا وجہی کو پہلا صاحب اسلوب اُردو نثر نگار بھی کہا جاتا ہے۔ جب بھی اُردو نثر کا نام لیا جاتا ہے تو ملا وجہی کا نام سرفہرست ہوتا ہے۔ ملا وجہی کا انتقال 1659ء میں گولکنڈہ میں ہوا۔

تصانیف: قطب مشتری۔ سب رس۔

نمونہ کلام: سخن گو وہی جس کی گفتار تھے   اچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے

"بہوت لطافت سوں پیدا کیا حسن، عشق میں رکھیا اپنے خاصے چُن چُن۔ شان نہ گمان جان نہ پہچان"

تحریر: محمد یار

قلی قطب شاہ
1565ء تا 1611ء

عاشق مزاج شاعر اور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ 1565ء میں دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابراہیم قلی قطب شاہ گولکنڈہ ریاست کے بڑے مضبوط اور طاقت ور بادشاہ تھے۔ قلی قطب شاہ اعلا ذوق اور شاہی ماحول کی وجہ سے حسن کے دلدادہ ہوگئے۔ آپ 15 سال کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ آپ دکن کے پہلے بادشاہ تھے جنھوں نے اس براعظم کا لباس اختیار کیا۔ آپ امن پسند بادشاہ تھے اور آپ کا دور حکومت سلطنت گولکنڈہ کے عروج کا دور تھا۔ نوجوانی میں رقاصہ بھاگ متی سے بلا خیز عشق کے دوران گولکنڈہ کے نواح میں نئے بسنے والے شہر کا نام "بھاگ نگر" رکھا مگر بعد میں بدل کر حیدرآباد کر دیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے جس اَدبی ماحول میں آنکھ کھولی اس میں فیروز، ملا خیالی اور محمود جیسے بلند پایہ شاعروں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور اکبر اعظم ہم عصر تھے۔ قلی قطب شاہ کی شاعری اور ان کی دل چسپی کے دو مرکز ہیں مذہب اور عشق۔ مذہب کی مدد سے حکومت، دولت، عروج اور دنیوی اعزاز حاصل ہوا ہے اور عشق سے زندگی میں رنگینی اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی وجہ شہرت کا سب سے بڑا سبب اُردو شاعری تھا۔ آپ ایک پُر گو اور اُردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں، اُن سے پہلے بھی شعرا کا کلام ملتا ہے لیکن اب تک کسی نے اپنا دیوان بہ اعتبار حروف تہجی ترتیب نہیں دیا تھا۔ قلی قطب شاہ کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ دکن کے رنگ و جمال کے شاعر تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری کو صرف اَدب کے مخصوص موضوعات کے دائرے تک محدود نہیں رکھا بل کہ پوری زندگی کی ہر چھوٹی، بڑی، اہم اور غیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ محمد قلی قطب شاہ نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی سب اصناف میں شاعری کی اور اشعار میں سترہ تخلص استعمال کیے۔ محمد قلی قطب شاہ عربی، فارسی اُردو اور تیلگو زبانوں میں ماہر تھے۔ اُنھوں نے بہ عمر 46 سال 1611ء میں وفات پائی۔

تصانیف: کلیات قلی قطب شاہ۔ انتخاب محمد قلی قطب شاہ۔ رُوپ رس۔ یادگار یوم محمد قلی قطب شاہ۔

نمونہ کلام: پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج اک پل جیا جائے نا

تحریر: کاشف اسلام پاشا

ملا غواصی
1572ء تا 1656ء

غواصی کا نام ملا غواصی ہے، یہ گولکنڈہ کے باشندہ تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے ہم عصر اور ان کے درباری شاعر تھے۔ غواصی ابراہیم قطب شاہ کے دور میں 1572ء میں پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے اُنھوں نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری کی شروعات کی۔ غواصی قطب شاہی خاندان کے سپاہی تھے، رات کو پہرے پر مامور رہتے تھے۔ غواصی نے اس نوکری سے چھٹکارا پانے کے لیے بادشاہ کو خط لکھا اور بادشاہ نے اُنھیں نوکری سے آزاد کر کے درباری شاعر بنالیا اور "ملک الشعرا" کا خطاب دیا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں شعر و شاعری کو بند کرا دیا گیا، یوں غواصی اپنی قابلیت ظاہر نہیں کر سکے لیکن اس دوران اُنھوں نے اپنی پہلی مثنوی "مینا ستونتی" مکمل کی۔ جب عبداللہ قطب شاہ کا دور شروع ہوا تو غواصی کے اچھے دن شروع ہو گئے۔ اُنھوں نے ان کی خدمت میں "سیف الملوک و بدیع الجمال" پیش کی جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے علاوہ مثنوی "طوطی نامہ" بھی لکھی۔ غواصی کو بیجاپور سفیر بنا کر بھیجا گیا جہاں اُنھوں نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ غواصی نے اپنی شاعری میں غواصی، غواص، غواصیا نام کے تخلص استعمال کیے۔ غواصی نے سب سے زیادہ شہرت مثنوی میں حاصل کی۔ غواصی کی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے مثنویاں تخلیقی شان سے لکھیں۔ اُنھوں نے قصیدے، غزلیں اور مرثیے بھی لکھے ان کی غزلوں میں ہندستانی معاشرت کا عکس نظر آتا ہے۔ عورت کے زیورات و ملبوسات اور مجموعی طور پر اس کی زندگی کے احوال کو غواصی نے عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اُن کی غزل میں قناعت اور دردمندی کا عنصر نمایاں ہے، وہ مجاز کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کے بجائے اپنے تجربے کو سادگی سے ہی بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ غواصی نے ہندوی اسلوب کو فارسی اسلوب کے قریب لے جانے میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی وفات 1656ء کے قریب ہوئی۔

تصانیف: مینا ستونتی۔ سیف الملوک و بدیع الجمال۔ طوطی نامہ۔ کلیات غواصی۔

نمونہ کلام: عجب رات نرمل تھی اس دن کی رات　　جھمکتے تھے نوراں میں لک دھات دھات
نکل آئے کر چاند تاریاں سنگی　　جھمکتا اتھا جگمگاریاں سنگی

تحریر: اقصیٰ جمیل

نصرتی
1600ء تا 1674ء

نصرتی کا اصل نام شیخ محمد نصرت تھا اور نصرتی آپ کا تخلص تھا۔ وہ 1600ء میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے محمد عادل شاہ کے زمانے میں شہزادے علی کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کی اور جب علی تخت نشین ہو گیا تو نصرتی کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر "ملک الشعرا" کا خطاب ملا۔ اُنھوں نے بیجاپور میں تین بادشاہوں محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا دور دیکھا لیکن نصرتی کو زیادہ قربت علی عادل شاہ ثانی سے تھی۔ نصرتی، دکنی ادب کے سب سے بڑے قصیدہ گو شاعر تھے۔ اُنھوں نے مثنویاں، رباعیات، غزلیات اور قصائد وغیرہ بھی لکھے لیکن ان کو خاص مقام قصیدہ نگاری اور مثنوی کے میدان میں حاصل ہے۔ اُن کو زیادہ شہرت تین مثنویوں "گلشن عشق"، "علی نامہ" اور "تاریخ سکندری" کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ "گلشن عشق" میں منوہر اور مدھ مالتی کی عشقیہ داستان ہے۔ "علی نامہ" میں علی عادل شاہ ثانی کے دور کی تاریخ ہے، یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ "تاریخ سکندری" میں سکندر عادل شاہ کی وفات پر شیواجی اور عادل شاہی فوج کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں، ان کا ذکر ہے۔ زبان کی شیرینی، لہجے کی بلندی، تخیل کی بلند پروازی اور کم سے کم الفاظ میں معنی کا دفتر کھولنا یہ ایسی خصوصیات ہیں جو ہمیں اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتیں۔ قصیدوں میں تو اُنھوں نے اپنے تخلیقی عمل سے وہ رنگ جمایا ہے جس کی بہ دولت نصرتی پہلے اُردو قصیدہ نگار بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ نصرتی کی غزلیں بھی اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ وہ اپنی غزلیہ شاعری میں فارسی شاعری کے بنیادی رجحانات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں میں فارسی تراکیب و اضافت کا استعمال کیا ہے جو دکنی شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔ سکندر عادل شاہ کے دور میں وہ صرف دو سال زندہ رہے، 1674ء میں اُنھیں کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔

تصانیف: گلشن عشق۔ علی نامہ۔ تاریخ سکندری۔ دیوان نصرتی۔

نمونہ کلام:

پرت کی بزم میں جب عارفی کی پان لیا نین میں نین ملا پل میں تجھے پہچان لیا
پیو چھوڑ کر جن نصرتی دنیا سے غافل ہو اس عمر کوں ناچیز کر ناحق گنواتا سادے

تحریر: وجیہہ سرور

عبداللہ قطب شاہ
1614ء تا 1672ء

سلطان عبداللہ قطب شاہ 1614ء میں گولکنڈہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سلطان محمد قطب شاہ گولکنڈہ کے حکمران تھے اور والدہ حیات بخش بیگم بھی جہاں دیدہ اور علم دوست خاتون تھیں۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے بارہ برس کی عمر میں تخت سنبھالا۔ آپ قطب شاہی خاندان کے ساتویں بادشاہ تھے۔ عبداللہ قطب شاہ نے تقریباً چھیالیس سال تک حکومت کی اور قلعہ اولانیا میں مقیم رہے۔ آپ کے دور میں گولکنڈہ دکھوں کا گھر تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے فتح حیدرآباد کے بعد عبداللہ قطب شاہ کو گولکنڈہ میں بحال رکھا اور آپ اچھے منتظم کی طرح حکومت کرتے رہے۔ آپ نے رعایا کو سماجی آزادی دی، عیش و عشرت کو خوب فروغ دیا اور گولکنڈہ میں خوبصورت عمارات بنوائیں۔ عبداللہ قطب شاہ دکنی شاعری کی اس روایت سے منسلک تھے جس میں حسن و جمال کی پیشکش اور عشق و محبت کی واردات کا بیان سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ان کا دور غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا لیکن مجلسی اور تہذیبی اعتبار سے بے حد رنگین تھا۔ علوم و فنون اور شعر و اُدب کو خوب ترقی ہوئی۔ عبداللہ قطب شاہ نے تمام مروجہ اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا حقیقی رنگ غزل میں کھلتا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ شاعری اور موسیقی سے محبت کرنے والے بادشاہ تھے۔ اُن کی غزل میں سادگی اور مقامی تہذیب کا رچاؤ پوری شان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری میں سادگی اور سلاست کی وجہ سے رمز و ایمائیت اور تہہ داری کم ہے۔ اُنھوں نے عورت کے جذبات کو نہایت خوبی سے عورت کی زبان میں ہی ادا کیا ہے۔ اُن کے کلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جیسے ایرانی شراب مقامی پیالوں میں ڈال کر پیش کی گئی ہو۔ اُن کی زندگی کی عیش و عشرت کی تصویریں ان کی شاعری میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے 1672ء میں وفات پائی۔

تصانیف: دیوان سلطان عبداللہ قطب شاہ۔

نمونہ کلام:

سکھی آمل کے تل تل ذوق کرلیں دنیا میں کوئی نمیں آیا دوبارا
لگتے آج پھولاں کے چمن میں پیا کے ہات میں لے ہات گنا

تحریر: محمد آصف

سلطان باہو
1630ء تا 1691ء

سلطان باہو 17 جنوری 1630ء کو قصبہ شورکوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام بازید محمد اور والدہ کا نام حضرت بی بی راستی ہے۔ آپ کا تعلق قبیلہ اعوان سے تھا۔ آپ صوفیا کرام میں "سلطان العارفین" کے لقب سے معروف ہیں۔ آپ کے والد دہلی میں مغلیہ حکومت کے ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کی والدہ نیک پرہیز گار اور اپنے دور کی ولیہ تھیں۔ آپ ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے حضرت شاہ حبیب اللہ قادری کی شاگردی اختیار کی اور اس کے بعد سید عبدالرحمٰن دہلوی قادری کی بیعت کی۔ آپ کی زیادہ تر زندگی سیر وسیاحت میں گزری۔ آپ نے چار شادیاں کیں، آپ کے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ آپ نے کوئی دنیاوی اور ظاہری تعلیم حاصل نہ کی۔ آپ نے اپنے باطنی علم کے ذریعے لوگوں کو فیض یاب کیا، اس کے لیے آپ نے صنفِ شاعری کا انتخاب کیا۔ شاہانِ مغلیہ کی سرکاری زبان فارسی تھی جب کہ اُردو کوچہ بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ اس عمل نے اُردو زبان کو پروان چڑھایا۔ سلطان باہو نے بھی فارسی کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بہت سا کلام لکھا۔ اُن کے پنجابی کلام میں بھی اُردو زبان کا پرتو موجود ہے۔ اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں ان کا کردار اہم ہے۔ اُن کے پنجابی کلام میں ابتدائی اُردو کا رنگ پایا جاتا ہے، اس لیے اُردو زبان واَدب میں ان کا ممتاز مقام ہے۔ اُن کی شاعری کے موضوعات تصوف، عشقِ حقیقی، خدمت انسانیت کا درس اور اپنی ذات کی معرفت کے بارے میں ہیں۔ سلطان باہو ان صوفیا میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے وعظ اور شاعری کے لیے مقامی زبان کا استعمال کیا اور اُردو کی راہ ہموار کی۔ اُن کی وفات یکم مارچ 1691ء میں جھنگ میں ہوئی۔

تصانیف: ابیاتِ باہو۔ امیر الکونین۔ شمس العارفین۔ عین الفقر۔ قربِ دیدار۔ محبت الاسرار۔ سلطان الوہم۔ کشف الاسرار۔ رسالہ روحی شریف۔ نور الہدیٰ کی خورد۔ جواہر سلطانی۔ کلید التوحید۔

نمونہ کلام:

نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو ۔۔۔ نہ دل میرا دوزخ منگے نہ بہشتیں راضی ہو
الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو ۔۔۔ نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو

تحریر: ثنا منور

ابنِ نشاطی
1635ء تا 1673ء

ابن نشاطی 1635ء میں پیدا ہوئے۔ شعرائے گول کنڈہ میں وہ ایک عظیم فن کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہیں۔ اُن کا اصل نام مظہر الدین اور ان کے والد کا نام فخر الدین شیخ تھا۔ ابن نشاطی نہ صرف شاعر تھے بل کہ وہ ایک انشا پرداز بھی تھے۔ وہ درباری شاعر کے بجائے ایک عوامی فن کار تھے جو عوام میں زیادہ مقبول تھے۔ اُنھیں فن شاعری میں مہارت حاصل تھی جسے اُنھوں نے مقامی زبان دکنی یا اُردو کی آب یاری کے لیے صرف کیا۔ اُن کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ کلام دستیاب نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کا پہلا اور آخری نمونہ ان کی مثنوی "پھول بن" ہے۔ وہ اپنی اس مثنوی میں فارسی دانی پر فخر کرتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُنھیں انشا پردازی سے شغف ہے لیکن ان کی نثر کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ اس مثنوی میں ان کے حالاتِ زندگی کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے ابتدائی حالات خوش حال نہیں تھے۔ وہ زمانے کی ناقدری کا گلہ کرتے تھے۔ "پھول بن" فارسی کا قصہ "بساتین الانس" کا ترجمہ ہے لیکن ان نشاطی نے اس خلاقانہ صناعی سے ترجمہ کیا ہے کہ یہ طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ قصہ بے شک فارسی کا ہے لیکن اُنھوں نے اسے ہندستانی چولا پہنا دیا ہے۔ یہ کہانی سلسلہ در سلسلہ بیان کی گئی ہے اور ابن نشاطی نے رزم کی جگہ پر رزم اور بزم کی جگہ پر بزم کے انداز کو ملحوظ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ مثنوی میں تخلیقی شان وشوکت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ مثنوی اُنھوں نے جوانی میں لکھی۔ یہ مثنوی 1744 اشعار پر مشتمل ہے جس میں سے 37 اشعار عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں عام ومقبول موضوع عشق تھا جو اس مثنوی میں بھی نمایاں ہے۔ ابن نشاطی کا انتقال 1673ء میں گول کنڈہ میں ہوا۔

تصنیف: پھول بن۔

نمونہ کلام:

سخن کے پھول کی تاثیر تے توں ۔۔۔ معطر کر جگ یک دھیر تے توں
سخن کوں فہم سوں کرتا ہے توں خوب ۔۔۔ سلاست بات کا دھرتا ہے توں خوب
سخن کوں تو سنگارن جانتا ہے ۔۔۔ سخن کوں تیرے سب کوئی مانتا ہے

تحریر: حبیبہ منظور

علی عادل شاہ ثانی
1638ء تا 1672ء
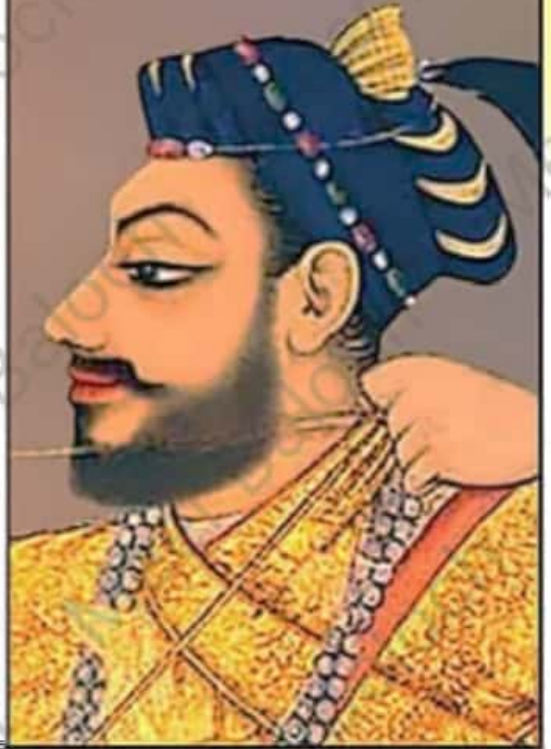
علی عادل شاہ ثانی محمد عادل شاہ کے بیٹے تھے۔ وہ 1638ء میں پیدا ہوئے، ان کی پرورش خدیجہ سلطان شہر بانو کی نگرانی میں ہوئی جو خود علم و ادب کی پرستار اور شعرا کی قدردان تھیں۔ ملک خوشنود اور رستمی کی صحبت نے بچپن میں ہی ان کے ذوقِ سخن کو نکھارا اور باپ کے انتقال پر 1656ء میں تخت نشین ہوئے۔ وہ بیجاپور سلطنت کے آٹھویں فرماں روا تھے۔ اُن کے دربار میں نصرتی کو "ملک الشعرا" کا درجہ حاصل تھا اور نصرتی نے انھیں "استادِ عالم" کا لقب دیا۔ شاعری میں اُنھوں نے عجیب طرز کی جادوگری اور غنایت پیدا کی اور نسوانی حسن کے نئے نئے زاویے تراشے۔ اُن کی غزل میں تغزل کی داخلی صورت میں موجود ہے۔ وہ اپنے دادا کی طرح موسیقی کے شیدائی تھے۔ وہ عربی، فارسی، اُردو اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ وہ رنگین مزاج کے مالک تھے۔ اُن کے سولہ سالہ دور (1672ء-1656ء) میں علم و ادب کو نہایت فروغ ملا۔ اس دور میں بہت سے نام ور شعرا ابھرے۔ علی عادل شاہ ثانی ایک شاعر، مصور اور خطاط بھی تھے، اُنھوں نے بہت سی زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی غزلوں کا اسلوب و لہجہ اپنے اندر بانکپن اور ندرت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے تشبیہوں کو مقامی رنگ دیا اور ہندستانی روایات اور ہندو دیو مالا کو بڑی چابک دستی سے غزل میں بیان کیا جس سے ان کے گہرے مشاہدے، وسیع مطالعے، شاعرانہ باریک بینی اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے کلیات میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مخمس، مثمن، رباعیات اور گیت دوہے موجود ہیں۔ اُنھوں نے ہر صنف میں اپنی قابلیت کا پختہ ثبوت دیا ہے۔ اُنھوں نے فارسی کے مقابلے میں دکنی زبان میں شعر کو خود بھی عروج دیا اور دیگر شعرا کو بھی اسے اپنانے پر اکسایا یہی وجہ ہے کی اس دور میں اُردو کو بہت فروغ ملا۔ علی عادل شاہ ثانی کی وفات 1672ء میں ہوئی۔

تصنیف: کلیاتِ شاہی۔

نمونہ کلام:

صنم سات جب آ کے یاری لگے — یوں دکھ درد آ تمر ساری لگے
جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے جیونا پھر کے بھاری لگے

تحریر: آمنہ رشید

ولی دکنی
1667ء تا 1707ء

ولی دکنی کا اصل نام ولی محمد تھا۔ وہ 1667ء میں پیدا ہوئے۔ ولی کے آباواجداد کا وطن گجرات تھا۔ لیکن وہ خود ہجرت کر کے دکن آ گئے۔ اُنھوں نے سورت، احمد آباد، گجرات اور دہلی کے سفر اور حرمین شریفین کی زیارت بھی کی۔ محبوب پرستی ان کے ہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے کئی کامیاب عشق کیے۔ ولی دکنی اپنے عہد کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے، پھر اپنے مرشد سعد اللہ گلشن کے کہنے پر اُردو میں شاعری شروع کی تو اُردو غزل کے باوا آدم کہلائے۔ ان کا دیوان دہلی میں بہت مقبول ہوا اور شمالی ہندستان میں اُردو شاعری کا رجحان ہوا۔ ولی کی غزل پر فارسی اور ہندی کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کی غزل کے انوکھے موضوعات کی وجہ سے انھیں شہرت حاصل ہوئی زبان صاف ستھری اور آسان ہے۔ عشق و محبت، محبوب کی تعریف، عیش و نشاط اخلاقی اور حکیمانہ مضامین ان کی غزل کے موضوعات اور ان کی وجہ شہرت بنے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری کے ارتقا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ولی عام شاعروں سے بہت مختلف تھے۔ ایک روایت سے ہٹ کر نئی روایت ڈالنا اس میں شہرت دوام کمانا، ولی دکنی کا اصل اعجاز ہے۔ ولی کا تخلیقی اظہار صرف غزل تک محدود نہیں، اُنھوں نے مثنوی، قصیدہ، قطعہ، ترجیع بند وغیرہ اصناف میں بھی شاعری کی لیکن جیسی اچھی اُنھوں نے غزل تخلیق کی اس کے سامنے یہ سب اصناف کم تر ہیں۔ محبوب پرستی کی اس روش کے باوجود ولی کی غزل میں تصوف بہت کم ہے جو غزل کی روایت سے ولی کے کلام میں در آیا ہے۔ ولی دکنی سے پہلے جنوبی ہند میں مقامی زبان و ادب پر فارسی کا غلبہ تھا۔ جدید ریختہ اور غزل کے فروغ میں ولی کی خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں۔ اُن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے غزل کی نشاۃ ثانیہ کرنے میں بھی حصہ لیا اور ایک طویل عرصے تک اُردو غزل نے ولی دکنی کے زیر اثر اپنا تخلیقی سفر طے کیا اس دور کو بجا طور پر "ولی کا عہد" شمار کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے 31 اکتوبر 1707ء کو وفات پائی۔

تصانیف: کلیاتِ ولی۔ دیوانِ ولی۔

نمونہ کلام:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا

تحریر: عمارہ ریاض

بابا بلھے شاہ
1680ء تا 1757ء

بابا بلھے شاہ 3 مارچ 1680ء کو اوچ گیلانیاں میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے بعد قصور منتقل ہو گئے۔ اُن کے والد مسجد کے امام تھے۔ ابتدائی تعلیم اُنھوں نے والد سے حاصل کی۔ قصور جا کر حدیث، فقہ، قرآن اور منطق میں اعلا تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے گلستان اور بوستان بھی پڑھی۔ شطاریہ خیالات سے بھی استفادہ کیا۔ علم حاصل کرنے کے بعد ان پر انکشاف ہوا کہ دنیا بھر کے علم حاصل کر کے انسانی دل کو راحت میسر نہیں آ سکتی۔ دل کے سکون کے لیے اللہ کا تصور ہی کافی ہے۔ بلھے شاہ مغلیہ سلطنت کے عالم گیری عہد کی روح کے خلاف ردِعمل کا نمایاں ترین مظہر ہیں۔ اُن کی ذہنی نشوونما میں قادریہ مکتبِ فکر اور شطاریہ فکر پیش پیش رہے۔ اس لیے ان کی شاعری کی باغیانہ فکر کی بعض خصوصیات شطاریوں سے مستعار ہیں۔ وہ پنجابی کے ایک صوفی شاعر تھے۔ اُردو میں بھی لکھا کرتے تھے۔ اُن کی شاعری میں مذہبی ضابطوں پر تنقید اور ترکِ دنیا کی مذمت بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ علم کے جمع کرنے کو وبالِ جان قرار دینے کے قائل تھے۔ اگر غور سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری دراصل عالم گیری عقیدہ پرستی کے خلاف ردِعمل ہے۔ اُن کی زندگی کا بیش تر حصہ لاقانونیت، خانہ جنگی، انتشار اور افغان طالع آزماؤں کی وحشیانہ مہموں میں بسر ہوا تھا اس لیے ان کا گہرا اثر ان کے افکار پر بھی پڑا۔ اُن کی شاعری میں دیکھا جائے تو انسان دوستی، صلحِ کل اور عالم گیر محبت کا درس ملتا ہے۔ اُن کا عرس ہر سال شمسی ماہ بھادوں میں جو چاند نظر آئے اس کی 11،12 تاریخ کو قصور میں منعقد ہوتا ہے جس میں ان کے عقیدت مند ان کا کلام گا کر اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کی کافیاں علمی اور لوک دانش سے بھرپور ہیں۔ اُن کا انتقال 22 اگست 1757ء کو قصور میں ہوا۔

تصنیف: کلام بلھے شاہ۔ آکھیا بلھے شاہ نے۔

نمونہ کلام:

اب ہم ایسے گم ہوئے پریم نگر کے شہر	اپنے آپ نوں سودھ رہے ہیں نہ سر ہتھ نہ پیر
کھوئی خودی اپنا پد چیتا تب ہوئی گل خیر	بلھا شوہ ہے دوہیں جہانیں کوئی نہ دسدا غیر

تحریر: سدرہ ثنا اللہ

میرزا مظہر جانِ جاناں
1699ء تا 1781ء

میرزا مظہر جانِ جاناں 13 مارچ 1699ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد میرزا جان سلطان، اورنگ زیب عالم گیر کے دربار سے وابستہ تھے۔ آپ کا نام بھی اورنگ زیب عالم گیر نے والد کی مناسبت سے جانِ جاں رکھا لیکن لوگوں میں جانِ جاناں مشہور ہو گیا۔ آپ کی تعلیم تربیت زمانے کے مروجہ طریق کار کے مطابق ہوئی اور پھر آپ بادشاہ کے فوجی رسالے میں شامل ہو گئے۔ آپ حدیث اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ اُدبی کم اور مذہبی رہنما زیادہ تھے لیکن ان کی اُدبی اہمیت بہت زیادہ ہے کیوں کہ اُنھوں نے فارسی اور اُردو کو ایک ہی تار میں پرونے کی سعی کی تھی اور اپنے شاگردوں کو بھی یہ زبان اختیار کرنے کی نصیحت کی۔ آپ ایہام گوئی کی تحریک سے وابستہ تھے اور اس کے زبردست حامی اور بانیوں میں شمار ہوتے تھے لیکن جب ایہام گوئی نے ابتذال اور فحش گوئی کی شکل اختیار کر لی تو اس کے خلاف سب سے پہلا ردِعمل بھی آپ نے ہی کیا۔ اس طرح ردِعمل کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کے تحت اُردو میں تازہ مضامین اور افکارِ نو کا دروازہ کھلا۔ آپ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے لیکن اُردو کی ترویج کے لیے اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نہ صرف اُردو زبان کے اولین معماروں میں سے ایک ہیں بل کہ سلسلہ نقشبندیہ کے بھی ایک اہم صوفی بزرگ ہیں۔ آپ نے کوئی اُردو دیوان نہیں چھوڑا، اُردو کلام مختلف تذکروں میں ملتا ہے اور اشعار کی کل تعداد صرف ایک سو چبیس ہے۔ اُردو میں اشعار کی کم تعداد کے باوجود اہم بات یہ ہے کہ آپ کے کلام نے اُردو شاعری پر نہایت گہرے اثرات چھوڑے اور اُردو شاعری کو سب سے پہلے آپ نے نئے قالب میں ڈھالا۔ آپ کا انتقال 6 جنوری 1781ء کو دہلی میں ہوا۔

تصانیف: دیوان مظہر فارسی۔ مجموعہ مکاتیب۔ مجموعہ اُردو اشعار۔ ملفوظات۔ متفرق اور مختصر نثری تحریریں۔

نمونہ کلام:

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط ہوا کے ہاتھ	اس واسطے لگا ہوں چمن میں ہوا کے ساتھ
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم	یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو	یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

تحریر: شاہندہ تحسین

سراج اورنگ آبادی
1712ء تا 1763ء
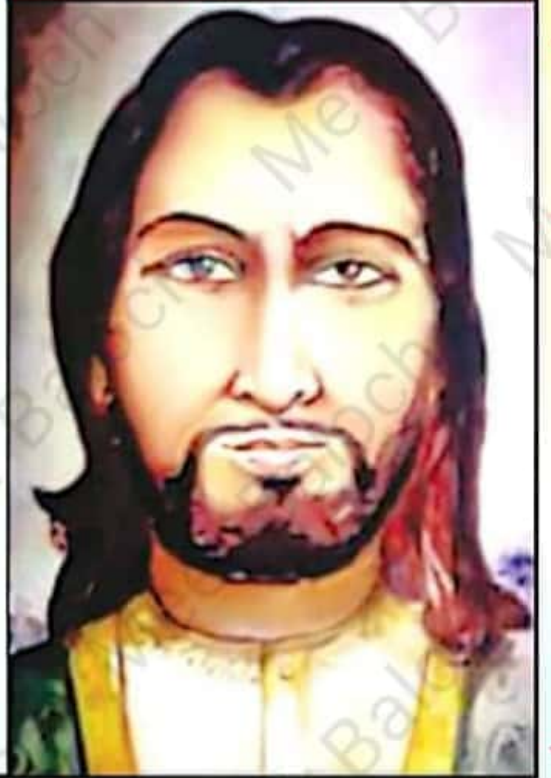
سید سراج الدین سراج 11 مارچ 1712ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں سراج اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے۔ سراج درویش وکمال صوفی تھے۔ ولی کے بعد اورنگ آباد سے جس شاعر کے سخن اور تخلیقی انفرادیت کو بڑے پیمانے پر تسلیم کیا گیا وہ سراج اورنگ آبادی ہے۔ سراج کی شاعری پر ولی کے اثرات بھی ہیں اور سراج کی انفرادی صلاحیت بھی موجود ہے سراج خود کو ولی کے جانشین کہتے تھے۔ سراج 1734ء میں 20 سال کی عمر میں عبدالرحمٰن چشتی سے بیعت ہوئے، اسی زمانے میں اُنھوں نے اُردو شاعری کا آغاز کیا تھا۔ 1740ء کے بعد اُنھوں نے مرشد کے کہنے پر شاعری کو خیر باد کہہ دیا۔ سراج کی شاعری میں نمایاں خوبی ولی کی روایت ہے خاص طور پر محبوب کے اوصاف بیان کرنے میں ولی کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ محبوب اور محبوب سے وابستہ جمالیاتی رنگ جو ولی کی شاعری میں ملتے ہیں وہ اتنے گہرے اور موثر تھے کہ سراج اور ان کے عہد کے شاعر بھی ان جمالیاتی رنگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سراج کی غزل میں ہجر وفراق کے تجربے کثرت سے ملتے ہیں ان تجربات میں سراج کا ذاتی عشق بھی موجود ہے اور صوفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ سراج کی شاعری عشق مجازی سے حقیقی کا سفر ہے اور وہ اسی رستے کے شاعر تھے۔ سراج بیانیہ انداز اور واقعہ نگاری پر یکساں طور پر مہارت رکھتے ہیں۔ سراج اپنی مثنوی "بوستان خیال" اور اپنی غزلوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ سراج کی غزل میں ہجر وفراق کے تجربے کثرت سے ملتے ہیں۔ مثنوی "بوستان خیال" ان کی غزل کی طرح اہم ہے یہ مثنوی ان کے ذاتی عشق کا قصہ ہے۔ اس مثنوی میں مناظر فطرت کو بہت فطری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے 6 اپریل 1763ء میں اورنگ آباد میں وفات پائی۔

تصانیف: بوستان خیال۔ انتخاب سراج اورنگ آبادی۔ کلیات سراج۔ سراج سخن۔

نمونہ کلام:

آج کی رات مرا چاند نظر آیا ہے — چاندنی دور ہی چٹکی ہے مرے آنگن میں

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو تو رہا نہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

تحریر: نمرہ بنت احسان

میرزا محمد رفیع سودا
1713ء تا 1781ء

مرزا محمد رفیع سودا کے آباؤ اجداد کا تعلق کابل سے تھا ان کے والد مرزا محمد شفیع تجارت کی غرض سے ہندستان آئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ سودا دہلی میں 1713ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ سودا کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ شروع میں وہ فارسی میں شاعری کیا کرتے تھے جب خان آرزو سے اصلاح لینا شروع کی تو اُنھوں نے کہا کہ فارسی ہماری زبان نہیں بل کہ ہماری زبان ہندی ہے بے شک ہندستان والوں نے فارسی کو بہت اونچے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن فارسی ایرانیوں کی زبان ہے ہم ان سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتے اور ریختہ میں اس وقت کوئی بھی مشہور نہیں ہوا لہٰذا اگر تم ریختہ میں کوشش کرو تو بہت شہرت حاصل کر سکتے ہو، اس کے بعد سودا نے ریختہ میں شاعری کرنا شروع کی اس کے علاوہ وہ شاہ حاتم کے بھی شاگرد رہے۔ سودا کو شاعری کے علاوہ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ سودا پہلے محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں سے اور پھر سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر سے منسلک رہے اس کے بعد نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ساتھ رہے۔ مرہٹوں کے دہلی پر حملہ کے بعد سودا نے بھی دہلی کو چھوڑ دیا اور عماد الملک کے ساتھ متھرا چلے گئے پھر اسی سال فرخ آباد میں نواب مہربان خاں امید کے پاس چلے گئے اور تقریباً 22 سال انھی کے پاس رہے ان کے انتقال کے بعد فیض آباد آ گئے اور شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ اُن کی وفات کے بعد آصف الدولہ کے ساتھ فیض آباد منتقل ہو گئے۔ مرزا محمد رفیع سودا کا قصیدہ میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ سودا ایک قادر الکلام شاعر تھے اور اپنے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے۔ اُنھوں نے 1781ء میں وفات پائی۔

تصانیف: ۔ کلیات سودا۔ دیوان اُردو۔ قصائد امرائے دلی و لکھنؤ۔ سلام اور مرثیہ۔ رسالہ رقاۃ الصالحین۔ میر تقی میر کی مشہور فارسی مثنوی شعلہ عشق کا ترجمہ نثر میں۔ تذکرہ شعرائے اُردو۔

نمونہ کلام:

باہر رکھوں نہ بزم سے اے رشک باغ پا — جوں شمع سر کے گل سے کروں تا نہ داغ پا

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک — میں کتاں بلبل و پروانہ یہ ہم چاروں ایک

تحریر: زینت پروین

خواجہ میر درد
1721ء تا 1785ء

خواجہ میر درد 1721ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خواجہ ناصر، عندلیب تخلص کرتے تھے اور شاعر تھے۔ خواجہ میر درد کی تربیت ان کے والد نے کی۔ اس دور کے معروف صوفیا سے خواجہ میر درد نے فیض اٹھایا۔ میر درد نے قرآن، حدیث فقہ اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ میر درد ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ اور عالی رتبہ باپ کے بیٹے تھے اُنھوں نے ایک ایسے مذہبی ماحول میں پرورش پائی جہاں علم و فضل بھی تھا۔ میر درد میں ذہانت خداداد تھی۔ میر درد کو موسیقی سے لگاؤ تھا ان پر اعتراضات ہوئے تو موسیقی کو الوداع کہہ دیا لیکن موسیقی پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ اس دور کے باکمال موسیقار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خواجہ میر درد کی شہرت کا بڑا سبب ان کا صوفیانہ کلام ہے۔ اُردو کی صوفیانہ شاعری میں جو مقام اور مرتبہ درد کو حاصل ہے وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں کہ درد ایک خاندانی صوفی تھے ان کے والد بزرگوار خواجہ ناصر عندلیب دلی کے ممتاز صوفیا میں سے سمجھے جاتے تھے ان کی تمام عمر اسی طرح سے گزری۔ دہلی میں خواجہ ناصر کی خانقاہ صوفیا کا مرکز تھی۔ میر درد نے سپاہی کا پیشہ اختیار کیا مگر عالم شاہی دور میں یعنی انتیس سال کی عمر میں تمام دنیاوی آلائشوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے تصوف کے بوریے پر بیٹھ گئے۔ اُردو میں سراج، درد اور چند شعرا کے علاوہ کسی کو عملاً صوفی نہیں کہا جا سکتا۔ درد نے اپنے کلام میں کثرت سے حقیقت و مجاز، عشق قلب و نظر، ذکر جلی و خفی، دل زندہ و مردہ، فنا و بقا توکل جیسے صوفیانہ تصوارت کا استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے 7 جنوری 1785ء کو دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف: اسرار الصلوٰۃ۔ علم الکتاب۔ نالہ درد۔ آہ سرد۔ شمع محفل۔ درد دل۔ خوف عنا۔ واقعات درد۔ سوز دل۔

نمونہ کلام:

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

تحریر: ادیبہ ایمن

وارث شاہ
1722ء تا 1798ء

وارث شاہ 23 جنوری 1722ء کو جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے۔ پنجابی کی ہیر وارث شاہ مشہور زمانہ تصنیف کے خالق اور پنجابی زبان کے عظیم صوفی شاعر ہیں۔ آپ بابا بلھے شاہ کے ہم مکتب تھے۔ دنیاوی علم حاصل کر چکے تو استاد نے اجازت دی کہ اب جاؤ باطنی علم حاصل کرو اور جہاں چاہو بیعت کرلو۔ سید وارث شاہ نے خواجہ فرید الدین گنج شکر کے خاندان میں بیعت کی۔ وارث شاہ کے ہیر رانجھا کے قصہ سے متعلق آپ کے استاد غلام مرتضیٰ کو علم ہوا تو اُنھوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے ملکہ ہانس میں، جو مشہور جگہ ہے، ہیر مکمل کی۔ ملکہ ہانس میں حجرہ وارث شاہ میں ہر سال "جشن وارث شاہ" کے نام سے ایک میلہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں ہیر وارث شاہ پڑھنے کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ہیر کے کچھ نسخے بھی شائع ہوئے جو الحاقی نسخے ہیں۔ کلام میں فن کے ماہر کہتے ہیں کہ اچھے شعر میں سادگی جوش اور اصلیت ہوتی ہے اور یہ سب خوبیاں وارث کے کلام میں موجود ہیں۔ وارث شاہ فطرت شناسی اور قصہ گوئی کے آرٹ سے واقف تھے۔ آپ نے معاشرتی زندگی کا نقشہ خوب کھینچا۔ عاشقوں کے راز و دنیا سوز و گداز دوستی دشمنی غم اور خوشی کے ساتھ ساتھ نصیحتیں حکمت اور معرفت کو جس طرح بیان کیا وہ ان کے مقام کی وجہ ہے اُنھوں نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو کھول کر بیان کیا اور اس کے تسلسل میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ ہر بات کو برجستہ موقع محل کے مطابق بیان کرتے۔ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار کے مطابق ان سے ایک درج ذیل اُردو غزل بھی منسوب ہے۔ وہ 24 جون 1798ء کو جنڈیالہ شیر خان میں وفات پا گئے۔

تصانیف: ہیر رانجھا۔ معراج نامہ۔ نصیحت نامہ۔ چوہڑی نامہ۔

نمونہ کلام:

جس دن کے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہوا
اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیزار ہوا
جب وارث شاہ کہلایا نے تب روح سوں روح ملایا نے
تب سیج سہاگ سولایا نے جیو جان مخزن اسرار ہوا

تحریر: فائزہ اختر

میر تقی میر
1723ء تا 1810ء
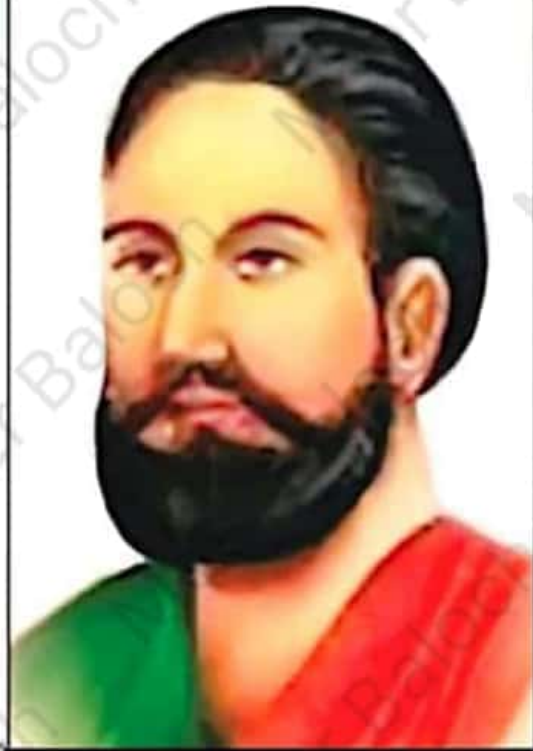
اصل نام میر محمد تقی اور تخلص ''میرؔ'' تھا۔ وہ 28 مئی 1723ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد علی تھا لوگ اُنھیں علی متقی کہتے تھے۔ اُن کی والدہ کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش ان کے والد کے مرید ''سید امان اللہ'' نے کی۔ پھر والد اور امان اللہ کی وفات کے بعد میرؔ کو سوتیلے بھائی کے ناروا سلوک نے اکبر آباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور میر کو دہلی کا سفر کرنا پڑا جہاں وہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے پاس ٹھہرے۔ خان آرزو کے گھر شاعر آتے تھے تو میر کو یہاں شاعری کا ماحول ملا لیکن پھر یہاں خان آرزو کے سخت رویے اور خراب امن و امان کی وجہ سے میر کو دلی چھوڑنا پڑا۔ دلی میں خراب امن و امان کی وجہ سے اُنھوں نے مجبور ہو کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور باقی عمر اسی شہر میں بسر کی۔ لکھنؤ آ کر اُنھیں فراغت ضرور نصیب ہوئی مگر یہاں کی تہذیب میں گہرائی اور رچاوٹ نہیں وہ خود کو ساری عمر لکھنؤ سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ میر تقی میرؔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی دلی کو یاد کرتے رہے اور اُن کی اُداسی برقرار رہی۔ میر تقی میرؔ کو ''خدائے سخن'' اور ''شہنشاہ غزل'' کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے کبھی متداول اصناف شعر میں طبع آزمائی کی مگر ان کی پہچان غزل ہے۔ یہی وہ صنف سخن ہے جہاں اُن کے جوہر کھلتے ہیں۔ میر تقی میرؔ نے اپنے زمانے کے حالات سے اس حد تک اثرات قبول کیے ہیں کہ غزل کا مزاج اور انداز بدل دیا۔ اپنے زمانے کے حالات واقعات اور عصری تباہی اور بربادی کو سامنے رکھ کر نئے رموز و علائم اور نئے اشارے کنایے وضع کیے۔ میر کی غزل سادہ، درد اور پر خلوص انسانی جذبات کی عکاس ہے ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی کیفیات کے حامل ہیں۔ اُنھوں نے 20 ستمبر 1810ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: چھ اُردو دیوان۔ دیوان فارسی۔ کلیاتِ میر۔ نکات الشعرا۔ ذکرِ میر۔ فیضِ میر۔ دریائے عشق۔

نمونہ کلام:

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا
شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

تحریر: اقرا غلام رسول

میر حسن دہلوی
1727ء تا 1786ء

میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن، میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ اُن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس فلک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ وہ 1727ء دہلی کے محلہ سید واڑہ میں میں پیدا ہوئے۔ میر حسن شاعری، علم و فضل اور خوش نویسی کی وجہ سے اپنے ہم چشموں اور ہم عصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی انھی کو دکھایا، اس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ مثنوی ''سحر البیان'' یا قصہ بے نظیر و بدر منیر ایک لاجواب اور بے نظیر مثنوی ہے۔ میر حسن کو اُردو ادب میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ میر حسن نے اس صنفِ اُدب میں لکھا جو قدیم تو تھی مگر اس میں ان کو مہارت حاصل نہ تھی۔ اس صنف کو دوبارہ اُردو اَدب میں بلند مقام دیا۔ مثنوی فنی اعتبار سے مشکل صنف ہے لیکن میر حسن نے اس صنف میں اپنا نام پیدا کیا اور آج اُردو اَدب میں میر حسن اپنی مثنوی ''سحر البیان'' کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اور یہ بات بھی کہ وہ مشہور مرثیہ نگار میر انیس کے دادا ہیں۔ میر حسن عربی کم جانتے تھے مگر فارسی میں کمال حاصل تھا اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے مگر ان کا تذکرہ نہایت اعلا درجے کا ہے۔ میر حسن میر درد، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر کی پیروی کرتے تھے اور رسمی طور پر وہ ضیا الدین ضیا کے بھی شاگرد تھے۔ کلام نہایت سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ غزل، رباعی، مرثیہ، مثنوی سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ ہوتا تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا چناں چہ ان کی مشہور مثنوی ''سحر البیان'' اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُنھوں نے 24 اکتوبر 1786ء کو وفات پائی۔

تصانیف: تذکرہ شعرائے اُردو۔ دیوان میر حسن۔ مثنوی ''سحر البیان''

نمونہ کلام:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر اک اولاد کا تھا الم

تحریر: سلمان مسیح

نظیر اکبر آبادی
1735ء تا 1830ء

آپ کا نام ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ والدہ نواب سلطان خان قلعہ دار آگرہ کی بیٹی تھیں۔ نظیر 1735ء میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے۔ چوں کہ عمر کا زیادہ حصہ اکبر آباد میں گزارا اس لیے اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی لکھتے تھے۔ بارہ بھائیوں میں صرف نظیر زندہ بچے اس لیے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچے اور وہیں تاج محل کے قریب مکان میں رہنے لگے۔ نظیر کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم وہ عربی، فارسی ہندی اور ہندستان کی کئی دوسری زبانیں جانتے تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا اسی مزاج کی وجہ سے وہ درباروں سے دور رہتے تھے۔ لکھنؤ کے نواب سعادت علی خان اور بھرت پور کے رئیس کی دعوت ٹھکرا دی۔ متھرا میں کچھ عرصہ معلم رہے مگر جلد ہی نوکری چھوڑ کر آ گئے اور لالہ بلاس رام کے بچوں کے اتالیق ہو گئے۔ ایک مکتب سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی اور فن خوش نویسی بھی جانتے تھے۔ روایتی شاعری کرنے کے علاوہ نظیر نے عوامی شاعری بھی کی یہی ان کی پہچان بن گئی۔ ان کی عوامی نظموں میں ہندو مسلم روایات اور تہواروں مختلف مذہب کی برگزیدہ ہستیوں، ہندستان کے مناظر، پرندوں، جانوروں، موسموں، پھلوں اور کھانوں وغیرہ کا رسمی انداز میں ذکر ہوا ہے۔ عوامی مسائل اور فلسفیانہ موضوعات پر بھی ان کی نظموں بنجارہ نامہ، روٹیاں، آدمی نامہ نے تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ نظیر کا ذخیرہ الفاظ بھی حیرت انگیز حد تک وسیع تھا۔ نظیر کی شہرت ان کی نظم نگاری سے ہے۔ ان دنوں اُردو شاعری پر فارسی زبان اور ماحول کا غلبہ تھا۔ نظیر اکبر آبادی پہلے قابل ذکر شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شاعری میں ہندستانی ماحول دکھایا۔ نظیر نے طویل عمر پائی آخری عمر میں فالج کی وجہ سے 16 اگست 1830ء کو انتقال کر گئے۔

تصانیف: کلیات نظیر اکبر آبادی۔ اشعار نظیر۔ دیوان نظیر۔ انتخاب نظیر اکبر آبادی۔ جوگی نامہ۔

نمونہ کلام:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تحریر: اقصیٰ مریم

میر امن
1748ء تا 1806ء

میر امن کا اصل نام میر محمد امان تھا۔ وہ 1748ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان شہنشاہ ہمایوں کے زمانے سے عالم گیر ثانی کے عہد تک مغل دربار سے وابستہ رہا اور ان کے بزرگ منصب داروں میں شامل تھے۔ اُن کے پاس اچھی خاصی جاگیر تھی لیکن سورج مل جاٹ نے ان کو اس جاگیر سے بے دخل کر دیا۔ دوسری طرف احمد شاہ درانی کی دہلی میں لوٹ مار سے ان کا سب کچھ تباہ برباد ہو گیا۔ میر امن پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ ہجرت کر کے عظیم آباد، پٹنہ چلے گئے۔ وہاں کچھ برس قیام کیا مگر قسمت کی دیوی مہربان نہ ہوئی، لہٰذا وہاں سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں بھی کچھ عرصہ ملازمت کے حصول کے لیے کوشاں رہے، پھر نواب دلاور جنگ نے اُنھیں اپنے چھوٹے بھائی میر کاظم خان کو پڑھانے پر مامور کیا۔ یہاں سے ان کا تعارف میر بہادر علی حسینی سے ہوا اور اُنھوں نے جان گل کرسٹ سے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے لیے سفارش کی جس کے بعد آپ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں شامل ہوئے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بہ دولت بہت ترقی کی۔ آپ کو سب سے پہلے فارسی ''قصہ چہار درویش'' کو اُردو قالب میں ڈھالنے کا کام ملا۔ آپ نے جان گل کرسٹ کی ہدایت پر ٹھیٹھ ہندستانی گفتگو کے انداز میں اتنا شان دار ترجمہ کیا کہ کالج کی طرف سے اُنھیں پانچ سو روپے انعام دیا گیا۔ میر امن کی یہ کتاب ''باغ و بہار'' اُردو کے داستانی اُدب کا اہم ترین کام اور اُردو کی سب سے زبردست داستان ہے۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی سے ترجمہ ہے لیکن میر امن کی تخلیقی صلاحیت نے اسے طبع زاد جیسا بنا دیا ہے۔ میر امن نے پہلے سے اُردو میں میر عطا حسین خاں تحسین کے ترجمہ شدہ ''نو طرز مرصع'' کو بھی دیکھا تھا لیکن یہ ترجمہ اپنی روانی، بول چال جیسی زبان، دہلی کے محاورے اور زبان کی صفائی کے باعث خاصے کی چیز ہے۔ میر امن کا انتقال 4 جون 1806ء کو ہوا۔

تصانیف: باغ و بہار۔ گنج خوبی۔

نمونہ کلام: ''سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی، رئیس وہاں کے میں کہیں تو تو کہیں ہو کر جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں نکل گئے''

تحریر: اقرا یعقوب

قلندر بخش جرات
1748ء تا 1809ء

شیخ قلندر بخش جرات نے 1748ء میں دہلی میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام یحیٰی امان تھا۔ دہلی پر ابدالی کے حملوں کے بعد جرات کا خاندان بھی فیض آباد ہجرت کر گیا اور وہیں سے جرات نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اُن کی تعلیم واجبی رہی۔ اس کے باوجود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان، علم طب، عروض و قواعد اور فنِ شعر سے بہ خوبی آشنا تھے۔ فیض آباد میں ہی وہ جعفر علی حسرت کے شاگرد ہوئے۔ اُنھوں نے شاعری میں اس قدر مشق کی کہ استاد سے بھی آگے نکل گئے۔ ابتدا میں اُنھوں نے بریلی کے نواب محبت خان کی مصاحبت اختیار کی۔ جب اودھ کا دارالخلافہ لکھنؤ منتقل ہوا تو وہ بھی لکھنؤ آ گئے اور شہزادہ سلیمان شکوہ کے ملازم ہو گئے۔ مصحفی اور انشا بھی ان ہی کے دربار سے وابستہ تھے۔ جرات کو علم نجوم اور موسیقی سے بھی بلا کا شغف تھا اور ستار بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جوانی میں ان کی بصارت زائل ہو گئی۔ روایت ہے کہ پردہ نشین گھرانوں میں بلا تکلف جانے کے لیے وہ شوقیہ اندھے بن گئے تھے۔ جرات سیرت و کردار کے لحاظ سے خوش خلق، نیک خو اور رقیق القلب انسان تھے۔ انشا اور مصحفی کے ساتھ اُن کے معرکے ہوتے تھے۔ جرات معاملہ بندی اور لمسیہ شاعری کے لیے مشہور تھے۔ اُن کی شاعری کو میر نے ''چوما چاٹی'' کہا تھا لیکن اُنھوں نے اُردو ادب کا ایک بڑا خلا پر کیا تھا۔ جرات کا کلام زبان کے اعتبار سے صاف و شستہ ہے، بندش، چستی اور محاورے کو کہیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مسلسل غزلیں کہنا بھی اُن کی ایک خوبی ہے۔ اُنھوں نے اُردو غزل میں رندی، سرمستی اور ہوس پرستی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں۔ لکھنوی ماحول کے مطابق جرات کی شاعری نے اُنھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور اُن کا دیوان ہر وقت نواب آصف الدولہ کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔ اُن کا انتقال 1809ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

تصانیف: برسات کی ہجو میں (مثنوی)۔ حسن و عشق (مثنوی)۔ دیوانِ جرات۔ کلیاتِ جرات۔

نمونہ کلام:

مل گئے تھے ایک بار اُس کے جو میرے لب سے لب | عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زبان پھیرا کیے
الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی | مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

تحریر: ابدال رضا

غلام ہمدانی مصحفی
1751ء تا 1825ء
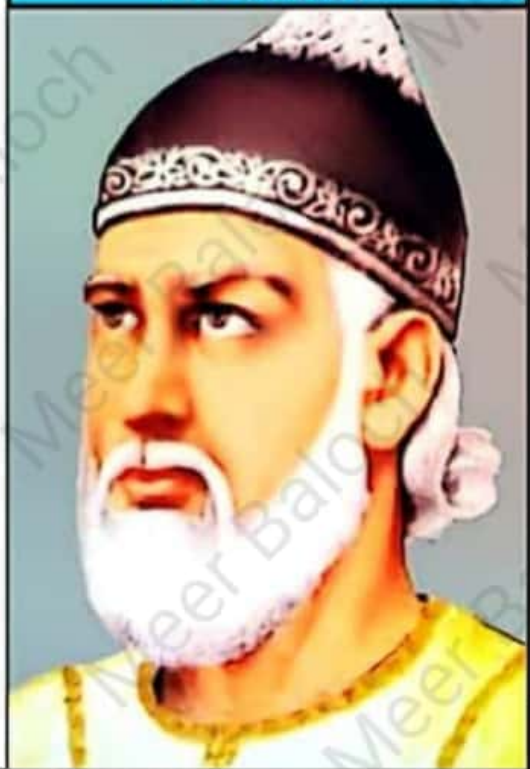
شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ولادت 1751ء میں بہ مقام امروہہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہی حاصل کی۔ مکتب کی تعلیم کے دوران ہی آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ آپ کی شخصیت کی تعمیر میں حصول علم نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور جب آپ امروہہ چھوڑ کر آنولہ اور وہاں سے ٹانڈہ آئے تو علم کا یہ شوق مزید بڑھتا چلا گیا لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ''جنگ سکرتال'' کے بعد جب ٹانڈہ شہر اُجڑا تو لکھنؤ ہجرت کر گئے اور وہاں ایک سال رہ کر جب پہلی بار دہلی آئے تو تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ دہلی سے دوبارہ لکھنؤ آئے تو یہاں آ کر عربی، طب، عروض اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں آپ دہلی کے شہزادے سلیمان شکوہ کے استاد بنے۔ سلیمان شکوہ نے دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں انشا جیسے شاعر جب لکھنؤ آئے تو سلیمان شکوہ نے مصحفی کی استادی چھوڑ کر انشا کو اپنا استاد بنا لیا تو مصحفی درباری زندگی سے نامناسبت کی وجہ سے افلاس کا شکار رہے۔ لکھنؤ میں مصحفی کا انشا کے ساتھ نوک جھونک کا سلسلہ شروع ہوا۔ مصحفی نے اَدبی حوالوں سے تین اَدبی معرکوں سے شہرت پائی۔ پہلا معرکہ جرأت سے دوسرا معرکہ انشا سے اور تیسرا شاگردان سودا سے۔ اصلاح زبان کی تحریک میں دیگر شعرا کی طرح آپ نے بھی اس میں بہ خوبی کردار ادا کیا اور اُردو زبان کو صاف اور فصیح بنایا۔ مصحفی کی بہ طور شاعر وجہ شہرت یہ ہے کہ اُردو شاعری کی روایت کا کم و بیش بڑا سلسلہ آپ سے منسوب ہے اسی طرح لکھنؤ میں بھی روایت شاعری کے جتنے سلسلے ہیں وہ سب مصحفی سے جا ملتے ہیں۔ تعداد میں اتنے قصائد کسی اور شاعر کے کلیات میں نہیں ملیں گے۔ جرأت و انشا اور خود سودا کے قصائد کی تعداد مصحفی سے کم ہے۔ اُنھوں نے 1825ء میں وفات پائی۔

تصانیف: آٹھ دواوین۔ عقد ثریا۔ تذکرہ ہندی۔ ریاض الفصحا۔ مجمع الفوائد۔ مثنویات۔ قصائد۔

نمونہ کلام:

زہرہ کی جو آئی کف ہاروت میں انگلی | کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی
جی رات لبوں پہ آ رہا تھا | مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا

تحریر: فاطمہ ماجد

انشاءاللہ خان انشا
1752ء تا 1817ء

سید انشاءاللہ خان انشا یکم دسمبر 1752ء کو مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر ماشاءاللہ خان تھا جو شاہی طبیب تھے اور شعروشاعری بھی کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شعر کہنے کا شوق اُنھیں بچپن سے ہی تھا۔ کم عمری میں ہی صرف ونحو، منطق وحکمت اور عربی وفارسی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ نواب شجاع الدولہ، مرزا نجف خان اور محمد بیگ ہمدانی سے وابستہ رہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی لسانی تحریک میں انشا نے اصلاحِ زبان کا کام کیا۔ اُنھوں نے اس میں اُردو کی ہیئت ترکیبی متعین کی اور فارسی و عربی زبان کو چھوڑ کر اُردو کی اصلیت کو اجاگر کیا۔ انشا نے مشکل پسندی اور سہل گوئی کی دونوں خصوصیات کو ملا کر لکھنؤ کی ایک زبان بنائی اور اُردو غزل کے ایرانی مزاج کو ہندی مزاج سے ہم آہنگ کیا۔ اس دور میں فورٹ ولیم کالج میں اُردو زبان کو مقامی زبان کے اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش ہورہی تھی، انشا نے یہ کام تن تنہا کیا۔ انشا نے فارسی غلبے کو شعوری سطح پر کم کرنے کی کوشش کی، اُردو زبان کو سادہ گوئی کی راہ پر لائے، اُدب میں ہندستانی عناصر سموئے اور اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کی۔ انشا کی وجہ شہرت ان کی ذہانت اور جدت پسندی ہے جو اُنھیں تاریخ اُدب میں ممتاز مقام دلاتی ہے۔ غزل، قصیدہ اور بےنقط دیوان بھی اُنھوں نے لکھا۔ وہ پہلے ہندستانی ہیں جنھوں نے "دریائے لطافت" کے نام سے زبان و بیان کے قواعد پر روشنی ڈالی۔ انشا نے 19 مئی 1817ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: دیوانِ اُردو۔ دیوانِ ریختی۔ دیوانِ بے نقط۔ دیوانِ فارسی۔ دریائے لطافت۔ لطائف السعادت۔ ترکی روزنامچہ۔ مطرالمرام۔ رانی کیتکی کی کہانی۔ سلک گوہر۔

نمونہ کلام: "اگر مفرد اسم کے آخر میں الف ہو اور وہ اس میں مذکر ہو تو الف کو یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں جیسے لپڑا (لپڑے)، خربوزا (خربوزے)، کیلا (کیلے) اور گھوڑا سے گھوڑے وغیرہ۔"

انشا کی گفتگو وہ دھواں دھار ہے کہ آج — آ کر بہار اس کے گلے سے لپٹ گئی
آئے نہ آپ رات جو اپنے قرار پر — گزری قیامت اس دل امیدوار پر

تحریر: اقرا شہزادی

شاہ نصیر دہلوی
1756ء تا 1838ء

محمد نصیرالدین ناصر المعروف بہ شاہ نصیر دہلوی 1756ء کو بہ مقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایک غریب انسان تھے۔ آپ میر تقی میر، مرزا غالب، اور ذوق کے ہم عصر تھے۔ شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ مشقِ سخن نے اسے اور چمکا دیا اور اسی مشاقی کی بنا کر دربار تک پہنچے اور استاد شاہ ہوئے۔ ذوق سے پہلے بہادر شاہ ظفر کی شاعری کی اصلاح شاہ نصیر ہی کیا کرتے تھے۔ جب دہلی کا انتظام انگریزوں کے اپنے ہاتھ میں لیا تو شاہ نصیر حیدرآباد چلے گئے جسے وہ بہشت کہتے تھے۔ شاہ نصیر خوش اعتقاد انسان تھے۔ اُن کے مزاج میں لطافت اور نفاست تھی۔ شاہ نصیر کی اکثر شعرا سے ٹھنی رہتی تھی۔ سید احمد بریلوی کی تحریک کے خلاف بھی اُنھوں نے نظمیں لکھیں۔ سنگلاخ زمینوں میں اس آسانی سے شعر کہتے کہ یہ مشکل فن اُنھیں سے موسوم ہو کر رہ گیا۔ فنی پختگی پر زیادہ توجہ کو اثر یہ ہوا کہ حقیقی جذبہ دب جاتا اور فکر کا عنصر پیدا نہ ہوتا۔ شاہ نصیر نے مضمون آفرینی خیال بندی، تشبیہ اور استعارہ سازی پر خصوصی توجہ صرف کی اور فن شاعری میں اپنی استادی تسلیم کروائی۔ اُن کی طبیعت کی روانی، کثرت مشق اور جوش وخروش نے ان کے کلام کو سہ آتشہ بنا دیا۔ ان کا مشاعرے میں شاعری پڑھنے کا انداز بھی بہت خوب تھا۔ اُنھوں نے اصلاحِ زبان کے لیے بھی کام کیا اور کئی قدیم الفاظ متروک قرار دیے۔ اُنھوں نے 'تمک'، 'تس پر' جیسے الفاظ ترک کر دیے لیکن 'آئے ہے'، 'جائے ہے' جیسے الفاظ کا جائز سمجھا اور اُنھیں متواتر استعمال کرتے رہے۔ اُنھوں نے مشکل بحروں اور لمبی ردیفوں کا استعمال کیا۔ شاہ نصیر 23 نومبر 1838ء کو حیدرآباد میں فوت ہوئے۔

تصانیف: چمنستان سخن۔ دیوان شاہ نصیر دہلوی۔ انتخاب شاہ نصیر، کلیات شاہ نصیر (چار جلدیں) جلد اول تا سوم (غزلیات) جلد چہارم (قصیدہ، مسدس، مخمس، رباعیات، قطعات)۔

نمونہ کلام:
تیرے آنے کی خبر جو گل شاداب اڑی — بیضہ غنچہ سے اک بلبل بےتاب اڑی
کہتا ہوں نصیر اٹھ کے دریار پہ جا بیٹھ — دنیا میں کہیں اور ٹھکانا نہیں اچھا
مل بیٹھنے بیدے ہے فلک ایک دم کہاں — کیا جانے تم کہاں ہو کوئی دم کو ہم کہاں

تحریر: شازیہ پروین

جان گل کرسٹ
1759ء تا 1841ء

جان گل کرسٹ 19 جون 1759ء کو ایڈنبرا، سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ہندستان آئے اور یہاں اس وقت رائج اُردو زبان سیکھی، جسے وہ ہندستانی کہتے تھے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے پیشے کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف خود ہندستانی زبان سیکھیں گے بل کہ اپنے ہم وطن انگریزوں کو بھی یہ زبان سیکھنے میں مدد دیں گے۔ چناں چہ اُنھوں نے محنت شاقہ کے بعد مختلف شہروں میں گھوم پھر اُردو زبان سیکھی اور اس کے مختلف لہجوں سے آشنا ہوئے۔ اس دوران اُنھوں نے ایک انگریزی اُردو لغت مرتب کرنے کا کام بھی جاری رکھا اور اس کی پہلی جلد 1784ء میں ترتیب دی۔ 1790ء تک اُنھوں نے English Hindoustani Dictionary مرتب کی اور 1796ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ پھر دو برس بعد The Oriental Linguist لکھی۔ پھر اُنھوں نے حکام سے کلکتہ آنے کی اجازت طلب کی۔ 1798ء میں بنگال کے ڈپٹی سیکرٹری ڈنکن کیمبل نے اُنھیں بذریعہ خط اطلاع دی کہ کمپنی نے نئے ملازمین کو اُردو پڑھانے کے لیے ان کی پیشکش منظور کر لی ہے۔ اس طرح اُنھوں نے 1801ء میں کلکتہ آ کر انگریز افسروں کو مقامی زبان سکھانے کے لیے اورینٹل سیمینری کے نام سے تعلیمی ادارہ بنایا جو بعد میں فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ گل کرسٹ اس ادارے کے بانیوں میں تھے اور چار سال تک اس ادارے میں اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ اُنھوں نے اُردو کے عالم فاضل منشی ملازم رکھے اور اپنے زیرِ سایہ نثر کی بہترین کتب تحریر یا ترجمہ کروائیں۔ 1804ء میں واپس انگلستان چلے گئے اور اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ کا انتقال 9 جنوری 1841ء کو پیرس میں ہوا۔

تصانیف: انگریزی ہندستانی لغت۔ ہندستانی زبان کے قواعد۔ مشرقی قصے۔ مشرقی زبان دان۔ فارسی افعال کا نظریہ جدید۔ رہنمائے اُردو۔ اتالیق ہندی۔ عملی خاکے۔ ہندوی داستان گو۔ ہندستانی بول چال۔

نمونہ کلام: ”فائدہ* زبان قدیم میں لفظ سکھی و نین وآنکھ کی جمع کئی طور پر بھی سکھیں بکسر یا و سکھیں بفتح یاو نین بفتح نون دوم و نینن بکسر نون دوم وانکھیں بفتح یا سکھیاں وانکھیاں و نیناں“

تحریر: اقرا شبیر

میر مستحسن خلیق
1766ء تا 1844ء

میر مستحسن خلیق 1766ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ اُردو کے عظیم ترین مثنوی نگار میر حسن کے صاحبزادے اور بہترین مرثیہ نگار میر انیس کے والد تھے۔ آپ نے فیض آباد اور لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی اور اپنے والد کے مشورے سے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے لیکن پھر مرثیہ کی طرف آ گئے اور اپنی خاندانی روش پر چل نکلے اور اسی صنف میں نام کمایا۔ حالات کی تنگی کے باعث جب کوئی ذریعہ معاش نہ تھا تو اپنی طبع زاد غزلیں لکھ کر معمولی معاوضے پر فروخت بھی کر دیا کرتے تھے۔ اُن کا ادبی مقابلہ میر ضمیر کے ساتھ ہوتا تھا اور دونوں بڑھ چڑھ کر مرثیہ کی تخلیق پر زور صرف کرتے تھے۔ اس مقابلے کی فضا نے اُردو مرثیے کو بہت پروان چڑھایا۔ اُنھوں نے اپنے مرثیوں میں واقعہ کربلا کی جزیات کو نہایت سلیقے اور صفائی سے بیان کیا۔ اُردو مرثیے میں منظر نگاری اور محاکات کا جس خوبی سے استعمال میر خلیق نے کیا ہے اس کی برابری اور کوئی مرثیہ نگار نہیں کر سکا۔ اُنھوں نے غزل کے عروج کے زمانے میں مرثیے کو موقر اور مقبول صنف بنایا جو ان ہی کا خاصہ تھا۔ مرثیہ میں صحت زبان محاورہ کی صفائی پر بہت توجہ دی اور لفظی مناسبات کی بجائے درد واثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے بیش تر مراثی غیر مطبوعہ ہیں البتہ اُنیس مرثیوں کا ایک مجموعہ 1998ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ان کی غزلیات کا دیوان ان کے شاگرد اور گلبرگہ کے نواب نے طبع کروایا تھا۔ آپ نے اُردو مرثیے کو وہ مضبوط بنیاد فراہم کی جس پر آپ کے بیٹے میر انیس نے شان دار عمارت تعمیر کی۔ میر خلیق کے مرثیوں کی جھلک میر انیس کے ہاں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ میر خلیق کا انتقال 1844ء میں فیض آباد میں ہوا۔

تصانیف: مراثی میر خلیق۔ دیوان میر خلیق (غزلیات)۔

نمونہ کلام:

جب اصغر معصوم کی گردن پہ لگا تیر — اور شاہ کے بازو میں بھی پیوست ہوا تیر
ہاتھوں پہ تڑپنے لگا بچہ بھی جو کھا تیر — شہ نے کہا اس پیاسے کو تھا مارنا کیا تیر
کب ہم نے کہا تھا کہ زبردستی سے لیں گے — اتنا ہی کہا ہوتا کہ ہم پانی نہ دیں گے

تحریر: اقصیٰ شفیق

ماہ لقا بائی چندا
1768ء تا 1824ء

ماہ لقا چندا بائی 7 اپریل 1768ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا تخلص چندا تھا۔ اُردو زبان کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ اُن کا شمار حیدر آباد دکن میں اُردو زبان کی اولین شاعرات میں کیا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں ماہ لقا کی شاعری نے اُردو زبان کی شاعری کے دبستان دکنی کو نیا انداز دیا۔ 1824ء میں ماہ لقا کے اُردو دیوان کی اشاعت کے بعد اسے اُردو زبان کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا مقام حاصل ہوا۔ جنوبی ہند میں اُردو زبان کے فروغ میں ماہ لقا کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ نظام حیدر آباد کے دربار سے بھی منسلک رہیں۔ ماہ لقا کی رسائی مہتاب کنور کے توسط سے ہوئی تھی اس لیے وہ طویل عرصہ نواب رکن الدولہ کے زیر سایہ پرورش پاتی رہیں۔ اس دوران ماہ لقا نے شاعری میں اپنے ذوق کو بڑھانا شروع کیا۔ نوجوانی کے دور میں اسے حیدر آباد دکن کے تمام اَدبی سرمایے شاہی کتب خانوں میں فراہم ہوتے رہے۔ ماہ لقا دکنی شاعری میں سراج اورنگ آبادی سے متاثر تھیں۔ شاعری میں نواب میر عالم بہادر سے اصلاح لیتی تھیں۔ اُن کی مادری زبان اُردو زبان کا دکنی لہجہ تھی، اس کے علاوہ عربی، فارسی اور بھوج پوری زبان میں نہایت آسانی سے گفت گو کر لیتی تھیں۔ مہ لقا بائی چندا کو حضرت علی سے بہت عقیدت تھی۔ اُن کے دیوان میں حضرت علی کی مدح و منقبت میں بہت سے اشعار مل جاتے ہیں۔ اُن کی ہر غزل کا مقطع عموماً حضرت علی کے مناقب کو بیان کرتا ہے اس کے علاوہ بعض غزلوں کے تمام اشعار حضرت علی کے تعریف میں ہیں۔ اُنھوں نے یکم اگست 1824ء کو حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔

تصانیف: گلزار ماہ لقا (دیوان)۔ دیوان چندا (قلمی نسخہ)۔ دیوان مہ لقا بائی چندا (مجلس ترقی اُردو)

نمونہ کلام: نہ گل سے ہے غرض تیرے نہ ہے گلزار سے مطلب ۔۔۔ رکھا چشم نظر شبنم میں اپنے یار سے مطلب

یا ساقی کوثر یہی چندا کی دعا ہے ۔۔۔ یہ دور رہے ان سے جو ہے ننگ خرابات

چندا کو بخش یا علی اپنی جناب سے ۔۔۔ رتبہ جو دو جہان میں ہوا اقتدار کا

تحریر: آصف فلک

حیدر بخش حیدری
1769ء تا 1823ء

(تصویر قیاسی ہے)

سید حیدر بخش حیدری 1769ء میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہجرت کر کے ہندستان آئے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد آپ اپنے والد کے ساتھ بنارس چلے گئے۔ آپ شاعر بھی تھے لیکن فورٹ ولیم کالج میں نثری کتابیں زیادہ لکھنے کی وجہ سے شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر امن کے بعد جس مصنف کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ حیدر بخش حیدری ہی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے لیے ہندستانی منشیوں کی ضرورت کا اشتہار کا سن کر آپ کلکتہ چلے گئے اور ڈاکٹر گل کرسٹ تک پہنچنے کے لیے ایک قصہ "مہر و ماہ" بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ گلکرسٹ نے قصے کو پسند کیا اور ان کو منشی رکھ لیا جہاں آپ بارہ برس تک رہے۔ فورٹ ولیم کے منشیوں میں سب سے زیادہ کتابیں حیدری نے ہی لکھیں اس طرح آپ فورٹ ولیم کالج کے لیے سب سے زیادہ نثر لکھنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ اُن کی شہرت کا مدار "توتا کہانی" اور "آرائش محفل" پر ہے۔ حیدری نے یہ دونوں قصے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھے تھے۔ "توتا کہانی" دراصل کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں پینتیس کہانیاں موجود ہیں جب کہ "آرائش محفل" فارسی قصے کا ترجمہ ہے جو مافوق الفطرت کرداروں پر مبنی ایک سبق آموز کہانی ہے۔ یہ کہانیاں جدید افسانے کی پیش رو ہیں اور ان کے اسلوب میں تازگی، روانی اور تحرک موجود ہے۔ سید حیدر بخش حیدری کا انتقال 1823ء میں ہوا۔

تصانیف: قصہ مہر و ماہ۔ قصہ لیلیٰ مجنوں ہفت پیکر۔ تاریخ نادری۔ گلزار دانش۔ گلدستہ حیدری۔ تذکرہ گلشن ہند۔ توتا کہانی۔ آرایش محفل۔ گل مغفرت۔

نمونہ کلام: مت اس کی دوستی کا تجسس کر حیدری ۔۔۔ یہ چرخ کینہ جو کسی کا آشنا نہیں

"جب خوب بناؤ سنگھار کر کے جانے لگی تو پہلے مینا کے پاس گئی اور کہنے لگی: "مینا! میری پیاری مینا! میں بھی عورت ہوں اور تو بھی عورت ذات ہے اس لیے میرے درد دل کو تو اچھی طرح سمجھتی ہے، جذبات کو کیا کروں" (توتا کہانی)

تحریر: انجم ستار

شیخ امام بخش ناسخ
1772ء تا 1838ء

شیخ امام بخش ناسخ 10 اپریل 1772ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ گھر والے عبداللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ اُن کے والد شیخ خدا بخش کا پیشہ تجارت تھا۔ وہ لاہور سے فیض آباد آئے تھے لیکن خود ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور اُن کا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی لکھنؤ میں گزری۔ ناسخ کو ورزش کا شوق تھا۔ بدن پھرتیلا تھا بچپن میں ہی لکھنؤ چلے آئے یہاں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ میر تقی میر سے بے حد متاثر تھے۔ ناسخ کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔ اودھ کے حکمران غازی الدین حیدر نے ناسخ کو باقاعدہ ملازم رکھنا چاہا تھا مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ درباری جھگڑوں کے سبب ان کو لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد، فیض آباد، بنارس اور کان پور میں رہنا پڑا۔ ناسخ نے بیس سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کی اس وقت میر زندہ تھے اور سودا کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ ناسخ شکل وصورت سے پہلوان لگتے تھے ناسخ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے نہایت وضع دار، متحمل مزاج تھے۔ شیخ امام بخش ناسخ اُردو غزل میں ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے ان کو شاعری کے دبستان لکھنؤ کا بانی کہا جاتا ہے جس کی پہچان نازک خیالی، پُرشکوہ اور بلند آہنگ الفاظ کا استعمال اور داخلیت سے زیادہ خارجیت پُر زور تھی۔ محمد حسین آزاد کے بقول ناسخ کو تین ہی شوق تھے کھانا، ورزش کرنا اور شاعری کرنا اور یہ تینوں شوق جنون کی حد تک تھے۔ ناسخ کی شاعری میں نہ تو جذبات و احساسات ہیں اور نہ ہی ان کی پیدا کردہ سادگی ملتی ہے۔ اُنھوں نے مشکل زمینوں اور طویل ردیفوں کی حامل شاعری ہی نہ کی بلکہ استادی بھی تسلیم کروائی۔ ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے اُردو زبان کو قواعد وضوابط کے حوالے سے بہت زیادہ ترقی دی۔ امام بخش ناسخ نے 16 اگست 1838ء کو وفات پائی۔

تصانیف: مولد شریف۔ معراج نامہ۔ شہادت نامہ آلِ نبی۔ مثنوی در بیان ولادت وفضائل حضرت علی مرتضیٰ۔ سراج نظم۔ دیوان ناسخ۔ دفتر پریشان۔ دفتر شعر۔ دیوان فارسی۔

نمونہ کلام:

سب زمینیں ہیں نئی بیٹھیں ہیں اے یار نئی　　روز یہاں ریختے کی اٹھتی ہے دیوار نئی

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر　　دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر

تحریر: فائزہ عاشق

بہادر شاہ ظفر
1775ء تا 1862ء

مرزا ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ متخلص بہ ظفر کی پیدائش 24 اکتوبر 1775ء کو اکبر شاہ ثانی کے زمانہ ولی عہدی میں ان کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ جدِ امجد اورنگ زیب کے بیٹے کا لقب بھی بہادر شاہ تھا لہٰذا بہادر شاہ ثانی کہلائے۔ تعلیم وتربیت قلعہ معلّٰی میں پورے اہتمام کے ساتھ ہوئی۔ اُنھوں نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اور لال قلعہ کی تہذیبی زندگی اور اس کے مشاغل میں گہری دل چسپی لی۔ اُردو اور فارسی کے علاوہ پنجابی میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔ جس وقت اُنھوں نے تخت سنبھالا اس وقت مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانس لے رہی تھی۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا حکومت بھی لال قلعے کی حدود تک رہ گئی تھی۔ ظفر شاعری سے پرانی دل چسپی رکھتے تھے اور غالب، مومن اور ذوق کے ہم عصر تھے۔ ان کے زمانے میں غزل میں جدت اور فکر وفلسفہ کو داخل کرنے سے غزل ثروت مند ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر نے غزل میں داخلی جذبے کو شامل کیا۔ شاعری میں ابراہیم ذوق سے اصلاح لیا کرتے تھے ان کی وفات کے بعد مرزا غالب سے رہنمائی حاصل کی۔ 1857ء میں ہونے والی جنگ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا اس میں بہادر شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے نا صرف ان کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں اُنھوں نے اپنی باقی کی زندگی قید میں گزاری اور پانچ سال بعد جلاوطنی کی حالت میں انتقال کر گئے۔ ان کی شاعری نے ان کو شہرت دوام عطا کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے کلیات میں بیس ہزار سے زیادہ شعر ہیں اُنھوں نے سبھی اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی پہچان ان کی غزل ہے جس میں سوز وگداز اور غم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، دردمندی، حزن ان کی غزل کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اُنھوں نے 7 نومبر 1862ء کو وفات پائی۔

تصانیف: دیوانِ ظفر۔ کلیاتِ ظفر۔

نمونہ کلام:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

تحریر: فرحین آصف

حیدر علی آتش
1778ء تا 1847ء

خواجہ حیدر علی آتش 1778ء میں فیض آباد میں علی بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی اجڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ذرائع معاش تیزی سے معدوم ہو رہے تھے۔ جنگ میں شجاع الدولہ اور مغل افواج کی شکست کے بعد سارا سیاسی، معاشی و معاشرتی منظر بدل رہا تھا۔ اسی دور میں آتش کے والد دہلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور یہیں آتش کی پیدائش ہوئی۔ آتش کے بچپن اور جوانی کا زمانہ فیض آباد میں گزرا۔ وہ خوب رو نوجوان تھے۔ والد کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا جس کے بعد آتش نے تعلیم چھوڑ دی اور فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ گردی اور بانک پن کو شعار بنا لیا۔ جلد ہی تلوار چلانے میں مہارت حاصل کی اور سپاہی کا پیشہ اپنا لیا، اس دور میں نوجوانوں کا یہی پسندیدہ پیشہ تھا۔ آتش بات بات پر تلوار نکال لیتے تھے اس لیے انھیں "تلوار یے" کہا جاتا تھا۔ بھنگ، چرس، حقہ اور کبوتر پالنے کا بھی شوق تھا۔ آتش علم عروض اور فن شعر سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ تصوف سے لگاؤ انھیں ورثے میں ملا تھا۔ اخلاق کا درس اس تہذیب اور عقیدت سے ملا تھا جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ وہ رند مشرب، صاف دل، آزاد خیال اور درویش صفت انسان تھے۔ کبھی کسی امیر سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ کسی کے کہنے پر کہیں نہیں جاتے تھے۔ اُن کے انداز میں بے نیازی، عزلت پسندی، خوش اخلاقی، صبر و شکر اور زمانے سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نمایاں نظر آتا تھا۔ بانک پن اور شمشیر زنی نے بہادری کو ان کے مزاج میں شامل کر دیا تھا۔ آتش دبستان لکھنؤ کے اہم ترین شاعر تھے۔ اُن کا شعری اسلوب اسی خاک سے اٹھا تھا اور آج بھی ان کا نام اسی دبستان کے حوالے سے لیا جاتا ہے۔ اُن کی وجہ شہرت غزل میں مرصع نگاری ہے۔ اُنھوں نے منقبت اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن واسوخت کا لہجہ، طرز اور لفظیات آتش کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اُنھوں نے 13 جنوری 1847ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: دیوان خواجہ حیدر علی آتش۔ کلیاتِ خواجہ حیدر علی آتش۔

نمونہ کلام:

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا تھا — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

تحریر: ثانیہ رضا

مرزا شوق لکھنوی
1780ء تا 1871ء

نواب مرزا شوق لکھنوی کا نام تصدق حسین تھا۔ 1780ء میں لکھنؤ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ نواب مرزا عرفیت تھی۔ شوق کا پورا خاندان حکمت میں مشہور تھا لیکن ان کے چچا مرزا علی خاں لکھنؤ کے مشہور حکیموں میں سے تھے اور شاہانِ اودھ کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اُنھوں نے ایسے عہد میں آنکھ کھولی تھی جب لکھنؤ میں ہر طرف شعر و سخن کا بول بالا تھا، اس ماحول نے اُنھیں غزل کی طرف مائل کیا۔ مرزا شوق نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل کی۔ اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور و معروف اساتذہ کی تعلیم اور فیضانِ صحبت سے مختلف علوم پر مہارت حاصل کی۔ علم طب پر بھی پورا پورا عبور حاصل کیا۔ شاعری میں اُنھوں نے آتش کی شاگردی اختیار کی لیکن استاد اور شاگرد کی طبیعتوں میں اتنا اختلاف تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ "زہرِ عشق" مرزا شوق کی آخری مثنوی ہے جو اُنھوں نے 1840ء میں لکھی۔ اندازِ بیاں، روانی محاوروں کی خوبی نمایاں ہے اور ان خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار اُردو کی بہترین مثنویوں میں کیا جاتا ہے۔ نواب مرزا شوق نے اپنے عہد کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور متوسط طبقہ کی روزمرہ زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جس میں حقیقی زندگی کی دھڑکن بھی موجود ہے۔ جو اسے پڑھتا ہے اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کے جذبات و واقعات اپنے ارد گرد کے واقعات سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاثیر دوسری مثنویوں سے کہیں زیادہ ہے۔ میر نے آپ بیتی کا جو انداز مثنوی "خواب و خیال" میں اختیار کیا تھا وہی زہرِ عشق سے بھی ملتا ہے۔ اس مثنوی میں عشق کا جذبہ بے حد متحرک ہے لیکن انجام کار مایوسی اور غم محرومی ہی ہے۔ وہ 30 جون 1871ء کو لکھنؤ میں انتقال کر گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔

تصانیف: زہرِ عشق۔ فریبِ عشق۔ بہارِ عشق۔ کلیاتِ نواب مرزا شوق لکھنوی۔

نمونہ کلام:

ثابت یہ کر رہا ہوں کہ رحمت شناس ہوں — ہر قسم کا گناہ کیے جا رہا ہوں میں

دیکھ لو ہم کو آج جی بھر کے — کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

تحریر: محمد احمد

محمد ابراہیم ذوق
1790ء تا 1854ء

شیخ ابراہیم ذوق 22 اگست 1790ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو فوج میں سپاہی تھے۔ آپ کے استاد حافظ غلام رسول شوق تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر آپ کے استاد تھے لیکن بہ وجوہ دونوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ مولوی باقر ان کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ شاہ نصیر کی وفات کے بعد آپ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے شاعری میں استاد مقرر ہوئے اور اپنی وفات تک اسی عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ شہزادہ جہانگیر کی شادی میں آپ نے جو قصیدہ سنایا وہ عوام میں بہت مقبول ہوا۔ اکبر شاہ ثانی نے ''خاقانی ہند'' کا خطاب دیا۔ 1808ء میں بہادر شاہ ظفر کے استاد اور 1837ء میں ظفر کی تخت نشینی پر ملک الشعرا کہلائے۔ جب شاہ نصیر حیدر آباد آ گئے تو ولی عہد بہادر شاہ کی غزلوں کی اصلاح کا کام ماہانہ چار روپے کے معاوضہ پر کیا۔ آپ نے تشبیب اور گریز میں الفاظ کا نیا طریقہ رائج کیا۔ آپ نے مشاعرے کی وجہ سے دہلی کے بڑے بڑے لوگوں میں شعر کا ذوق پیدا کیا۔ ان کی شاعری میں جذبہ و عمل کے مختلف انداز نظر آئے۔ ذوق کو سودا سے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک تو یہ بات ہے کہ دونوں کا کوئی مخصوص طرز احساس اور منفرد طرز اظہار نہیں، دوسرا قصیدہ نگاروں نے دونوں کو باکمال تسلیم کیا ہے۔ ذوق کے چند رو قصائد ہیں جو عوام تک پہنچے ہیں لیکن یہ تمام قصائد ان کے نہیں۔ 1857ء کے ہنگامے میں اُن کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ ان میں کچھ تو سودا ہی کے انداز میں ہیں لیکن ذوق کی انفرادیت ہر موقع پر قائم رہتی ہے۔ سودا نے اُردو اور فارسی کے اساتذہ کو اپنی منزل تصور کیا ہے۔ محض 19 برس کی مختصر عمر میں ''خاقانی ہند'' کا خطاب پانے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ اس کو فن شاعری میں کمال حاصل تھا اور ذوق نے خود کو اس اعزاز کا اہل بھی ثابت کیا۔ اُنھوں نے 16 نومبر 1854ء کو وفات پائی۔

تصنیف: دیوانِ ذوق (مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد)۔

نمونہ کلام:

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا — گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

تحریر: حبیب اللہ

گارساں دتاسی
1794ء تا 1878ء
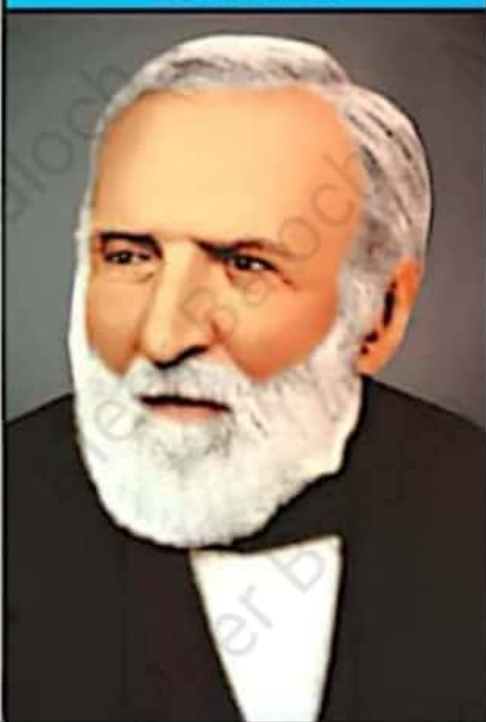
گارساں دتاسی فرانس کے شہر مارسیلز میں 25 جنوری 1794ء کو پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے مشرقی علوم کے لیے عربی اور ترکی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ مشرقی السنہ کے شوق نے اُنھیں اُردو کی طرف متوجہ کیا اور اس میں اُنھوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ پیرس کے السنہ شرقیہ کے کالج میں ہندستانی زبان کے پروفیسر کے لیے گارساں دتاسی کا تقرر کیا گیا۔ وہ پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے نہ صرف بانی تھے بلکہ اس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں پندرہ کتابیں لکھیں، اُردو اَدب کے بارے میں فرانسیسی زبان میں لکھا اور اُردو کی اَدبی نگارشات کی تدوین کی۔ اُردو کی تبلیغ و اشاعت اور حمایت کی جو خدمات سر انجام دی ہیں وہ اُردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ لیکن ان کے تین کام ایسے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ''کلیاتِ ولی'' جس کے متعدد قلمی نسخے مختلف مقامات سے حاصل کر کے جمع کیے اور ان کا مقابلہ کر کے بڑی محنت سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا جو 1834ء میں شائع ہوا، دوسرا تاریخ اَدب ہندستانی اور تیسرا سالانہ خطبات۔ اُنھوں نے عمر بھر خود کو اُردو زبان کی ترقی اور تحقیق کے لیے وقف کیا۔ اُنھوں نے تین جلدوں میں ہندستانی اَدب کی تاریخ کے عنوان سے فرانسیسی زبان میں سب سے پہلے اُردو اَدب کی تاریخ لکھی، یہ اس وقت کی بات ہے جب ایسا کوئی تاریخی مواد خود اُردو میں موجود نہ تھا۔ اُنھوں نے متعدد کتابیں اُردو اَدب و تاریخ کی تالیف کیں اور کئی مشہور اُردو اَدبی مجموعات کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اُن کا انتقال 2 ستمبر 1878ء کو مارسیلز میں ہوا۔

تصانیف: اُردو کا قاعدہ۔ اَدب اُردو ہندی کی تاریخ۔ ہندی کا قاعدہ۔ خطبہ افتتاحیہ۔ ہندستانی شاعر عورتیں۔ ہندستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات۔ ہندستانی اَدب کی تاریخ۔ خطبات گارساں دتاسی۔ مقالات گارساں دتاسی۔ گارساں دتاسی کے تمہیدے خطبے۔ رسالہ تذکرات۔

نمونہ کلام: ''سودا کی زبان بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور زبان کی تیزی میر پر غالب ہے مگر میر کی زبان کو اس کی زبان نہیں پہنچتی۔''

تحریر: علی رضا

مرزا اسد اللہ خان غالب
1797ء تا 1869ء

مرزا اسد اللہ خان غالب 27 دسمبر 1797ء کو عبداللہ بیگ کے ہاں آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے اسد اور بعد میں غالبؔ تخلص استعمال کیا۔ غالبؔ اُردو اَدب کے مشہور شاعر ہیں، ان کے بزرگوں کا تعلق ایران سے تھا۔ غالبؔ کی عمر ابھی 5 سال کی تھی جب ان کے والد وفات پا گئے۔ ان کی ذمہ داری ان کے چچا پر آ گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ زندہ رہے پھر ان کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ غالبؔ کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ 13 سال کی عمر میں شاعری شروع کر دی۔ غالبؔ کا نکاح الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوا۔ نکاح کے بعد آگرہ چھوڑ کر دہلی میں گلی قاسم جان اور حبش خان کے آس پاس رہنے لگے۔ غالبؔ نے اپنی زندگی میں کبھی خود کا مکان نہیں خریدا ہمیشہ کرایے کے مکان میں رہے یہاں تک کہ کتابیں بھی کرایے پر لے کر پڑھتے تھے۔ غالبؔ خوددار انسان تھے اُنھوں نے اپنی عزت کے لیے دہلی کالج کی ملازمت چھوڑ دی تھی کیوں کہ گیٹ پر غالبؔ کو کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ غالبؔ کا تعلق شاہی دربار سے تھا۔ ذوقؔ کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد بنے۔ اُنھوں نے مزاح بھی لکھا۔ غالبؔ کی زندگی کا آخری حصہ بڑی مشکل میں گزرا۔ اُنھوں نے اُردو اور فارسی میں شاعری اور خطوط بھی لکھے مگر زیادہ شہرت غالبؔ کو اُردو شاعری سے ملی۔ غالبؔ کے بغیر اُردو اَدب مکمل ہی نہیں ہوتا شاعری ہو یا نثر غالبؔ کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ غالب کے خطوط بھی ان کی شہرت کا باعث ہیں۔ غالبؔ ہر زمانے اور ہر عہد کے شاعر ہیں۔ اُنھیں نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ بہادر اور مرزا نوشہ جیسے القابات سے نوازا گیا۔ غالب دنیا بھر میں اُردو غزل کی پہچان ہیں۔ 15 فروری 1869ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا اور بستی نظام الدین اولیا میں دفن ہوئے۔

تصانیف: دیوان غالبؔ (اردو)۔ دیوان غالبؔ (فارسی)۔ قاطع برہان۔ مکاتیب غالبؔ۔ احوال غالبؔ۔ خطوط غالب۔ عود ہندی۔ اُردوئے معلّی۔ پنج آہنگ۔ مہر نیم روز۔

نمونہ کلام:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

تحریر: فرزانہ یونس

مومن خان مومن
1800ء تا 1852ء
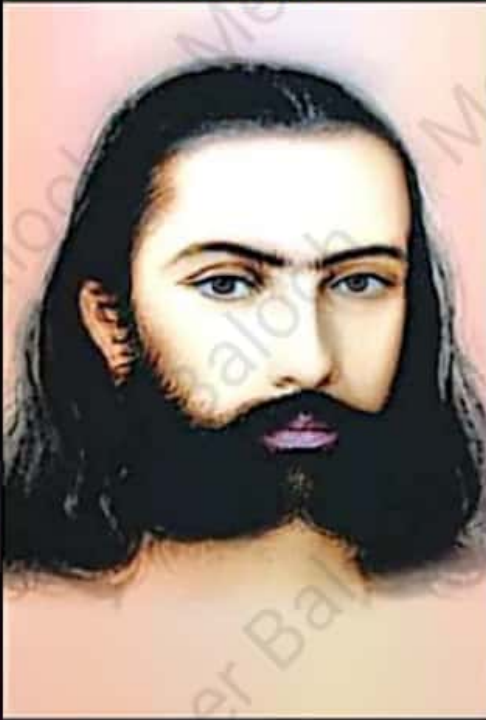
حکیم مومن خان مومن کی ولادت 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ کے والد معروف حکیم تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں ہوئی۔ مومن نہ صرف عربی، فارسی، اُردو، منطق، حدیث اور علوم اسلامی سے خوب واقفیت رکھتے تھے بل کہ علم طب، رمل، جفر، نجوم، شطرنج اور موسیقی میں درک رکھتے تھے۔ عملیات سے بھی شغف تھا اور عشق بازی کے لیے مشہور تھے۔ ان کا اصل میدان شاعری ہے جس میں اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کا لوہا غالب اور ذوق جیسے نامور اور بڑے شاعروں کی موجودگی میں منوایا۔ اصلاح سخن کے لیے شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ مرزا غالب نے آپ کے ایک شعر کے عوض پورا دیوان دینے کی پیش کش کی۔ آپ خوش لباس اور خوش گفتار شخصیت کے مالک تھے۔ رنگین مزاجی رندی و نشاط پسند طبیعت کی وجہ سے عشق مجازی کے تمام رموز کی اپنی شاعری میں بڑے لطیف اور دل کش انداز میں پیش کیے۔ عشق حقیقی کے پہلو میں جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ایک "مثنوی جہادیہ" لکھی اور آخری عمر میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل سے متاثر ہو کر پرہیزگاری اختیار کی۔ اُردو اَدب کے بہت کم ایسے شاعر ہیں جن میں مومن جیسی رنگا رنگی اور ندرت خیال پائی جاتی ہو۔ مومن نے غزل کے علاوہ بھی اَدب کی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں مثنوی، قصیدہ، رباعی، ترکیب بند، حمد، نعت، منقبت اور ایک قصیدہ شامل ہے۔ مثنویاں زیادہ تر آپ کی ذاتی عشقیہ داستانوں پر مبنی ہیں۔ آپ خالص اور رومانوی شاعر ہیں عشق و محبت، حسن و جمال، ہجبت و رقابت، معاملہ بندی اور رشک و حسرت جیسے موضوعات ان کی شاعری کا غالب پہلو ہیں۔ مومن نے معاملہ بندی میں غزل کو جس عروج پر پہنچایا اس کی مثال کوئی اور شاعر نہیں دے سکتا۔ مومن 14 مئی 1852ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تصانیف: دیوان مومن۔ قول غمگیں۔ شکایات ستم۔ قصہ غم۔ حسین مغموم۔ آزاری مظلوم۔ جہادیہ۔

نمونہ کلام:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تحریر: حمیدہ کوثر

میر انیس
1802ء تا 1874ء

میر ببر علی انیس 1802ء میں پیدا ہوئے۔ آپ میر حسن کے پوتے اور میر خلیق کے بیٹے تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی دینی تعلیم اور قرآن مجید کی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ آپ نے خوش خطی اور دوسرے عملی فن حاصل کیے۔ میر انیس کا خط عمدہ اور صاف تھا۔ عربی زبان بھی جانتے تھے۔ تاریخ و حدیث کا وسیع مطالعہ تھا۔ شعر و شاعری مشغلہ تھا۔ شمشیر زنی بھی سیکھی۔ میر انیس نے فیض آباد میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری میں پہلے حزیں تخلص کرتے تھے لیکن جب لکھنؤ آئے تو ان کے والد ان کو ناسخ کے پاس لے گئے اور ناسخ کے کہنے پر تخلص بدل کر "انیس" اختیار کیا۔ میر ضمیر نے مرثیہ کو جس مقام پر چھوڑا تھا میر انیس نے اس کی معنوی عظمت کو اپنے تخیل اور قدرت بیان سے آگے بڑھایا۔ اُنھوں نے مرثیے کی روایت کو فنی عظمت سے ہم کنار کیا۔ انیس کے مرثیے میں چہرہ، سراپا، رخصت آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میر انیس نے ابتدا غزل سے کی لیکن باپ کی کہنے پر مرثیہ نگاری کی طرف آ گئے۔ میر انیس نے مرثیے میں واقعاتی تصویریں پیش کیں۔ اُنھوں نے مرثیے میں تشبیہات و استعارات، زبان کی پختگی، تمثیلوں اور صنائع بدائع کو خوبی سے استعمال کیا۔ اُن کی تشبیہات معمولی قسم کی نہیں ہوتی تھیں۔ اشعار بہت صاف اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں۔ ایک مضمون کو اس سادگی سے کہتے کہ وہ ہر بار نیا معلوم ہوتا تھا۔ میر انیس کو اُردو ادب میں بہترین مرثیہ نگار مانا جاتا ہے۔ اُنھوں نے تخیل کے زور پر کربلا کے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا ہے۔ جیسے وہ خود وہاں پر موجود ہوں۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے کربلا کے واقعہ کو جذبے کی زبان عطا کی۔ انیس نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسے خوب صاف کیا ہے اور اس میں سب سے زیادہ الفاظ کا استعمال کیا۔ اُنھوں نے 10 دسمبر 1874ء کو وفات پائی۔

تصانیف: المیزان۔ مراثی انیس۔ انتخاب مراثی انیس۔ انیس کے مرثیے۔ رباعیات انیس۔ انیس کے سلام۔

نمونہ کلام:

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر ۔۔۔ اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ۔۔۔ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

تحریر: اسما الطاف

یوسف خان کمبل پوش
1803ء تا 1861ء

یوسف خان کمبل پوش 1803ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل وطن حیدر آباد دکن تھا لیکن بعد میں لکھنؤ جا کر بس گئے۔ بچپن ہی سے وہ سیلانی مزاج اور سیر و سیاحت کے دلدادہ تھے۔ متعدد مقامات کا سفر کیا جن میں عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھ پور، نیپال، شاہ جہان آباد، لکھنؤ، کلکتہ، آگرہ اور انگلستان قابل ذکر ہیں۔ یوسف خان کمبل پوش اُردو کے پہلے سفر نامہ نگار تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں تاریخ یوسفی (عجائبات فرنگ) کے نام سے پہلا سفر نامہ لکھا۔ اُن کا یہ سفر نامہ اُردو سفر نامے کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے پیرس، مصر، مالٹا، جبرالٹر اور سیلون کا سفر بھی کیا۔ جب وہ بمبئی پہنچے تو ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات سے آگاہ کریں۔ یوسف خان کمبل پوش نے سب سے پہلے اپنے سفر کی یادداشتوں کو فارسی زبان میں تحریر کیا لیکن اس سفر نامے کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی کیوں کہ اس زمانے میں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے یوسف خان کمبل پوش نے قارئین کے ذوق سلیم کا احساس کرتے ہوئے اپنے سفر کی تمام یادداشتوں کو اُردو زبان میں از سرِ نو تحریر کیا۔ یوسف خان کمبل پوش کا لکھا ہوا یہ سفر نامہ "تاریخ یوسفی" کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ مکتبۃ العلوم دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ جہاں انیسویں صدی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے وہیں اس میں طنز و مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت مقفّٰی عبارت آرائی ہے جو اس دور کے لکھنوی اسلوب کی نمایاں خصوصیت تھی۔ سراپا نگاری اور منظر نگاری یوسف خان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ 1861ء میں انتقال کر گئے۔

تصنیف: تاریخ یوسفی المعروف عجائبات فرنگ۔

نمونہ کلام: "تیسرے دن شہر کی سیر کو گیا جو کچھ دیکھا دل ہی جانتا ہے، زبان پر نہیں آتا۔ کنارے دریا کے جا کر دیکھا، سیکڑوں جہاز وہاں تھے اور ہزاروں ناؤ رواں۔ جہاز دھویں (دھوئیں) کے ادھر ادھر آتے جاتے۔ اس پر سے صاحبانِ انگریزی اپنی بی بیوں کے ساتھ دریا کا تماشا دیکھتے۔" (عجائبات فرنگ)

تحریر: سمیعہ بی بی

سلامت علی دبیر
1803ء تا 1874ء
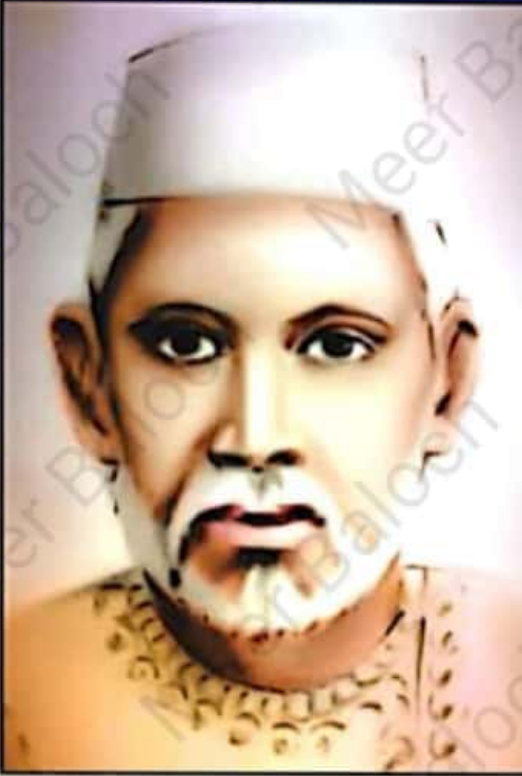
مرزا سلامت علی دبیر 29 اگست 1803ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا غلام حسین تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے بس گئے۔ مرزا دبیر فطری قابلیت رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شائق تھے۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے تھے اور بچپن ہی سے مرثیہ گوئی کے دل دادہ تھے اس لیے میر ضمیر کی شاگردی اختیار کی۔ دبیر اُردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے پوری سنجیدگی اور فنکارانہ ذمہ داری سے مرثیے اور صرف مرثیے کے لیے اپنے تخلیقی جوہر کو وقف کیے رکھا۔ دبیر اپنے تخلیقی صلاحیتوں سے واقعات کربلا کو نئے سرے سے زندہ ہی نہیں کرتے بل کہ رنج و غم کی کیفیت کو نئی تازگی دیتے ہیں۔ میر انیس کی سادگی، سلاست، روانی، داخلیت، اثر انگیزی اور جذبات نگاری کے مقابلے میں دبیر کی شاعری کی خصوصیات اس کی بلند پروازی، شان و شکوہ، مفاخر ہیں۔ انیس اور دبیر دونوں شریف اور باوقار حریف تھے انیس کی وفات پر دبیر نے قطعہ تاریخ کی صورت میں انھیں شان دار خراج تحسین پیش کیا۔ نواب غازی الدین حیدر نے ان کو طلب کر کے اپنے خاص محل میں ان کے مراثی سنے اور محل کی متعدد بیگمات اور شہزادیاں دبیر کی شاگرد ہو گئیں جن میں نواب ملکہ زمانیہ اور سلطانہ عالیہ وغیرہ شامل ہیں۔ مرزا دبیر کی وجہ شہرت ان کی مرثیہ نگاری ہے۔ مرثیے کو کلاسیکی آن بان اور ترقی دینے کا کام دبیر نے انجام دیا۔ نوجوانی کے عالم میں ہی مرزا دبیر اپنی ذہانت اور تیز فہمی سے اپنے ہم مشقوں پر سبقت لے گئے اور ان کا شمار اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا۔ سرور نے "فسانہ عجائب" میں اس وقت کے مشہور مرثیہ گویوں میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ 6 مارچ 1874ء کو لکھنؤ میں اس دنیا فانی سے رخصت ہوئے اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

تصانیف: مرثیہ مرزا دبیر (سید تصدق حسین رضوی کا تصحیح شدہ)۔ مراثی دبیر (مرتب ڈاکٹر ظہر فتح پوری)۔ ابواب المصائب (واقعات کربلا نثر میں)۔ احسن القصص۔

نمونہ کلام:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رن ایک طرف، چرخِ کہن کانپ رہا ہے

شانے پہ جو چمکی تو بغل سے نکل آئی — جاں ڈر کے تنِ زشت عمل سے نکل آئی

تحریر: نور فاطمہ

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
1809ء تا 1869ء

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ 27 دسمبر 1809ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ اُردو میں "شیفتہ" اور فارسی میں "حسرتی" تخلص کرتے تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ عام رئیسوں کی طرح ان کی زندگی کا ابتدائی دور لغزشوں سے پاک نہ تھا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئے اور "شوقِ صنم" اور "خواہشِ صہبا" سے توبہ کر لی۔ میاں جی مالا مال جو دہلی کے مشہور بزرگ اور اعلا پایہ کے معلم تھے، ان سے فارسی اور عربی پڑھی اور علوم مروجہ حاصل کیے۔ حضرت مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقش بندی سے حدیث و قرات کا علم حاصل کیا۔ علوم دین سے ایسا شوق و شغف تھا کہ طلب کی تشنگی کسی وقت کم نہ ہوتی تھی۔ شیفتہ جب عشق مجازی میں ناکامی سے دل برداشتہ ہوئے تو ان کی والدہ اور نانی کو اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ سفر حج کی سعادت حاصل کریں۔ شیفتہ 1839ء میں حج پر گئے اور اس کے بعد بڑی پاک و صاف زندگی گزاری۔ اُنھوں نے دو شادیاں کیں۔ شیفتہ فارسی شاعری میں غالب سے اصلاح لیتے تھے اور اُردو میں مومن سے مشورہ لیتے تھے۔ شیفتہ اُردو اور فارسی کے ایک صاحب دیوان اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کی توجہ خارجیت سے زیادہ داخلیت پر تھی، وہ الفاظ سے زیادہ شعر کی معنویت پر زور دیتے تھے۔ وہ اپنے دور کے سخن فہم تھے، اُنھوں نے اپنے دور کے رواج سے ہٹ کر تنقیدی انداز اختیار کیا اور ان کی تنقیدی آرا نے آنے والے نقادوں کو راہ دکھائی۔ شیفتہ کا تذکرہ "گلشن بے خار" فارسی کے صف اول کے تذکروں میں شمار ہوتا ہے اور اس میں تنقیدی آرا بھی ملتی ہیں۔ شیفتہ نے زیادہ تر فارسی نثر لکھی۔ اُن کے طرز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں زبان و بیان پر کمال حاصل تھا۔ اُن کی تحریروں میں حقیقت نگاری، زبان و بیان کی صفائی اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے 11 جولائی 1869ء کو دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف: کلیاتِ شیفتہ و حسرتی۔ انشائے فارسی۔ گلشن بے خار۔ رد آورد۔ غالب پر تعریفی تنقید۔ مسی مالی۔

نمونہ کلام:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت — دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

تحریر: عالیہ سعید

پنڈت دیا شنکر نسیم
1811ء تا 1845ء

پنڈت دیا شنکر نسیم کا اصل نام "دیا شنکر کول" تھا۔ ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نسلاً کشمیری ہندو تھے۔ ان کی پیدائش لکھنؤ میں 1811ء میں ہوئی۔ نسیم نے بچپن ہی میں اردو اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ شاہی فوج کے وکیل بھی رہے۔ شعر و شاعری کا شوق شروع سے تھا کیوں کہ لکھنؤ کی ہوا ہی کچھ ایسی تھی۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش سے اصلاح لی۔ آتش کی طرح دیا شنکر نسیم نے مرصع سازی کی ہے۔ بہت ہی کم عمری کے اندر انہوں نے نام پیدا کر لیا تھا۔ نسیم کو ان کی مثنوی "گلزار نسیم" سے شہرت ملی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مثنوی عزت اللہ بنگالی کے نثری قصے "مذہب عشق" سے ماخوذ ہے۔ یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ نسیم نے ریحان الدین ریحان کے نسخہ "خیابان ریحان" سے استفادہ کیا ہے جو ہو بہو اس مثنوی جیسا نظر آتا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کو دیا شنکر نسیم نے اپنے اُستاد آتش کو دکھایا تو اُنھوں نے اسے اور مختصر کرنے کو کہا۔ مثنوی گلزار نسیم اپنی زبان، تحریر، بیان، منظر کشی اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے بے مثال ہے۔ اس میں لکھنؤ کی تہذیب جھلکتی ہے۔ "گلزار نسیم" نے دیا شنکر نسیم کو شہرت کے آسمان تک پہنچا دیا۔ یہ مثنوی اس قدر دل فریب ہے کہ اس کا چرچا لکھنؤ کے گھر گھر میں ہونے لگا اور لوگوں نے اسے میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے مد مقابل قرار دے دیا۔ پنڈت دیا شنکر کو باقی تصانیف سے شہرت نہ ملی پر مثنوی گلزار نسیم سے ملنے والی شہرت نے اس کی تلافی کر دی۔ مثنوی کا قصہ بڑا مشہور ہوا جسے پڑھ کر لوگ اَش اَش کرتے ہیں۔ واقعے کو مختصر اور خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مثنوی نے اُردو ادب میں شان دار اضافہ کیا اور دبستان لکھنؤ کی زبردست نمائندگی اور عکاسی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "گلزار نسیم" ایک اعلا پائے کی تصنیف ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم ہیضے کی وجہ سے 1845ء میں وفات پا گئے۔

تصانیف: دیوان نسیم۔ مثنوی "گلزار نسیم"۔ یادگار نسیم۔ گل بکاؤلی۔

نمونہ کلام:

منہ کھول کے سانپ اک نکالا	اس کالے نے من زمین پر ڈالا
جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا	کالے نے من، اژدہے نے کالا

تحریر: ملازم علی

سر سید احمد خاں
1817ء تا 1898ء

سر سید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد خان سے حاصل کی۔ آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا اور آگرہ کمشنر آفس میں نائب منشی کے فرائض سنبھالے۔ دہلی میں صدر امین مقرر ہونے سے پہلے فتح پور میں سرکاری خدمات سرانجام دیں۔ دہلی میں اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" لکھی۔ 1857ء میں آپ کا تبادلہ بجنور میں ہو گیا جہاں آپ نے "سرکشی بجنور" لکھی۔ 1888ء میں آپ کو سر کا خطاب دیا گیا۔ 1889ء میں انگلستان کی ایڈنبرا یونی ورسٹی نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ آپ نے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ علی گڑھ سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا۔ انگلستان سے واپسی پر 1870ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ مضامین سر سید نے مسلمانان ہند کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ سر سید کا کارنامہ علی گڑھ تحریک ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ علی گڑھ کالج کی ترقی اور ملکی مفاد کے لیے وقف کر دیا۔ سر سید نے تعلیمی، معاشی، مذہبی، سیاسی اور اَدبی طور پر مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اُنھوں نے اُردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ سر سید نے مضمون کو اولین اہمیت دی اور تکلف اور تصنع، جو پرانی نثر کا امتیاز خاص تھا، اُسے ترک کر دیا۔ سر سید نے 27 مارچ 1898ء کو وفات پائی۔

تصانیف: جام جم۔ تسہیل فی جرالثقیل۔ آثار الصنادید۔ سلسلۃ الملوک۔ اسباب بغاوت ہند۔ تاریخ فیروز شاہی۔ تبیین الکلام۔ تحقیق لفظ نصاریٰ۔ لائل محمڈنز آف انڈیا۔ سفر نامہ لندن۔ خطبات احمدیہ۔ مقالات سر سید۔ تہذیب الاخلاق۔ مضامین سر سید۔

نمونہ کلام: "تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی۔ ہاتھ اٹھایا، جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔ اس میں کوشش کی جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"۔

تحریر: نوشین عزیز

واجد علی شاہ اختر
1823ء تا 1887ء

واجد علی شاہ اختر نے 30 جولائی 1823ء کو اودھ کے شاہی خاندان میں آنکھ کھولی۔ پورا نام ابو المنصور سکندر شاہ پادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ اختر تھا۔ وہ نہایت ہی عیاش اور رقص و موسیقی میں دل چسپی رکھنے والے نواب تھے۔ اُن کی طبیعت میں رنگینی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کیوں کہ لکھنؤ کی تہذیب کا اثر ان کی طبیعت میں گھر کر چکا تھا۔ وہ لکھنؤ کے آخری بادشاہ تھے۔ ان کے والد امجد علی شاہ کے دور تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی فوجی اور سیاسی حیثیت سے اودھ کے معاملات میں اتنا حاوی ہو چکی تھی کہ اب وہ صرف بہانے کی تلاش میں دن رات ایک کر رہی تھی کہ اس حکومت کو کس طرح قبضے میں لیا جائے۔

واجد علی شاہ کی تخت نشینی یعنی 1847ء کے فوراً بعد اس کے خلاف بدنظمی، ہیجان، انتشار اور اور اس کی نااہلی اور عیاشی کے الزامات لگا دیے گئے جس کے تحت واجد علی شاہ کو معزول کر کے 1857ء میں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ صرف اُردو کے شاعر ہی نہ تھے بل کہ رقص و سرود پر بھی اُنھیں انفرادیت کا مقام حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گانے، بجانے، ڈرامے، شاعری، راگ اور راگنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کتھک رقص کو زندہ کر دکھایا۔ اس کے علاوہ رہس، جوگیا، جشن اور اس قسم کی کئی چیزوں میں روح بھی پھونکی تھی۔ اُنھیں استاد باسط خان، پیارے خان اور نصیر خان نے یہ رموز سکھائے تھے۔ ان تمام چیزوں کی تربیت کے واسطے لکھنؤ میں اُنھوں نے ایک عالی شان قیصر باغ بارہ دری بنوائی جو آج تک قایم ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے خود کئی راگ اور راگنیوں کی ایجاد کی تھی اور تمام رموز پر الگ الگ کتابچے بھی لکھے تھے۔ اُن کی جلا وطنی کے ہی دور میں 21 ستمبر 1887ء کو کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

تصانیف: بحر الفت۔ دریائے تعشق۔ حزن اختر۔ ارشاد خاقانی۔ کلیات واجد علی شاہ۔ محل خانہ شاہی۔ مثنوی درحالات گنا طوائف۔ پری خانہ۔

نمونہ کلام:

دینے لگی کوئی پینگ مغرور — ساون گانے لگی ہر اک حور
اوس وقت عجیب اک مزا تھا — ساون کیا رنگ دے رہا تھا

تحریر: ابدال رضا

امیر مینائی
1828ء تا 1900ء
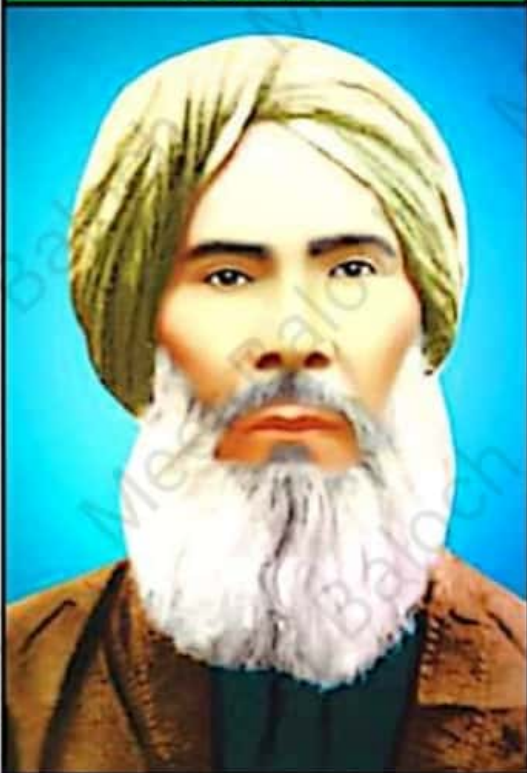
امیر مینائی 22 فروری 1828ء کو نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا سلسلہ نسب حضرت عباس بن عبد المطلب سے ملتا ہے۔ ابتدا میں مولوی مظفر علی سے درسی کتابیں اور قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی، اپنے والد سے بھی پڑھا، ان کے انتقال کے بعد بڑے بھائی مفتی مولوی طالب حسین مینائی سے عربی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے بھائی نے محبت اور شفقت سے آپ کی پرورش کی۔ امیر مینائی نے اپنے دور کے نام ور اساتذہ سے فارسی، عربی، فلسفہ، منطق، فقہ اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں امیرؔ لکھنوی کے شاگرد تھے اور چودہ سال کی عمر میں باقاعدگی سے لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اُنھوں نے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی اور درس نظامی کا نصاب پورا کیا۔ وہ علم نجوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی اور مثنوی "کبوتر نامہ" پیش کی۔ محسن کاکوروی کی محبت سے فیض پا کر نعت گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انگریزوں کے حملے کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو ان کا گھر اور محلہ شدید گولہ باری کی وجہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد نواب یوسف علی خان کی دعوت پر وہ رام پور روانہ ہوئے، مفتی عدالت دیوانی کے عہدے پر مقرر کیا۔ وہاں ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا۔ بہت سے شعرا امیر سے اصلاح لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُردو اور فارسی لغات کو اپنے ذوق کے مطابق ترتیب دیا جو تمام غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ اُن کے بغیر اُردو شاعری، مکتوب نگاری، تذکرہ نگاری اور لغت نویسی کی تاریخ ادھوری قرار پاتی ہے۔ نواب یوسف علی خان کی وفات کے بعد حیدرآباد دکن واپس آ گئے اور 13 اکتوبر 1900ء میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: غیرت بہارستان۔ مراۃ الغیب۔ صنم خانہ عشق۔ لیلۃ القدر۔ شام ابد۔ صبح ازل۔ نور تجلی۔ ابر کرم۔ بہار ہند۔ امیر اللغات۔ خیابانِ آفرینش۔ دیوان گوہر۔ تاج سخن۔ دبدبہ امیری۔ ارشاد السلطان۔

نمونہ کلام:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
اے برق تو ذرا بھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

تحریر: کشف مادور

محمد حسین آزاد
1830ء تا 1910ء

محمد حسین آزاد 10 جون 1830ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا جنھوں نے 1837ء میں دہلی سے پہلا اخبار ''اُردو اخبار'' نکالا۔ 1854ء میں محمد حسین آزاد بھی اس میں ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ آزاد ایک شاعر، صحافی و ادیب تھے۔ آزاد کو شمس العلما کا خطاب بھی ملا۔ 1864ء میں آزاد لاہور گئے اور گورنمنٹ کالج میں ملازم رہے۔ 1865ء میں آزاد کابل گئے اور سفر میں ان کو فارسی سیکھنے کا موقعہ ملا۔ 1873ء میں کرنل ہالرائیڈ نے انجمن پنجاب قایم کی اور نظم کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی آزاد نے ان مشاعروں میں اخلاقی اور نیچرل نظمیں لکھیں۔ آزاد کو نثر میں بھی کمال ملا۔ آپ کے اسلوب کو اُردو ادب میں ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ آزاد کی زیادہ شہرت ''آب حیات'' اور ''نیرنگ خیال'' سے ہوئی۔ ذوق کی صحبت سے آزاد کے دل میں جذبہ شاعری پیدا ہوا اور انھوں نے ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ 1857ء کے زمانے نے ان مجمعوں کو منتشر کر دیا اور لوگ زندگی کے مسائل سے تنگ آ کر معاش زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ اُن ہی لوگوں میں آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال پنڈت، مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی بھی تھے۔ آزاد کو فارسی اور اُردو پر عبور حاصل تھا۔ آزاد کا اہم کارنامہ انشا پردازی ہے۔ وہ عملی نقاد بھی تھے اور عملی تنقید کے دوران بھی آزاد نے شعر و سخن کی ماہیت شاعری کے منصب اور اس کے عروج و زوال کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آزاد نے ''سخن دان فارس'' اور ''آب حیات'' میں خاص طور پر شاعری اور انشا پردازی کی بحثیں اٹھائی ہیں۔ آزاد کے نزدیک نظم ایک صنعت ہے اس میں جو چیز ہے بیان کو کچھ اور ہی بنا دیتی ہے۔ اُنھوں نے 22 جنوری 1910ء کو وفات پائی۔

تصانیف: آب حیات۔ نیرنگ خیال۔ سخن دان فارس۔ دربار اکبری۔ نگارستان۔ قصص الہند۔ نظم کلام موزوں۔

نمونہ کلام:

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو عالم میں شاہزادی مشکیں نسب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

تحریر: تسمیہ شبیر

ڈپٹی نذیر احمد
1830ء تا 1912ء
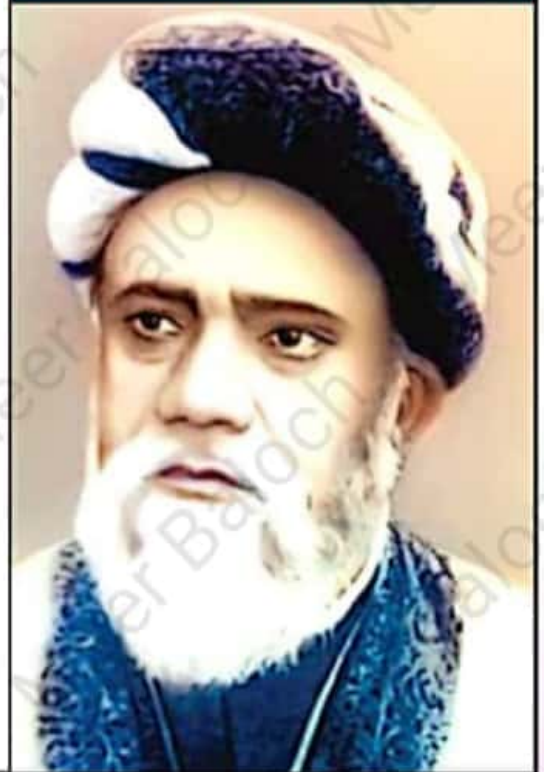
ڈپٹی نذیر احمد 8 دسمبر 1830ء کو ریہر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ان کی عمر چار برس تھی کہ ان کے والد بجنور آ گئے اور یہیں سے اُنھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کا آغاز کیا۔ وہ نہایت مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تحریک علی گڑھ اور انجمن حمایت اسلام سے وابستہ رہے۔ علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی 1888ء میں ہوئی۔ وہ اس تحریک سے وابستہ دوسرے لوگوں کی طرح انگریزوں سے مفاہمت اور مسلمانوں کی ترقی چاہتے تھے چناں چہ اُنھوں نے اس تحریک کو فروغ دینے کے لیے اَدبی معاملات کے علاوہ کافی رقم دی اور اپنے لیکچروں اور تقریروں سے اس تحریک کو کافی رقم دلوائی جو علی گڑھ تحریک کو مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ اُن کی وجہ شہرت ان کے اصلاحی ناول ہیں جو اُنھوں نے اپنے بچوں کی اصلاح و تربیت کے لیے لکھے تھے جن میں سب سے زیادہ شہرت ان کے ناول ''مراۃ العروس'' کو ملی جو اُنھوں نے اپنی بیٹیوں کے لیے لکھا کیوں کہ اس وقت نذیر احمد کی نظر میں کوئی ایسا کلام یا کہانی موجود نہیں تھی جو بچوں کی اصلاح کا باعث ہو۔ یہ ان کا پہلا ناول تھا جس پر حکومت نے اُنھیں ''شمس العلما'' کا خطاب دیا۔ نذیر احمد اُردو اَدب کے اہم نثر نگاروں میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے اُردو ناول کا آغاز کیا اور ایک منفرد طرزِ تحریر اپنایا جس کی وجہ سے وہ برصغیر میں پہچانے جانے لگے۔ اُنھوں نے زیادہ اصلاحی ناول لکھے لیکن بعض دیگر موضوعات پر بھی ناول لکھے۔ اُنھوں نے اپنی محنت اور قابلیت سے اُردو اَدب اور معاشرے میں اہم مقام حاصل کیا۔ اُن کی وفات 3 مئی 1912ء کو دہلی میں ہوئی۔

تصانیف: مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ فسانہ مبتلا۔ ابن الوقت۔ رویائے صادقہ۔ قرآن مجید کی تفسیر۔ الحقوق الفرائض۔ امہات الامہ۔ محصنات۔ قانون انکم ٹیکس۔ افسانہ غدر۔ نصاب خسرو۔ قانون شہادت۔ مساوی الحکمۃ۔ تعزیرات ہند۔ ایامی۔ مواعظ حسنہ۔ سموات۔

نمونہ کلام: ''جاں نثار: ہاتھ کی پانچ انگلیاں تو کیوں کر برابر ہو سکتی ہیں۔ اچھے برے سبھی جگہ ہیں مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ انگریزوں میں اکثر اچھے اور ہم میں اکثر برے ہیں۔'' (ابن الوقت)

تحریر: طاہرہ تصور

داغ دہلوی
1831ء تا 1905ء

داغ دہلوی 25 مئی 1831ء کو محلہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی نام ابراہیم رکھا گیا مگر اُنھوں نے اپنا نام بدل کر مرزا خان رکھ لیا۔ چھ برس کی عمر میں ان کے والد کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ ان کی والدہ نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے فخرو سے نکاح کر لیا تھا۔ اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت لال قلعے میں ہوئی۔ داغ نے مولوی سید احمد حسین سے فارسی اور اُردو سید امیر پنجہ کش دہلوی سے فن خوش نویسی میں مہارت حاصل کی۔ قلعہ معلٰی کے اَدبی ماحول اور بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی نے داغ کو شعر و شاعری کی طرف مائل کیا۔ داغ شاعری میں ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے لیے غالب سے بھی اصلاح لی۔ داغ کو شاعری سیکھنے کا ذوق فطری تھا۔ داغ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ داغ نے اپنے کلام میں اس دور کے حالات کو سمو دیا ہے۔ 1857ء میں غدر کے بعد رام پور پہنچے جہاں نواب کلب علی خان نے اپنی مصاحبت میں رکھا۔ 1888ء کو آصف جاہ کی فرمائش پر داغ حیدرآباد دکن تشریف لائے۔ داغ کو نظام دکن کی استادی کا بھی شرف حاصل ہے۔ دکن میں آپ نے ملک الشعرا کا مقام پایا۔ داغ کو دبیر الدولہ، فصیح الملک، نواب ناظم جنگ بہادر کے خطاب ملے۔ اقبال نے بھی ابتدا میں داغ سے شاعری میں اصلاح لی۔ داغ نے اپنی شاعری میں عاشقانہ زندگی کی بہترین مرقع کشی کی ہے، ان کے اشعار میں ترنم، دلکشی اور سوز و گداز بدرجہ اُتم موجود ہے۔ اقبال، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی اور احسن مارہروی جیسے معروف شاعروں کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے 17 مارچ 1905ء کو فالج کی وجہ سے حیدرآباد میں وفات پائی۔

تصانیف: گلزارِ داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ۔ یادگارِ داغ۔ مثنوی موسوم بہ فریاد داغ۔

نمونہ کلام:

فصلِ گل میں کیوں ہے بلبل نغمہ سنج — آپ اپنے منہ مبارک باد کیا

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ — ہندستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

تحریر: عائشہ رشید

مہدی حسین مجروح
1833ء تا 1903ء

میر مہدی حسین مجروح 1833ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میر حسن نگار دہلوی ہے۔ آپ مرزا غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔ مجروح بہت ہی اچھے شاعر تھے جب آپ دہلی سے پانی پت چلے گئے تو غالب کو اس کا بہت دکھ ہوا۔ غالب نے مجروح کے نام کئی خطوط لکھے۔ اس میں رنج و غم کا اظہار کیا۔ 1857ء کا ہنگامہ ہونے کے بعد مجروح پھر دہلی واپس آئے مگر کچھ عرصے بعد چلے گئے۔ آخر میں رام پور کے نواب نے آپ کی سرپرستی کی۔ آپ کا مجموعہ کلام 1899ء میں شائع ہوا۔ اُنھوں نے غزل میں استاد کی پیروی نہیں کی جب کہ نثر میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش ضرور کی۔ مجروح کی زبان نہایت صاف اور سادہ تھی۔ مجروح کا مجموعہ کلام مرزا غالب ہی کوششوں سے شائع ہوا۔ غالب کو آپ کے ساتھ بہت محبت تھی اُردوِ معلٰی میں بیسیوں خط آپ کے نام ہیں۔ میر مہدی حسین مجروح نے مرزا غالب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا وہ بڑی پائے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ دو نثری رسالے بھی لکھے جن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت و شخصیت کے بیان میں ''انوار اعجاز'' اور دوسرا آئمہ کرام کے بیان میں ''ہدیۂ آئمہ'' شامل ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اب کم یاب لیکن یہ ان کے کلیات نثر میں موجود ہیں۔ مجروح نے کئی سال جے پور میں فراغت میں گزارے۔ 1880ء میں راجہ کے انتقال کے بعد اُنھیں طویل بے کاری کا سامنا رہا۔ 1896ء میں نواب حامد علی خان نے چالیس روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ مجروح کا کلام ولی دکنی کی طرح صاف ستھری اور نکھری ہوئی تحریر ہے۔ چھوٹی بحروں میں لکھی گئی غزلیں بہت دل آویز ہیں۔ مجروح کمال کلاسیکی شاعر ہیں جنھوں نے الفاظ کو سادگی مگر ندرت سے استعمال کیا ہے۔ اُن کی وفات 15 مئی 1903ء کو دہلی میں ہوئی۔

تصنیف: مظہر معانی معروف بہ دیوان مجروح۔

نمونہ کلام:

چرا کے مٹھی میں دل کو چھپائے بیٹھے ہیں — بہانہ یہ ہے کہ مہندی لگائے بیٹھے ہیں

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا — سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا

تحریر: محمد وقاص رفیق

منشی نول کشور
1836ء تا 1895ء

منشی نول کشور 3 جنوری 1836ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز مکتب میں فارسی اور اُردو پڑھ کر کیا تھا۔ منشی نول کشور ایک پبلشر تھے۔ انھیں ہندستان کا کیکسٹن کہا جاتا ہے کیوں کہ 1858ء میں 22 سال کی عمر میں اُنھوں نے نول کشور پریس اور کتاب ڈپو قایم کیا تھا۔ لاہور سے ''کوہ نور'' نکلتا تھا جس میں ان کے مضامین چھپا کرتے تھے جن کی شہرت سے اُنھیں لاہور کے ایک اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی گئی جو اُنھوں نے قبول کر لی۔ نول کشور پریس لکھنؤ، یہ ادارہ ایشیا میں سب سے پرانا اشاعتی مرکز ہے۔ مرزا غالب، منشی نول کشور کے وفادار دوست تھے۔ منشی نول کشور نے ہندو ہونے کے باوجود کئی اسلامی کتابیں قرآن مجید کی تفاسیر، احادیث کے مجموعے اور فقہ کی کئی کتابیں شایع کیں۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے 1858ء سے 1950ء تک اور دو کے کلاسیکی متون سمیت 6000 سے زاید کتابیں شایع ہوئیں۔ منشی نول کشور ایک ناشر اور مدیر تھے۔ آپ نے چند مذہبی رسالے اور اور بچوں کے قاعدے چھاپے اور ان کو خود ہی بیچنا شروع کیا۔ 26 نومبر 1858ء میں اُنھوں نے ''اودھ اخبار'' کا اجرا کیا جو بڑے چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ داستان امیر حمزہ کی اشاعت اس کے پریس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جو 46 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے دنیا کی سب سے بڑی داستان کہا جاتا ہے۔ منشی نول اپنے کندھوں پر طبع شدہ مواد کا گٹھڑ اٹھا کر بازار اور دفاتر تک لے جاتے تھے پھر اُنھیں دفتری سٹیشنری کے ٹھیکے ملنے لگے اور ان کی مالی حالت بہتر ہوگئی۔ نول کشور پریس کی کتابوں میں فتاوٰی عالمگیری، سنن ابی داؤد، سنن ابی ماجہ، مثنوی مولانا روم، قصائد عرفی، تاریخ طبری، تاریخ فرشتہ، دیوان امیر خسرو، مراثی انیس، دیوان غالب، الف لیلہ اور آرائش محفل قابل ذکر ہیں۔ وہ 19 فروری 1895ء کو دلی میں وفات پاگئے۔

تصنیف: تواریخ نادرالعصر۔

نمونہ کلام: ''ہم سب آپ سے بدل راضی وممنون وشاکر ہین۔ ہم لوگون کو آپ کی مفارقت سے بوجہ تشریف بری ولایت کے بتقریب رخصت کے جو کچھ رنج وملال ہے، زبان قلم تحریر مین او سکے لال ہے''

تحریر: سجاد احمد

مولانا الطاف حسین حالی
1837ء تا 1914ء
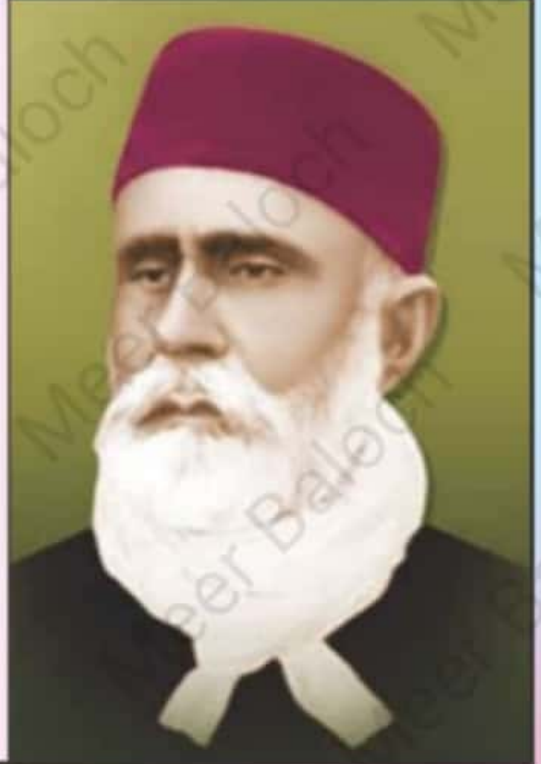
مولانا الطاف حسین حالی 21 ستمبر 1837ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ نو سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تو بڑے بھائی امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ حالی نے قرآن پاک حفظ کیا پھر عربی تعلیم شروع کر دی۔ دو سال تک عربی صرف ونحو اور منطق پڑھتے رہے۔ یہ ہندستانی تمدن اور معاشرت کے زوال کا دور تھا اور سیکڑوں سال سے قایم شاندار مغلیہ سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ سیاسی انتشار کی وجہ سے افراتفری کا عالم تھا۔ حالی 1856ء میں نواب مصطفٰی خان شیفتہ کے بچوں کے استاد مقرر ہوئے۔ نواب صاحب کی صحبت کی وجہ سے حالی کی شاعری چمک اُٹھی۔ اس کے بعد حالی دہلی آکر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے باقاعدہ شاگرد ہوئے اور جدید اُردو غزل کی بنیاد رکھی۔ غالب کی وفات کے بعد حالی نے لاہور میں پنجاب بک ڈپو کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں حالی نے انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اُردو میں جدید نظم نگاری کا آغاز کیا۔ وہ کچھ عرصہ لاہور میں خدمات سرانجام دینے کے بعد واپس دہلی چلے گئے اور اینگلو عربک کالج میں اُستاد مقرر ہوئے۔ حالی، سرسید سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے تعلیمی مشن میں شامل ہو گئے۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد پانی پت میں رہائش اختیار کر لی۔ حالی کو 1904ء میں ''شمس العلما'' کا خطاب ملا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت کو اُردو ادب میں بیک وقت بطور شاعر، نثر نگار اور نقاد بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کی وفات 31 دسمبر 1914ء کو پانی پت میں ہوئی۔

تصانیف: مسدس حالی۔ رباعیات حالی۔ حکیم ناصر خسرو۔ حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید۔ تذکرہ رحمانیہ۔ مقدمہ شعر وشاعری۔ تریاق مسموم۔ طبقات الارض۔ حب وطن۔ مولود شریف۔ رسالہ خیر المواعظ۔ شواہد الہام۔ مجالس النسا۔ مضامین حالی۔ مقالات حالی۔ مکاتیب حالی۔ دیوان حالی۔ مجموعہ نظم حالی۔ انتخاب کلام داغ۔

نمونہ کلام:

غم دل نے رسوا کیا ہم کو آخر — بنائی بہت شادمانی کی صورت
ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی — یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

تحریر: طیبہ طارق

محمد اسمٰعیل میرٹھی
1844ء تا 1917ء
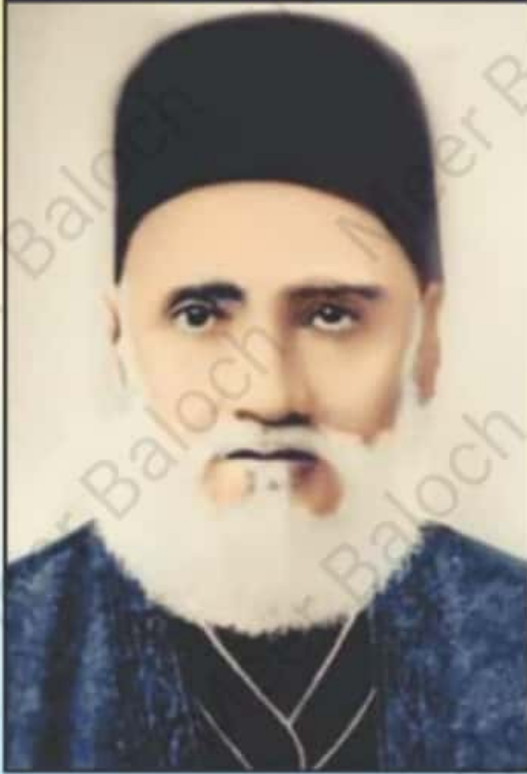
محمد اسمٰعیل میرٹھی 12 نومبر 1844ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ گھر پر ہی عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسمٰعیل میرٹھی نے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی جہاں ان کی ملاقات قلق میرٹھی سے ہوئی۔ قلق میرٹھی نے انگریزی کی پندرہ اخلاقی نظموں کا منظوم ترجمہ "جواہر منظوم" کے نام سے کیا تھا جس نے اسمٰعیل میرٹھی کو بہت متاثر کیا۔ اسمٰعیل میرٹھی نا صرف سر سید احمد خان کے ہم عصر تھے بل کہ اُنھوں نے اسی ذہن و فکر سے قوم اور سماج کے لیے تعلیمی خدمات کو انجام دیا؛ خصوصاً تعلیم نسواں کے لیے کوشاں رہے۔ سر سید تحریک سے متاثر ہو کر اُنھوں نے کئی ادارے قایم کیے۔ وہ قوم اور ملک کی ترقی کے لیے تعلیم کو اور سماجی قدروں کے لیے تربیت کو اہمیت دیتے تھے۔ اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کے لیے بچوں کے لیے اُردو قاعدہ بھی مرتب کیا۔ اُنھوں نے قواعد و زبان پر بھی کام کیا۔ اس وقت بچوں کی تدریسی ضرورتوں کا ادارک کرتے ہوئے اُنھوں نے باقاعدہ بچوں کے اَدب کی طرف توجہ دی۔ اُنھوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک اور مڈل جماعتوں کے طلبا کے لیے اُردو کی درسی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ کہنے کو تو ان کی شاعری کے مخاطب کم سن بچے ہیں۔ لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی زمانے کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں۔ ان کی شاعری کے اجزا میں سلاست اور سادگی سب سے زیادہ جاذب نظر ہے، دوسرے ان کی شاعری کے موضوع ہیں جس سے ان کے کلام میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ نظموں کی فضا دیکھی ہے اور اسلوب بالکل موضوع کے مطابق ہے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی وجہ شہرت ان کی نظمیں ہیں جو اُنھوں نے بچوں میں اخلاقیات کی تربیت کے لیے ان کی نفسیات کے مطابق لکھی ہیں۔ بچوں کی اصلاح کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ وہ یکم نومبر 1917ء کو انتقال کر گئے۔

تصانیف: کلیات اسمٰعیل میرٹھی۔ پرائمری اور مڈل جماعتوں کے لیے مرتب درسی کتب۔

نمونہ کلام: "نہیں کام سے شام تک تجھ کو فرصت / ذرا سی تو جان اور اس پر یہ محنت / بہت جھیلتی ہے مشقت مصیبت / نہیں ہارتی پر کبھی اپنی ہمت / اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے"

تحریر: عطیہ مرتضیٰ

اکبر الٰہ آبادی
1845ء تا 1921ء
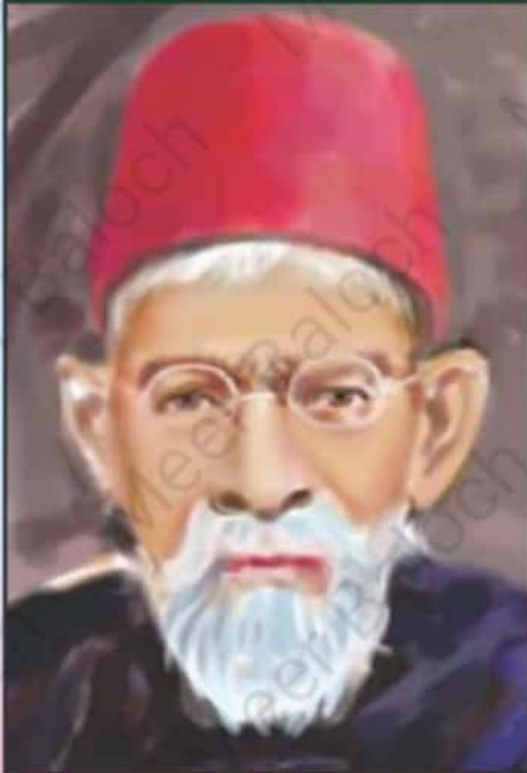
سید اکبر حسین رضوی قصبہ "بارا" الٰہ آباد میں 16 نومبر 1845ء کو پیدا ہوئے۔ اکبر کے والد علم ریاضی کے ماہر تھے۔ اکبر کو اُنھوں نے زبانی حساب سکھایا۔ اکبر نے بچپن میں ہی "الف لیلہ" اور "قصہ حاتم طائی" وغیرہ پڑھیں۔ 1873ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب رہے پھر سات برس تک الٰہ آباد، گونڈہ، گورکھ پور اور آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔ اکبر 26 نومبر 1880ء کو مرزا پور میں تین ماہ کے لیے قایم مقام منصف مقرر ہوئے پھر ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا جہاں وہ 1888ء تک رہے۔ یہاں ان کی ملاقاتیں سر سید اور دوسرے عمائدین سے ہوتی رہتی تھیں۔ اُنھوں نے نئی تعلیم کے اس مرکز کو قریب سے دیکھا اس کی خوبیوں اور خامیوں کے عینی شاہد تھے۔ اکبر ترقیاں پاتے رہے مگر ان کی ذاتی زندگی بڑی ناہموار اور ناآسودہ سی رہی۔ اکبر نے شعری زندگی کا آغاز گیارہ برس کی عمر میں کیا۔ ابتدا میں اکبر الٰہ آبادی نے خواجہ حیدر آتش سے اصلاح لی پھر اپنا الگ رنگ پیدا کیا۔ اکبر کا لقب "لسان العصر" تھا۔ عام خیال ہے کہ وہ جدید تعلیم کے خلاف تھے مگر یہ درست نہیں ہے۔ وہ سر سید کے طریق کار سے اختلاف رکھتے تھے اور مسلمانوں کو انگریزی تہذیب سے بچانا چاہتے تھے۔ اکبر نے بذلہ سنجی اور ظرافت و مزاح سے وہ کام لیا جو شاید کسی سنجیدہ شاعری سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی سر سید مخالف تحریک کے اس زاویے سے وابستہ تھے جو بالخصوص منشی سجاد حسین کی زیر ادارت نکلنے والے رسالے "اودھ پنچ" کے ذریعے سامنے آیا۔ آپ کی بیشتر تخلیقات اسی رسالے میں شایع ہوئیں۔ اُن کے خطوط کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں اور بعض ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ اُنھوں نے دو انگریزی کتابیں بھی اُردو میں منتقل کیں۔ اکبر کے مضامین "اودھ پنچ" میں چھپتے رہے۔ اکبر نے قومی شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ جدید انگریزی تعلیم کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اُنھوں نے 9 ستمبر 1921ء کو وفات پائی۔

تصانیف: گاندھی نامہ۔ کلیات اکبر۔ مضامین اکبر۔ خطوط اکبر۔

نمونہ کلام:

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے　　دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

بابو ہمیں نگل گئے اس عہد میں تو خیر　　رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

تحریر: عائشہ ساجد

پنڈت رتن ناتھ سرشار
1846ء تا 1903ء

رتن ناتھ سرشار 1846ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سرشار ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے۔ آپ کے والد کا نام پنڈت بیج ناتھ تھا۔ آپ کی عمر صرف چار برس تھی کہ آپ کے والد کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ جس مکان میں سرشار اپنے لڑکپن کے ایام کھیل کود میں بسر کر رہے تھے اس کے پڑوس میں اہل اسلام کے مکانات تھے آپ نے بیگمات کی زبان اور طرز معاشرت سے بہت کچھ آگہی حاصل کی جو آئندہ چل کر آپ کی شہرت کا باعث بنی۔ آپ نے ابتداً عربی وفارسی تعلیم سے کی۔ اس کے بعد کالج میں داخل ہوئے لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ حصول معاش کے لیے کھیری کے ضلع سکول میں مدرس ہو گئے۔ ''مراسلہ کشمیر'' رسالے میں اصلاحی مضامین لکھے، ''اودھ پنچ'' میں بھی اپنا رنگ جمایا۔ آپ کے ابتدائی مضامین میں رجب علی بیگ سرور کا رنگ نمایاں تھا لیکن شوخی اور دل چسپی کچھ اُن سے زیادہ تھی۔ سرشار کا شمار اُردو زبان کے نمایندہ نثر نگاروں میں ہوتا ہے یوں تو اُنھوں نے ''جام سرشار''، ''سیر کہسار''، ''جدائی فوجدار'' وغیرہ جیسے کئی ناول لکھے لیکن ان کی شاہ کار تصنیف ''فسانہ آزاد'' ہے جس نے اُنھیں شہرت وعظمت دی۔ 1878ء میں ایک عملی طبعی کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور شمس الضحٰی اس کا نام رکھا یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اس نے آپ کی شہرت کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ منشی نول کشور ''اودھ اخبار'' نکالا کرتے تھے اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آپ کا مایہ ناز کارنامہ ''فسانہ آزاد'' اسی اخبار میں بالاقساط نکلا کرتا تھا۔ اُنھوں نے 21 جنوری 1903ء کو وفات پائی۔

تصانیف: فسانہ آزاد۔ جام سرشار۔ سیر کوہسار۔ کامنی۔ خدائی فوجدار۔ بچھڑی دلہن۔ رنگ بہار۔ طوفان بے تمیزی۔ شمس الضحٰی۔

نمونہ کلام: ''کبھی چشم مست کی یاد میں نرگس شہلا سے آنکھ لڑائی، سرو کو دیکھا تو اپنے سر بلند اقبال کا بوٹا سا قد آنکھوں میں پھر گیا۔ شمشاد نظروں سے گر گیا۔ گل رعنا کی دید سے گل رخسار کا خیال بندھا۔ بلبل شیدا کا نالہ زار تیر کی طرح جگر کے پار ہوا۔ الغرض اضطراب و بے قراری، نالہ شیون و آہ زاری دن دونی رات چوگنی ترقی پائی تھی''۔

تحریر: عطیہ محمد علی

سید احمد دہلوی
1846ء تا 1918ء
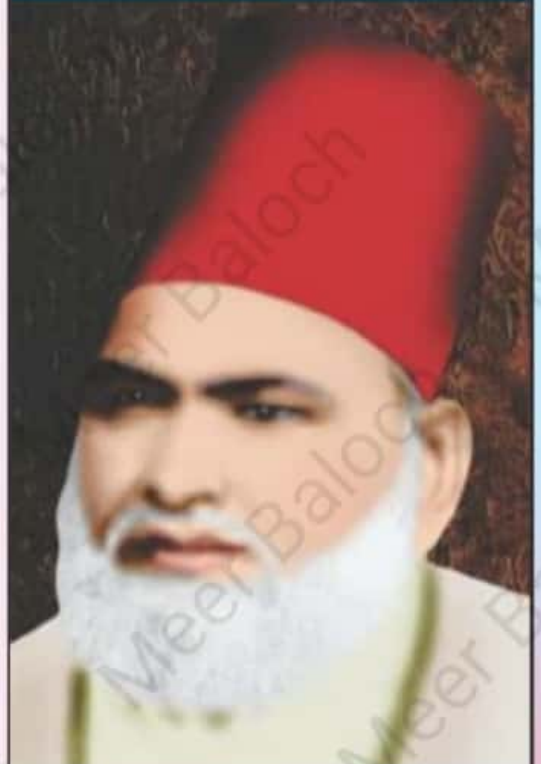
سید احمد دہلوی نے 1846ء میں دہلی میں آنکھ کھولی۔ اُنھیں نوجوانی میں انگریز مستشرق ڈاکٹر فیلن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جو انگریزی اُردو ادب کی لغت مرتب کر رہے تھے۔ اس وجہ سے اُن کے دماغ میں بھی جدید لغت نگاری کے اُصولوں کے تحت اپنی لغت مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اُنھوں نے 1878ء میں ''ارمغان دہلی'' کے نام سے رسالے کی شکل میں لغت طبع کرنے کا آغاز کیا۔ پھر نظام دکن کی سرپرستی میں اُنھوں نے اس لغت کو ان ہی کے لقب آصف کی نسبت سے ''فرہنگ آصفیہ'' کا نام دیا۔ اُنھوں نے اس لغت میں نہایت تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں جو ان کی قابلیت کا بین ثبوت ہے۔ یہ لغت انیسویں صدی کی گنگا جمنی تہذیب کا مرقع ہے جس میں اس دور کے رسم و رواج، زیورات، ملبوسات، ادبی، علمی و شعری اصطلاحات، نشست و برخاست اور خوراک و مشروبات وغیرہ سے متعلق الفاظ کا وسیع ذخیرہ ملتا ہے۔ سید احمد دہلوی کو بعض الفاظ شامل نہ کرنے اور بعض شامل کرنے پر بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا لیکن اُنھوں نے اس تنقید کی پروا نہ کی۔ ''فرہنگ آصفیہ'' کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ یہ لغت اُردو کا اہم لسانی، علمی، ثقافتی اور سماجی سرمایہ ہے جس کی پہلی دو جلدیں 1888ء، تیسری 1898ء اور چوتھی اور آخری جلد 1902ء میں شایع ہوئی۔ آج بھی ''فرہنگ آصفیہ'' سند کا درجہ رکھتی ہے۔ سید احمد دہلی کے آخری آدمی تھے جنھوں نے بڑے کاموں کو انفرادی طور پر انجام دینے کی مشرقی روایت کو زندہ کیے رکھا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا دو تہائی حصہ اسی لغت میں صرف کیا۔ اُن کا انتقال 1918ء میں بہ مقام دہلی ہوا۔

تصانیف: فرہنگ آصفیہ۔ رسوم دہلی۔ ہادی النسا۔ علم اللسان۔ انشاہادی النسا۔ کنز الفوائد۔ لغات النسا۔ محاکمہ مرکز اُردو۔ مناظرہ تقدیر و تدبیر۔

نمونہ کلام: ''مصیبت یا بے اختیاری کی حالت میں جب حیوان یا انسان کے منھ سے کوئی بات نکلے گی تو وہ ضرور اس کی اصلی فطرت کے موافق ہوگی۔ طوطا ہزار حق اللہ پاک ذات اللہ کہے، رام رام سیتا رام جپے مگر جس وقت بلی آن دبائے گی تو ٹیں کے سوا کچھ اس کی زبان سے نہیں نکلے گا۔'' (علم اللسان)

تحریر: ابدال رضا

میر باقر علی داستان گو
1850ء تا 1928ء
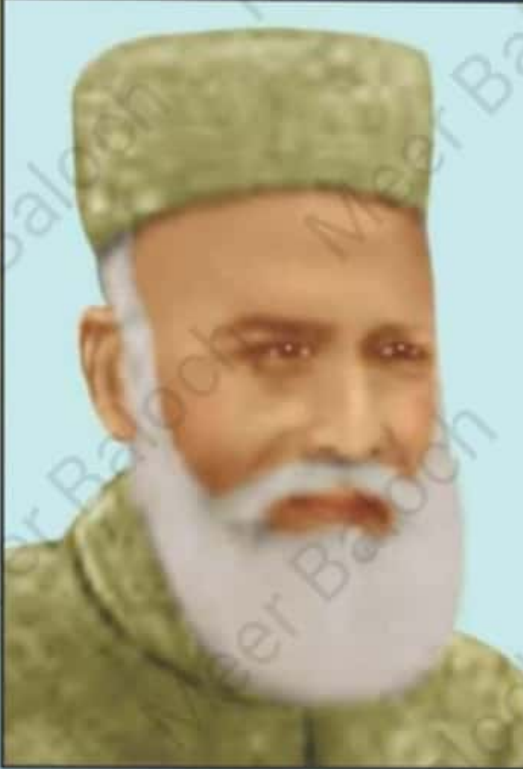
میر باقر علی داستان گو1850ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔اُن کے بزرگ ایران سے ہندستان آئے۔آپ نے داستان گوئی کا فن اپنے ماموں میر کاظم علی سے سیکھا تھا جو نظام حیدر آباد کے ہاں داستان گو مقرر تھے۔اہل علم اور بڑے بڑے راجہ نواب اُنھیں خود یاد فرمایا کرتے تھے۔دلی کے پہاڑی علاقہ میں آخری دم تک داستان گوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔ہفتے کی رات کو سننے والے دور دور سے آتے۔دو آنے طاق میں رکھ کر، ایک کونے میں باادب جا بیٹھتے اور رات کے پچھلے پہر تک سانس روکے ان کی جادو بیانی سے لطف اندوز ہوتے۔وہ بڑے خوددار اور غیور انسان تھے۔اُنھوں نے بڑے بڑے رؤسا اور نوابین کے درباروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔انعام واکرام پائے لیکن کسی کی مصاحبت قبول نہ کی۔تحریری شکل میں ان کی کل سترہ داستانیں بہ طور یادگار موجود ہیں۔دلی میں کہیں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے۔آپ نے پھر اپنے گھر پر داستان کہنی شروع کردی اور ایک آنہ ٹکٹ لگادی۔داستان کیا کہتے تھے چلتی پھرتی تصویریں پیش کرتے تھے۔بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا،موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔آواز کے زیروبم اور لب ولہجہ سے بھی اثر بڑھ جاتے۔ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سو ڈیڑھ سو نام ایک ہی سانس میں کہہ دیا کرتے تھے یعنی اُنھیں نام طوطے کی طرح رٹے ہوئے تھے۔ان سے اگر کوئی کچھ پوچھتا تو وہ چڑتے نہ تھے بل کہ خوش ہوتے اور اس بات کو تفصیل سے بتاتے تھے۔وہ 1928ء کو دہلی میں وفات پاگئے۔

تصانیف: خلیل خاں فاختہ۔بہادر شاہ کا مولا بخش ہاتھی۔گاڑھے خان کا دکھڑا۔باتوں کی باتیں کام کی باتیں۔کانا باتی۔فقیر کی جھولی۔اہل محلّہ اور نا اہل پڑوس۔استانی۔آداب واخلاق۔کون؟۔آ قا ونوکر۔طلسم ہوش افزا۔چوری اور سینہ زوری۔خاتمہ داستان۔

نمونہ کلام: ”خلیل خاں نے کریمن سے کہا کہ بی کریمن خدا کی شان ہے کہ تم ہمارے پڑوس میں رہو اور تم کو ہمارا اتنا خیال بھی نہیں۔“(خلیل خاں فاختہ)

تحریر: محمد آصف بلال

ریاض خیر آبادی
1853ء تا 1934ء

ریاض خیر آبادی کا اصل نام سید ریاض احمد خیر آبادی اور تخلص ریاضؔ تھا۔آپ1853ء میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ریاض نے فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ابتدائی عمر سے ہی اُنھیں شاعری کا شوق تھا ریاض نے پہلے مظفر علی میر کی شاگردی اختیار کی اور بعد میں امیر مینائی سے اصلاح لی۔1872ء میں مطبع درخشاں نامی ایک مطبع خیر آباد میں قایم کیا۔1877ء میں خیر آباد سے ”ریاض الاخبار“ جاری کیا۔کچھ عرصے بعد لکھنؤ چلے گئے اور روز نامہ ”تار برقی“ نکالا۔1879ء میں خیر آباد ہی سے شعر وسخن کا ماہنامہ ”گل کدہ ریاض“ جاری کیا جس کا مقصد شعرا کی بہترین اشعار کی اشاعت تھی۔لکھنؤ میں اُنھیں نواب کلب علی خان نے طلب کیا لیکن تھوڑے عرصے بعد وہاں رہ کر واپس آگئے۔پندرہ سال تک وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھ پور کے پیش کار رہے۔1883ء میں گورکھ پور سے ”فتنہ“ اور ”عطر فتنہ“ جاری کیا۔ریاض پانچ وقت نماز پڑھتے تھے اور روزے تیسوں رکھا کرتے تھے اور مکمل پاکباز اور مذہبی آدمی تھے لیکن ان کی شاعری خمریات سے معمور ہے بل کہ اُنھیں اُردو میں خمریہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ریاض کی شاعری میں دختِ رز، مے کدہ، مے خانہ، ساقی، سبو، خم وساغر، میکش اور رندی جیسے تلازمے ایسے سما گئے ہیں کہ ان کا کلام مستی و سرشاری کی بولتی، جھومتی اور گنگناتی ہوئی تصویر بن کر سامنے آتا ہے اور سننے والا اس کے سحر میں گرفتار ہونے سے خود کو نہیں بچا سکتا۔اُنھوں نے اپنے مضامین میں اس طرح خمریات کا سماں باندھا ہے کہ قاری اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہوسکتا۔وہ جام و مینا کی ایسی دل کش تصویر کھینچتے ہیں کہ رندوں کی نگاہیں وہاں تک پہلے کبھی نہیں پہنچ پائی تھیں لیکن یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ وہ خود کبھی شراب نہ پیتے تھے۔اُن کا انتقال 30 جولائی 1934ء کو خیر آباد میں ہوا۔

تصانیف: فتنہ۔عطر فتنہ۔کلام ریاض خیر آبادی۔ریاض رضواں۔

نمونہ کلام:

دل جلوں سے دل لگی اچھی نہیں ۔۔۔ رونے والوں سے ہنسی اچھی نہیں
منہ بناتا ہے برا کیوں وقت وعظ ۔۔۔ آج واعظ تو نے کی اچھی نہیں

تحریر: قائم رضا

شبلی نعمانی
1857ء تا 1914ء
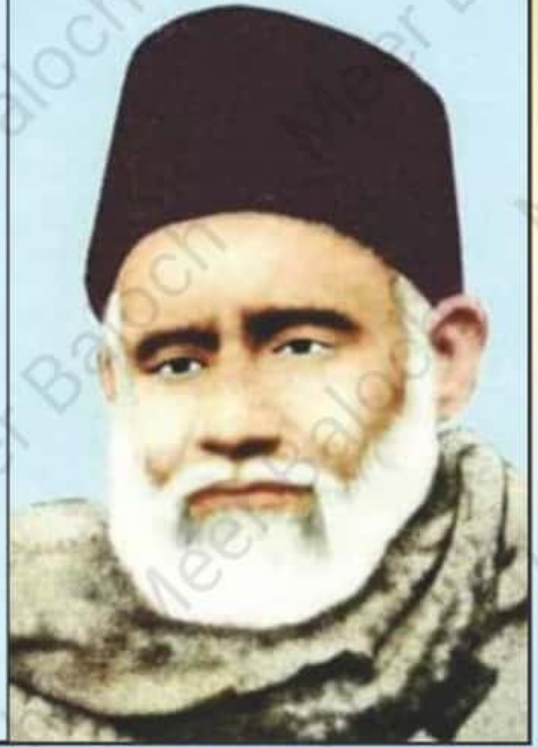
مولانا شبلی نعمانی 4 جون 1857ء میں اعظم گڑھ کے گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں والد سے حاصل کی۔ آپ مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا ارشاد حسین، مولانا احمد علی سہارن پوری اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے شاگرد رہے۔ 27 سال کی عمر میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے وہاں سر سید، حالی، آرنلڈ جیسی شخصیات کی صحبت میسر آئی۔ آرنلڈ سے آپ نے فرانسیسی سیکھی۔ آپ نے مصر، شام اور روم کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ آپ نے علی گڑھ میں سوانح عمریاں لکھنا شروع کی تھیں۔ سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ کی ملازمت چھوڑ دی اور لکھنؤ میں "ندوۃ العلما" کا ادارہ قایم کیا۔ ترک سلطان عبدالحمید نے آپ کی اَدبی خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کو "تمغہ مجیدیہ" اور انگریزی حکومت نے "شمس العلما" کے خطاب سے نوازا۔ شبلی راست باز، شیریں گفتار، ملنسار، انسان دوست، ایک اچھے معلم اور اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت ایک شاعر، نثر نگار، معلم، مورخ، دینی عالم، نقاد اور ادیب تھے۔ 1907ء میں اچانک گولی لگنے کی وجہ سے آپ کی ٹانگ زخمی ہو گئی اور آخر کار اسے کاٹنا پڑا۔ شبلی نعمانی کا بڑا کمال "شعر العجم" ہے جس سے شبلی کے شعری اَدبی ذوق اور تنقیدی بصیرت کا ادراک ہوتا ہے۔ شبلی نعمانی کی شہرت کی وجہ ان کی تصنیف "سیرت النبی" ہے۔ "سیرت النبی" ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے اُنھیں اُردو اَدب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ "سیرت النبی" کی دو جلدیں مکمل ہو پائی تھیں کہ آپ 18 نومبر 1914ء کو وفات پا گئے اور اس کے بعد باقی کام آپ کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔

تصانیف: الفاروق۔ سوانح مولانا روم۔ المامون۔ الغزالی۔ علم الکلام۔ سیرت النعمان۔ موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم۔ مقالات شبلی۔ سیرت النبی۔ دیوان شبلی۔ مثنوی صبح امید۔ سفر نامہ مصر، شام، روم۔

نمونہ کلام: "اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام اپنے لیے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب پینتالیس کروڑ قلوب کا مرکز ہے۔ دوسرا یہ کہ دشمنان اسلام اب مخالفت کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں۔" (سیرت النبی جلد اول)

تحریر: صالحہ اقبال

مرزا محمد ہادی رسوا
1857ء تا 1931ء

اُردو فکشن کے مایہ ناز ادیب مصنف اور شاعر مرزا محمد ہادی رسوا 1857ء میں بہ مقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چچا کے پاس پرورش پائی مگر جلد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ نے تعلیم ترک نہ کی۔ ساز و سامان بیچ کر گزر بسر کرتے رہے۔ سب اوورسیر کا امتحان پاس کیا۔ لکھنؤ سے پرائیویٹ طور پر 1883ء میں فاضل فارسی اور 1884ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے 1891ء میں ایف۔ اے اور 1894ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ عربی، اُردو، فارسی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ آپ فلسفے کے علاوہ کیمیا، ہیئت، ریاضی، نجوم موسیقی اور مذہبی امور میں بھی دسترس حاصل کی۔ ان موضوعات کے حوالے سے ان کے اکثر مضامین غیر ملکی رسائل میں بھی چھپتے تھے، خاص طور پر امریکہ کے رسالے "افلاطونی" میں شایع ہوئے اور بے حد مقبول ہوئے۔ اُردو زبان کی "شارٹ ہینڈ" کی اصطلاحات بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اور اُردو ٹائپ "کی بورڈ" بھی ان کی کوشش کا مرہون منت ہے۔ مولانا کرامت علی کی تصنیف "علم الاخلاق" مرتب کرنے پر امریکہ کی طرف سے پی ایچ ڈی اور "ڈاکٹر آف اورینٹل سٹڈیز" کی ڈگریاں ملیں۔ مرزا ہادی رسوا کی وجہ شہرت ان کا مشہور و معروف ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ مرزا کو علم موسیقی سے خاص لگاؤ تھا، اُنھوں نے تقریباً تین راگ، راگنیوں اور گیتوں کی علامات بھی لکھیں۔ آپ کا انتقال 21 اکتوبر 1931ء میں ہوا۔

تصانیف: اُردو شارٹ ہینڈ مینول۔ افشائے راز۔ امراؤ جان ادا۔ ذات شریف۔ شریف زادہ۔ اختری بیگم۔ خونی شہزادہ۔ خونی بھید۔ خونی عاشق۔ خونی جورو۔ خونی مصور۔ بہرام کی رہائی۔ مثنوی لذت فنا۔ جنون انتظار۔ مثنوی مرقع لیلیٰ مجنوں۔ مثنوی امید و بیم۔ مثنوی نالہ رسوا۔ مثنوی مذمت عشق۔ مثنوی نو بہار۔ طلسم اسرار۔ نگارستان۔

نمونہ کلام: "مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا، یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی اور یہ وہ مکان تھا جہاں ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملتا تھا، ملا؛ یعنی خانم جان کا مکان" (امراؤ جان ادا)

تحریر: مقدس یوسف

عبدالحلیم شرر
1860ء تا 1926ء

عبدالحلیم شرر 4 ستمبر 1860ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حکیم تفضل حسین، واجد علی شاہ کے دربار سے متعلق تھے۔ اپنے باقی خاندان کے ساتھ شرر نو سال کی عمر میں کلکتہ چلے گئے اور وہاں والد اور دیگر اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں انگریزی بھی پڑھی لیکن اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بعدازاں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ 1879ء میں ماموں زاد سے شادی کے ایک سال بعد دہلی چلے گئے جہاں سے حدیث کی تعلیم میں سند لی اور نجی طور پر انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ 1880ء میں لکھنؤ واپس آنے پر منشی نول کشور نے شرر کو "اودھ پنچ" کے ادارتی عملے میں شامل کر لیا۔ پھر شرر نے "محشر" نامی ہفت روزہ رسالہ جاری کیا جو بے انتہا مقبول ہوا۔ 1887ء میں اپنا رسالہ "دل گداز" جاری کیا جو 1926ء تک چھپتا رہا۔ 1890ء میں شرر نے اسلامی شخصیات کے بارے میں "مہذب" نامی رسالہ جاری کیا۔ شرر کی شہرت اور اَدبی اہمیت کا مدار اُن کے حسن بن صباح کی مصنوعی جنت اور فرقہ باطنیہ کے بارے میں شہرہ آفاق ناول "فردوس بریں" پر ہے جو 1899ء میں شائع ہوا۔ شرر نے یکم دسمبر 1926ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: فلپانا۔ آخری دور۔ غیب دان دلہن۔ زوال بغداد۔ تاریخ عصر قدیم۔ رومتہ الکبریٰ۔ حسن کا ڈاکو۔ اسرار دربار رام پور۔ خوفناک محبت۔ الفانسو۔ فاتح و مفتوح۔ بابک خرمی۔ جویائے حق۔ سوانح قرۃ العین۔ تاریخ عزیز مصر۔ تاریخ مسیح و مسیحیت۔ تاریخ عرب قبل اسلام۔ لعبت چین۔ تاریخ ارض مقدس۔ سوانح خاتم المرسلین۔ صقلیہ میں اسلامی تاریخ۔ عزیز مصر۔ اسیر بابل۔ طاہرہ۔ مینا بازار۔ شہید وفا۔ میوہ تلخ اور نیکی کا پھل۔ ملک العزیز ورجینا۔ منصور موہنا۔ ایام عرب۔ فلورا فلورنڈا۔ فتح اندلس۔ فردوس بریں۔ حسن بن صباح۔

نمونہ کلام: "گول آفتابی چہرہ، جیسا کہ عموماً پہاڑی لوگوں کا ہوتا ہے، ستے ہوئے اور کھنچے ہوئے سرخی کی جھلک دینے والے گال، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، لمبی نوکدار پلکیں، بلند پیشانی مگر کسی قدر پھیلی ہوئی، نازک نازک اور خم دار ہونٹ، باریک اور ذرا پھیلی ہوئی باچھیں" (فردوس بریں)

تحریر: محمد ثقلین

راشد الخیری
1868ء تا 1936ء

علامہ راشد الخیری 1868ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالواجد ریلوے میں ملازم تھے۔ مورث اعلا مولانا ابوالخیر اللہ کی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ "خیری" لگاتے تھے۔ شروع میں تعلیم اپنے گھر میں ہی حاصل کی اور بعد میں عربی سکول میں داخل ہوئے۔ کچھ زمانے تک الطاف حسین حالی سے بھی پڑھتے رہے۔ آپ نو برس کے تھے جب آپ کے والد کا انتقال ہوا۔ 1891ء میں محکمہ بندوبست میں بہ طور کلرک بھرتی ہوئے۔ وہ جہالت کا زمانہ تھا اور طبقہ نسواں کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی جس کی وجہ سے اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی تحریروں سے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کریں گے، اسی ضمن میں اُنھوں نے تین رسالے "بنات"، "عصمت" اور "جوہر نسواں" جاری کیے۔ اُن کی کتابیں زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ قبول عام کی سند بھی حاصل کر چکی ہیں۔ آپ نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ راشد الخیری کو مصورِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کے ہاں اپنے معاشرے کے پستے ہوئے کرداروں کی عکاسی بھی ملتی ہے اور عالمی سطح پر مسلمانوں کی زبوں حالی اور بے حسی کی دہائی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ اُن کے ہاں مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے اُردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کو افسانہ نگار، مدیر اور ناول نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اُن کا انتقال 3 فروری 1936ء کو دہلی میں ہوا۔

تصانیف: سمرنا کا چاند۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ شب زندگی۔ نوحہ زندگی۔ ماہ عجم۔ شاہین و دراج۔ نانی عشو۔ جوہر عصمت۔ محبوب خداوند۔ آمنہ کا لال۔ عروس کربلا۔ الزہرا۔ سراب مغرب۔ بنت الوقت۔ حیات صالحہ۔ سیدہ کا لال۔ عصمت۔ سہیلی۔ بنات۔ جوہر نسواں۔ چہار عالم۔ چمنستان مغرب۔ دلی کی آخری بہار۔ فریب ہستی۔ فسانہ سعید۔ گوہر مقصود۔ گلدستہ عید۔ خدائی راج۔ مچھیرن کا جھولا۔ منظر طرابلس۔ مسلی ہوئی پتیاں۔ نشیب و فراز۔ قلب حزیں۔ قطرات اشک۔ روداد قفس۔ ساجن مونی۔ ستونتی۔ سوتن کا جلاپا۔ شادی کا انتخاب۔

نمونہ کلام: "اسلام نے اپنے وقت میں ایسے ایسے جید اور قابل علما پیدا کیے ہیں جن کی خدمات آج بھی چاند کی طرح چمک رہی ہیں اور ہمیشہ چمکیں گی۔"

تحریر: محمد ناصر

وحید الدین سلیم
1869ء تا 1927ء
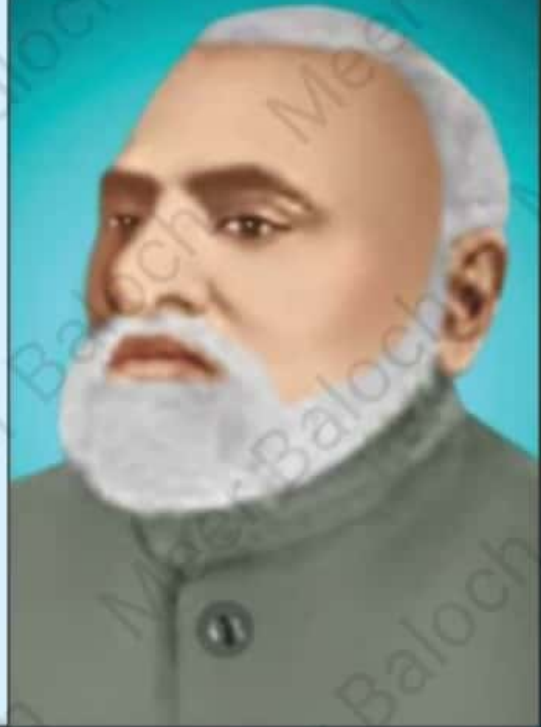
وحید الدین سلیم 1869ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے مڈل کا امتحان امتیازی نمبر لے کر پاس کیا اور ان کا ماہانہ چار روپے وظیفہ مقرر ہوا۔ اورینٹل کالج لاہور سے مشرقی لسانیات میں منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ اُنھوں نے جنرل عظیم الدین خاں کی سرپرستی میں ملازمت اختیار کی پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہیڈ مولوی بن گئے لیکن بیماری کی وجہ سے اُنھیں اپنے آبائی قصبے پانی پت میں واپس آنا پڑا۔ مولانا الطاف حسین حالی آپ کے علم اور مشرقی زبانوں پر عبور سے متاثر تھے۔ وہ اُنھیں علی گڑھ میں سرسید احمد خان کے پاس لے گئے اور اُنھیں کچھ اُدبی کام دینے کو کہا۔ ان کے کام سے متاثر ہو کر سرسید احمد خان نے اپنا اُدبی معاون رکھ لیا۔ سرسید کی وفات کے بعد اُنھوں نے اُدبی رسالہ ''معارف'' کا آغاز کیا پھر حالی پریس کے نام سے کتابیں شایع اور فروخت کرنا شروع کر دیں۔ 1907ء میں محسن الملک کے کہنے پر علی گڑھ کے اشاعتی سٹاف میں شامل ہو گئے۔ لمبا عرصہ کام کرنے کے بعد واپس پانی پت چلے گئے پھر آپ ''مسلم گزٹ لکھنؤ'' کے ایڈیٹر بنے۔ وہ ''زمیندار'' لاہور کے بھی ایڈیٹر بھی رہے۔ مضمون نگاری اور ترجمہ نویسی کی بہ دولت اُنھیں ریاست حیدر آباد بلا لیا گیا جہاں اُنھوں نے اپنی مشہور کتاب ''وضع اصطلاحات'' لکھی۔ ترجمہ نگاری میں اُنھوں نے بے مثال نمونے چھوڑے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ دکن کے حکمرانوں نے اُنھیں ''دارالترجمہ'' میں شامل کیا اور وہ جلد ہی عثمانیہ یونی ورسٹی میں پروفیسر بن گئے۔ 1927ء میں ملیح آباد میں آپ کی وفات ہوئی۔

تصانیف: افکار سلیم۔ افادات سلیم۔ وضع اصطلاحات۔ مضامین حالی۔ اُردو دیو مالا۔ عربوں کی شاعری۔ تلسی داس کی شاعری۔ مرغیوں کا علم۔

نمونہ کلام: کس قدر تند بھری ہے میرے پیمانے میں   کہ چھڑک دوں تو لگے آگ ابھی میخانے میں

''اُردو زبان میں رباعیات بہت سے شعرا نے لکھی ہیں مگر رباعی گو کی حیثیت سے کوئی شاعر مشہور نہیں ہوا۔ انیس و دبیر کی رباعیوں کو البتہ تحت اللفظ خوانوں نے شہرت دی ہے۔'' (افادات سلیم)

تحریر: انوار میراں

مولوی عبدالحق
1870ء تا 1961ء
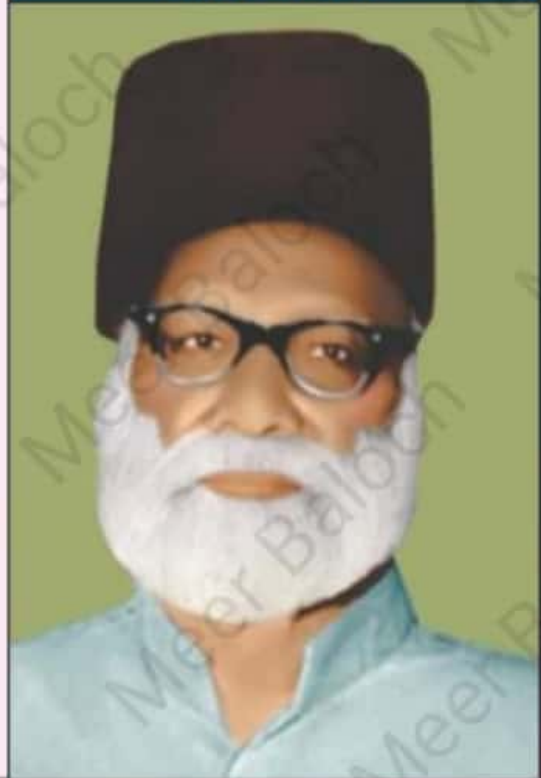
مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ علی گڑھ کالج سے بی اے کیا۔ سرسید احمد خان کی صحبت نے آپ کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ حیدر آباد میں ایک سکول میں ملازمت کی پھر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل ہو گئے اور 1930ء میں اسی عہدے سے سبک دوش ہو گئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں شعبہ اُردو کے پروفیسر بھی رہے۔ آپ کامیاب محقق، بے لاگ نقاد، بے مثل ادیب اور خاکہ نگار تھے۔ آپ کی تصنیف ''چند ہم عصر'' خاکہ نگاری کا نمایندہ شاہ کار ہے۔ آپ تنقید و تحقیق کے مرد میداں تھے اور ایک نام ور ادیب بھی۔ اُن کا انداز تحریر، طرز بیان، نہایت صاف، سادہ اور آسان ہے۔ اُن کا اُدبی اسلوب صاف، سادہ اور دل کش ہے۔ اُنھوں نے لغت تیار کی۔ مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کر دی۔ انجمن ترقی اُردو کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کی ترقی کے لیے تادم آخر کوشاں رہے۔ تقسیم ہند کے بعد اُنھوں نے اس انجمن کے اہتمام میں کراچی، پاکستان اُردو آرٹس کالج، اُردو سائنس کالج، اُردو کامرس کالج اور اُردو لا کالج جیسے ادارے قایم کیے۔ غرض ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا، آنا جانا، دوستی اور تعلقات سب کچھ انجمن کے لیے تھا۔ آپ کی ادارت میں ایک سہ ماہی اُدبی رسالہ ''اُردو'' جاری ہوا۔ انگریزی، اُردو لغت اور اُردو زبان کے حوالے کا بنیادی کام بھی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُنھیں ''بابائے اُردو'' کا خطاب دیا گیا۔ 16 اگست 1961ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: مرحوم دلی کالج۔ افکار حالی۔ مقدمات عبدالحق۔ خطبات عبدالحق۔ نکات الشعر۔ گلشن عشق۔ تذکرہ ہندی۔ ذکر میر۔ مخزن نکات۔ انتخاب کلام میر۔ دریائے لطافت۔ انتخاب داغ۔ چند ہم عصر۔ اُردو صرف و نحو۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ دیوان تاباں۔ عقد ثریا۔ چمنستان شعرا۔ قواعد اُردو۔ گل عجائب۔ لغت کبیر۔ خطبات گارساں دتاسی۔

نمونہ کلام: ''آپ صاحبوں کو معلوم ہو گا کہ اُنھوں نے ہندستان میں صرف میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اس کے بعد سرکاری وظیفے سے ولایت گئے جہاں اُنھوں نے کوئی اعلا امتحان نہیں دیا۔''

تحریر: ستارہ سحر

خوشی محمد ناظر
1871ء تا 1944ء

خوشی محمد ناظر کا اصل نام خوشی محمد اور ناظر تخلص تھا۔ ضلع گجرات کے ایک گاؤں ہریاوالا میں آپ کی پیدائش 1871ء میں ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ والد کا نام چوہدری مولاداد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، ثانوی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ میں داخل ہوئے فارسی زبان کی طرف رجحان اور دل چسپی بچپن سے ہی تھی۔ چناں چہ معمول کی تعلیم کے ساتھ اپنے گاؤں ہی میں فارسی کتب سے فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے 1893ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد ریاست جموں کشمیر میں ایک انتہائی اعلا اور معزز عہدے پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد چک جمرہ میں واقع اپنی اراضی کی دیکھ بھال کے لیے مستقل طور پر اقامت پذیر ہوئے۔ پانچ سال ریاست رام پور میں مختلف خدمات انجام دیں۔ ناظر کو فارسی اور اُردو پر مکمل عبور حاصل تھا اس وجہ سے ناظر کے بیان میں وہ برمحل اور اچھوتی دلکش اور رنگین ورعنا تشبیہات کا بڑی روانی، آمد اور سہولت سے استعمال نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ نظم "جوگی" ان کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے جس کا شمار اُردو کی کلاسیک شاعری میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے جو اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُن کا اسلوب بیان سادہ تھا اور کہیں کہیں وہ پیچیدہ الفاظ کا استعمال بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری جدید شاعری کا قابل قدر اور قابل ذکر نمونہ ہے۔ اُن کا تعلق رومانوی تحریک سے تھا اور ان کی شاعری قدرتی مناظر، انسانی جذبات، حب وطن، بین المذاہب ہم آہنگی اور لفظوں کی تازہ کاری سے لب ریز ہے۔ اُن کی یکم اکتوبر 1944ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں وفات ہوئی۔

تصانیف: نغمہ فردوس۔ یادوں کی مالا۔ الناظر۔ اقبال اور تحریک آزادی کشمیر۔

نمونہ کلام:

نگاہ لطف کبھی گروہ مست ناز کرے — نیاز مند کو عالم سے بے نیاز کرے
کوئی شمع اور کوئی پروانہ ہوگا — جہاں میں عشق کا افسانہ ہوگا

تحریر: اسرار احمد

ظفر علی خان
1873ء تا 1956ء

مولانا ظفر علی خان 19 جنوری 1873ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول وزیر آباد سے حاصل کی اور اعلا تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ وہ نواب محسن الملک کے معتمد کے طور پر ممبئی میں کام کرتے رہے، کچھ عرصہ مترجم کی حیثیت سے حیدر آباد دکن میں کام کیا اور اس کے علاوہ محکمہ داخلہ کے معتمد کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اخبار "دکن ریویو" جاری کیا اور متعدد کتابیں تصنیف کر کے اپنی حیثیت بہ طور ادیب وصحافی خاصی مستحکم کی۔ 1908ء میں لاہور آ کر روزنامہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور یوں مسلم صحافت کا کام شروع کیا۔ مولانا ظفر علی خان کی وجہ شہرت ان کی سیاسی سرگرمیاں اور صحافت بنی۔ اُنھیں اُردو صحافت کا امام کہا جاتا ہے۔ "زمیندار" اخبار اس دور کا سب سے خاص اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اُن کا اہم مقصد "زمیندار" میں کام کر کے مسلمانوں کو بے دار کرنا تھا۔ آپ کی زندگی کا بیش تر حصہ سیاست میں گزرا۔ اُنھیں شعر وسخن کا شوق بچپن سے تھا۔ نظموں میں سیاسی عنصر غالب ہے۔ ہنگامی نظمیں خوب کہتے تھے۔ آپ ایک اچھے نعت گو بھی تھے۔ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک پاکستان کے دنوں میں فرمایا تھا کہ "اگر ہمیں مولانا ظفر علی خان جیسے چار مجاہد مل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔" مولانا ظفر علی خان کا کلام مسلمانان برصغیر کی بے داری کے لیے تھا اور ان کی ایک ولولہ انگیز نظم ہر روز "زمیندار" کے صفحہ اول پر چھپتی تھی۔ اُنھوں نے زمیندار کے صفحات کو مسلمانان برصغیر کے مسائل کو اجاگر کرنے اور ان کی سیاسی آواز بلند کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سیاست ان کی دل چسپی کا میدان تھا اس لیے ان کے جوہر سیاسی نظموں میں خوب کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اُنھوں نے 27 نومبر 1956ء کو کرم آباد میں وفات پائی۔

تصانیف: نگارستان۔ چمنستان۔ بہارستان۔ غلبہ روم۔ معرکہ مذہب وسائنس۔ سیر ظلمت۔ جنگ روس وجاپان۔

نمونہ کلام:

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں — تو ہندستاں کا ہر پیر وجواں بے تاب ہو جائے
سردار دو جہاں کا بنا کر مجھے غلام — میرا بھی نام تابہ ابد زندہ کر دیا

تحریر: شہر بانو

حسرت موہانی
1875ء تا 1951ء
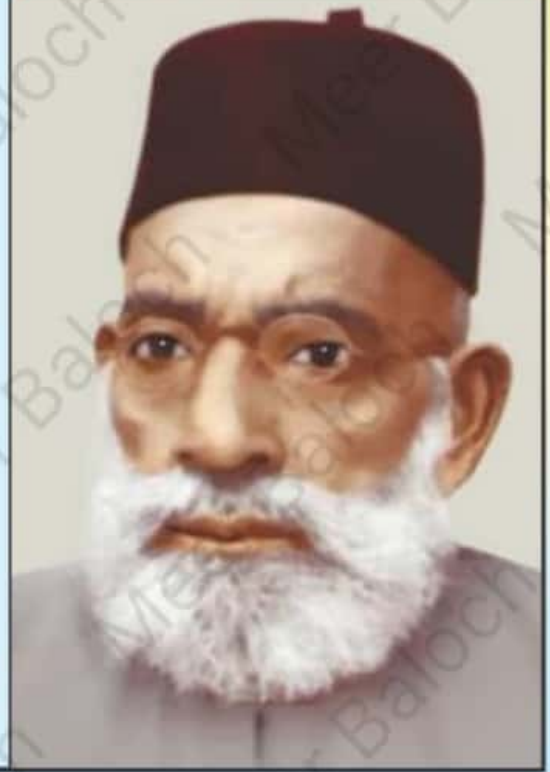
حسرت موہانی نے 14 اکتوبر 1875ء کو قصبہ موہان میں آنکھ کھولی۔ آپ کا اصل نام سید فضل الحسن تھا اور تخلص حسرت استعمال کرتے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بچپن سے ہی انھیں شاعری سے لگاؤ تھا اور اپنے کلام کی اصلاح تسلیم لکھنوی سے لیتے تھے۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور ماہ نامہ ''اردوئے معلّی'' نکالا۔ پرانے شاعروں کے دواوین کا انتخاب کرنا شروع کر دیا۔ حسرت موہانی کانگریسی تھے اور گورنمنٹ کانگریس کے خلاف تھی۔ حسرت نے 23 جون 1908ء سے 19 جون 1909ء تک حوالات کی چکی بھی پیسی۔ اس دوران اُن کا رسالہ بھی بند رہا۔ 1947ء تک وہ کئی بار جیل گئے اور رہا ہوئے اور یوں اک کتاب ''مشاہداتِ زنداں'' وجود میں آئی۔ آپ تحریک آزادی ہند سے وابستہ رہے اور ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ بھی دیا۔ وہ سودیشی تحریک کے دل دادہ تھے اور آخری وقت تک اُنھوں نے ولایتی چیزوں سے منہ موڑے رکھا۔ اُنھوں نے زندگی میں 13 حج ادا کیے اور اس کے علاوہ ایران، عراق اور مصر بھی گئے۔ حسرت موہانی نے شاعری، صحافت، تنقید نگاری اور تذکرہ نگاری میں نمایاں خدمات سرانجام دے کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی۔ کلاسیکی غزل ان کی پہچان کا منفرد زاویہ ہے۔ اُن کی شاعری میں محبت، عشق، فلسفہ، حسن، تغزل، نظمیت، نفسیات، تصورِ محبوب، معاملہ بندی اور سیاسی رنگ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع عشق اور فلسفہ ہے۔ اُردو کے قدیم شعرا کے کلام پر تنقیدی کتاب بھی لکھی جس میں کلام کے معائب و محاسن کو غیر جانب دارانہ لہجے سے پیش کیا گیا۔ چند قدیم شعرا کے دواوین کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع بھی کروایا جن میں دیوانِ ہوسؔ، دیوانِ قائمؔ، دیوانِ اشرفؔ اور دیوانِ مصحفیؔ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بہ یک وقت ایک شاعر، صحافی، محقق، نقاد، عالم اور سیاست دان تھے۔ اُنھیں ''رئیس المتغزلین'' کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے 13 مئی 1951ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: کلیاتِ حسرت۔ شرح دیوانِ غالبؔ۔ مشاہداتِ زنداں۔ نکاتِ سخن۔ اربابِ سخن۔ انتخابِ سخن۔

نمونہ کلام: چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

تحریر: ابدال رضا

علامہ محمد اقبال
1877ء تا 1938ء

علامہ محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ علامہ اقبال نے تین شادیاں کیں۔ علامہ اقبال نے سیالکوٹ میں مولوی میر حسن سے عربی سیکھی، 1893ء میں میٹرک اور 1899ء میں ایم اے فلسفہ کیا۔ انگلستان سے قانون اور جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جن شعرا نے اپنی شاعری کے بل بوتے پر اپنی قوم کو بدلنے کی کوشش کی ہے ان میں ایک بڑا نام اُردو اور فارسی شاعری میں علامہ اقبال کا بھی ہے۔ اُن کو حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مفکرِ پاکستان، مصورِ پاکستان جیسے خطابات دیے گئے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں میں بے داری اور شعور پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ اقبال نے قوم کو یہ پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر کے چھپے ہوئے انسان کو باہر نکالو اور اس سے استفادہ کرو، نہ کہ دوسروں کے سہارے جیو۔ اقبال کی ابتدائی وابستگی رومانوی تحریک سے تھی۔ اُردو شاعری پر اقبال کے اثرات بے پایاں ہیں۔ اقبال نے رومانیت کے جس زاویے کی ترویج کی ہے اس کے اثرات جدید اردو نظم کے تشکیلی دور میں نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اقبال نے نہ صرف فطرت کے موضوع کو اپنایا بل کہ اس کا رشتہ اپنے داخل سے بھی قایم کیا۔ اقبال کی وجہ شہرت ان کی قومی وملی شاعری ہے جو انقلاب کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اُنھوں نے نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کے اندر کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے جدید فلسفیانہ اندازِ بیان کے ذریعے اپنی شاعری سے ہندستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے اور اُنھیں آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اقبال کی شاعری خودی کا پیغام ہے۔ اُنھوں نے 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: علم الاقتصاد۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ بے خودی۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم۔ جاوید نامہ۔ ارمغانِ حجاز۔ بانگِ درا۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ مکاتیبِ اقبال۔ خطباتِ اقبال۔

نمونہ کلام: تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

تحریر: فیصل عباس

محمد علی جوہر
1878ء تا 1931ء

مولانا محمد علی جوہر 10 دسمبر 1878ء کو ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رام پور اور بریلی میں حاصل کی۔ اعلا تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ بی اے کے امتحان میں الہ آباد یونی ورسٹی میں اول آئے۔ رام پور میں ملازمت کی لیکن جلد ہی ملازمت سے دل بھر گیا اور کلکتہ جا کے انگریزی کا اخبار کامریڈ جاری کیا۔ مولانا کی لاجواب انشا پردازی اور ذہانت کی بہ دولت نہ صرف ہندستان بل کہ بیرون ہند بھی کامریڈ بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ انگریزی زبان پر عبور کے علاوہ مولانا کی اُردو دانی بھی مسلّم تھی۔ اُنھوں نے ایک اُردو روزنامہ ''ہمدرد'' بھی جاری کیا جو بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ اظہار خیال کا کامیاب نمونہ تھا۔ جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں مولانا کی زندگی کا کافی حصہ قید و بند میں بسر ہوا۔ تحریک عدم تعاون کی پاداش میں کئی سال جیل رہے۔ 1919ء تحریک خلافت کے بانی آپ تھے۔ اُنھیں اُردو شعر و ادب سے بھی دلی شغف تھا اور اُنھوں نے متعدد غزلیں اور نظمیں لکھیں جو مجاہدانہ رنگ سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ آپ نے 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ کام کی غرض سے انگلستان گئے۔ یہاں آپ نے آزادیٔ وطن کا مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم انگریز میرے ملک کو آزاد نہیں کرو گے تو میں واپس نہیں جاؤں گا اور تمھیں میری قبر یہیں بنانی ہوگی۔ اس بات کے کچھ عرصے کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کا لقب ''رئیس الاحرار'' ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی آپ کی ہی کوشش سے قایم ہوا۔ آپ نے 4 جنوری 1931ء کو لندن میں وفات پائی۔

تصانیف: عکس شعور ناشر۔ دیوان جوہر۔ مولانا محمد علی کی جنگ آزادی۔ جوہر نامہ۔ کلام جوہر۔ محمد علی اور ذاتی ڈائری چند ورق۔ جذبات جوہر۔ تقاریر محمد علی۔ خطبات صدارت۔ سیرت محمد علی۔ گنجینۂ جوہر۔ لکھنؤ کا ادبی ماحول۔ سفرنامہ یورپ۔ تفہیم و تعبیر۔ جامعہ ملیہ ہے کیا؟۔

نمونہ کلام:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

زلف رہنے دو ہاں نقاب ذرا — رخِ محبوب سے ہٹا لینا

آج جی بھر کے دیکھ لینے دو — کل کو دل کھول کر ستا لینا

تحریر: سحر فاطمہ

حسن نظامی
1879ء تا 1955ء

خواجہ حسن نظامی، حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ واقع دہلی میں 6 جنوری 1879ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید امام درگاہ سے وابستہ تھے۔ آپ کا خاندان شروع سے ہی تصوف کے راستے پر تھا۔ اس لیے خواجہ صاحب کی تربیت بھی اسی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اُنھوں نے کبھی کسی باقاعدہ ادارے سے تعلیم حاصل نہیں کی بل کہ خود ہی اُردو، عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کر لی۔ ابتدائی زندگی بہت مشکل میں گزاری پھر کتابیں بیچنے کا کاروبار شروع کیا۔ آپ کتابیں اُٹھا کر پرانی دہلی سے نئی دہلی جاتے اس طرح گزر اوقات ہونے لگی۔ خواجہ صاحب سلسلہ چشتیہ کے صوفی اور اُردو زبان کے ادیب تھے۔ فرصت کے اوقات میں لکھنے اور پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں شایع ہونے لگے۔ اُنھوں نے اپنی صحافی زندگی کا آغاز روزنامہ ''رعیت'' سے کیا۔ اخبار ''منادی'' میں ان کا روزنامہ شایع ہوتا رہا۔ خواجہ صاحب نے خود میرٹھ سے ایک اخبار نکالا جس کا نام ''توحید'' تھا۔ خواجہ صاحب اچھے اور منفرد انشا پرداز تھے۔ ان کے ہاں پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ متعدد لوگ ان کے حلقۂ مریدی میں داخل ہوئے۔ جنوری 1946ء میں آپ کو شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ نے 31 جولائی 1955ء کو دلی میں وفات پائی اور بارگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے احاطے میں دفن ہوئے۔

تصانیف: سیپارۂ دل۔ بیگمات کے آنسو۔ غدر دلی کے افسانے۔ مجموعہ مضامین حسن نظامی۔ طمانچہ بر رخسار یزید۔ سفرنامہ ہندستان۔ کرشن کتھا۔

نمونہ کلام: ''بہادر شاہ جب محبوب الٰہی کے عرش شریف میں حاضر ہوتے تو بڑی کیفیت رہتی تھی جب تک بادشاہ نہ آجائے۔ جب بادشاہ آجاتا تو شور مچ جاتا، خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہوتے تھے۔ مگر بادشاہ کے درگاہ میں داخل ہوتے ہی لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور دروازے سے مزار مبارک تک ایک آدمی کے چلنے کے قابل رستہ بن جاتا تھا۔ جس سے گزر کر بادشاہ پہلے مزار مبارک پر حاضر ہوتے۔ اس کے بعد محفل میں آجاتے بادشاہ کے آتے ہی ختم شروع کر دیا جاتا اور ختم کے بعد قوالی شروع ہوتی۔'' (بیگمات کے آنسو)

تحریر: محمد اویس

حشر کاشمیری
1879ء تا 1935ء

آغا حشر کا نام آغا محمد شاہ کاشمیری تھا آپ کا تاریخی نام محمد خلیل شاہ رکھا گیا جو آگے چل کر محمد شاہ رہ گیا۔ آخر میں صرف آغا حشر کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ 3 اپریل 1879ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم تربیت بنارس میں ہوئی۔ دینی تعلیم مولوی عبدالصمد سے حاصل کی۔ دس برس کی عمر تک ایک مکتب میں حاصل کی۔ والد سے اُردو عربی اور فارسی پڑھی اور قرآن پاک کے سولہ سپارے حفظ کیے۔ انگریزی تعلیم روج نرائن ہائی سکول سے حاصل کی۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شعر شاعری اور موسیقی کا چسکا پڑا، دوستوں کی محفلوں میں غزلیں سنا کر خوب داد لیتے۔ خوش الحانی، رنگین بیانی اور مترنم انداز کی بدولت بہت جلد شہرت حاصل کر لی اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ 1897ء میں بمبئی کی مشہور نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بنارس میں وارد ہوئی تو اس کا ڈراما دیکھ کر ڈرامے کا شوق پیدا ہوا۔ شوق اس حد تک تھا کہ اُنھوں نے اپنا پہلا ڈراما "آفتاب محبت" صرف آٹھ دنوں میں لکھ ڈالا، پھر اسی کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ آغا حشر کاشمیری اُردو ڈرامے میں وہی مقام رکھتے ہیں جو انگریزی میں شیکسپیئر کو حاصل ہے۔ آغا حشر نے انگریزی سے ڈرامے ترجمہ بھی کیے۔ خالص اُردو میں فقط دو ڈرامے "ترکی حور" اور "رستم و سہراب" لکھے۔ باقی وقت ہندی آمیز اُردو اور ہندی ڈراموں کی تصنیف میں صرف کیا۔ اُن کے ہندی ڈراموں میں "آنکھ کا نشہ" "بھارت منی" "سیتا بن باس" "بھیشم پرتگیہ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اُنھوں نے 28 اپریل 1935ء کو وفات پائی۔

تصانیف: آفتاب محبت۔ مرید شک۔ دام حسن۔ ٹھنڈی آگ۔ سفید خون۔ صید ہوس۔ شہید ناز۔ خوب صورت بلا۔ خواب ہستی۔ یہودی کی لڑکی۔ بن دیوی۔ پہلا پیار۔ انوکھا مہمان۔ بھارت منی۔ مدھر مرلی۔ بلوا منگل عرف سورداس۔ سیتا بن باس۔ عورت کا دل۔ رستم و سہراب۔ مار آستین۔ پاک دامن۔ اسیر حرص۔

نمونہ کلام: "میرے بچپن کے رفیق، جوانی کے دوست، جنگ کے وفادار ساتھی وہ دیکھو ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تمہارے لیے دور تک سبز مخمل کا دسترخوان بچھا ہوا ہے خوشبو میں نہائے ہوئے ہوا کے جھونکے بار بار تمہیں بلانے آرہے ہیں" (رستم و سہراب)

تحریر: صنم اشرف

فانی بدایونی
1879ء تا 1941ء

ان کا اصل نام شوکت علی خان تھا اور تخلص "فانی" تھا۔ وہ 13 ستمبر 1879ء کو اسلام نگر اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اپنا بچپن وہیں گزارا۔ آپ کے والد پولیس میں تھے۔ فانی بدایونی ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے دادا دولت مند انسان تھے جن کا نام نواب اکبر علی خان تھا۔ اُنھیں بچپن سے ہی قانون میں دل چسپی تھی۔ اُنھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری علی گڑھ یونی ورسٹی سے حاصل کی لیکن ان کی وکالت چل نہ سکی اس لیے شاعری کی طرف آ گئے۔ اُنھوں نے شاعری بیس سال کی عمر میں شروع کی اور نواب مرزا خان داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ اُنھوں نے باپ کی سختی، بیٹی اور بیوی کی وفات اور غربت سمیت بہت مشکلات کا سامنا کیا لیکن اُنھوں نے ہمت سے ان کا سامنا کیا۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں خستگی اور درد مسلسل کی کیفیت موجود ہے۔ اُنھیں اپنی ذہانت کی وجہ سے اُردو میں بڑا مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اُردو میگزین بھی متعارف کرایا جو 1931ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں پر محکمہ تعلیم میں بھرتی ہو گئے۔ اُنھوں نے سب سے پہلی نظم 1917ء میں شایع کرائی جو کہ ثاقب پریس نے شایع کی۔ فانی کی شاعری یاسیت اور قنوطیت سے بھرپور ہے۔ اُن کے شعروں میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی سسکیاں اور کراہیں سنائی دیتی ہیں۔ باہر کی دنیا فانی کے ذہن سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے اُنھوں نے اپنی نگاہ کا مرکز اپنے باطن کو بنا لیا ہے۔ اُردو میں قنوطی شاعری اور خواہش مرگ کے حوالے سے فانی کی شاعری مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کول نے اُنھیں حیدر آباد بلوا لیا اور وہیں اُنھوں نے 27 اگست 1941ء میں حیدر آباد میں وفات پائی۔

تصانیف: باقیاتِ فانی۔ فانی کی نادر تحریریں۔ انتخابِ فانی۔ کلیاتِ فانی۔ عرفانیاتِ فانی۔

نمونہ کلام:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

غم فانی و عیش برہم کیا — جاوداں ہو تو عیش ہے غم کیا

تحریر: رمشا محمود

سیماب اکبر آبادی
۱۸۸۰ء تا ۱۹۵۱ء

سید عاشق حسین نام اور سیماب تخلص تھا۔ وہ 5 جون 1880ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ایف اے کے سال اول میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے آپ تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے اور انگریزی کی تعلیم معمولی رہ گئی لیکن مولانا جلال الدین سرحدی، سید احمد گنگوہی اور مولانا قمر الدین جیسے فاضل بزرگوں سے اُنھوں نے عربی اَدب اصول اور منطق کی تکمیل کی تھی۔ اُن کا فارسی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شاعری کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ 1892ء میں اُنھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ 1898ء میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ اُنھیں نظم و نثر دونوں میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ 1923ء میں اُنھوں نے ''قصر الادب'' کی بنیاد رکھی۔ اُنھوں نے اپنی ساری زندگی علم و اَدب میں صرف کر دی۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ''قصرِ اَدب'' کے نام سے آگرہ میں ایک ادارہ بھی قایم کیا۔ سیماب کو تصوف سے بڑا لگاؤ تھا اس لیے وہ عشقِ حقیقی کے پابند ہیں وہ جلوہ ہائے خداوندی میں خود کو محو رکھنا چاہتے ہیں۔ سپردگی اور استغراق کی ان کے ہاں کمی ہے۔ بزرگانِ دین اور پیشوایان سے اُنھیں گہری محبت تھی۔ اس لیے اسلامی مرثیے بھی بہ کثرت لکھے ''سرورِ غم''، ''نفیرِ غم'' کے نام سے ان کے دونوں مجموعے اسی قسم کے کلام پر مشتمل ہیں۔ سیماب کو قدرتی مناظر سے بڑی دل چسپی تھی۔ چناں چہ اُنھوں نے مختلف منظریاتی نظمیں قلم بند کی ہیں۔ ''گلشن''، ''پہاڑ''، ''شفق''، ''ابر''، ''صبح و شام''، ''چاندنی'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی شاعری آج بھی پُراثر ہے جسے قاری پڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان کی کچھ نظموں کا مجموعہ ''کرشنا گیتا'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ 31 جنوری 1951ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

تصانیف: نیستاں۔ کلیم عجم۔ سدرۃ المنتہیٰ۔ کار امروز۔ شعرِ انقلاب۔ عالم آشوب۔ نفیرِ غم۔ سرودِ غم۔ داؤ پیچ۔ دستور الاصلاح۔ کرشن گیتا۔ لوحِ محفوظ۔ راز عروض۔ سوانح نور جہاں بیگم۔ ساز و آہنگ۔ وفا کی دیوی۔

نمونہ کلام:

پایا تجھے حدود و تعین سے ماورا — منزل سے کچھ نکل کے ترا راستا ملا

ہائے سیماب اس کی مجبوری — جس نے کی ہو شباب میں توبہ

تحریر: حاجی محمد اسماعیل

منشی پریم چند
۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء

منشی پریم چند کا اصل نام ''دھن پت رائے'' ہے۔ پریم چند 31 اگست 1880ء کو ضلع بنارس کے ایک گاؤں پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ پریم چند ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے تقریباً سات آٹھ برس فارسی پڑھنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ ایک سال بعد والد کا انتقال ہو گیا پریم چند اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ پورے گھر کا بوجھ آپ پر پڑ گیا۔ فکرِ معاش نے زیادہ پریشان کیا تو لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے لگے اور میٹرک کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پریم چند کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ پریم چند ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اُنھوں نے ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدرات کی اور صدارتی خطبہ دیا جو ترقی پسند تحریک کی بنیادی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ پریم چند نے مہاتما گاندھی کی ترکِ موالات تحریک کی حمایت میں 1921ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر صحافت سے وابستگی اختیار کر لی۔ پریم چند نے ہی صحیح معنوں میں اُردو افسانے کی بنیاد ڈالی اور اس بنیاد پر شاندار محل تعمیر کرنے کا سہرا بھی انھی کے سر ہے۔ اُنھوں نے ناول اور افسانے کے علاوہ چند ایک ڈرامے بھی لکھے۔ لیکن آپ کو زیادہ شہرت افسانہ نگاری کی وجہ سے ملی۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' ان کی شہرت کا باعث بنا۔ اُردو افسانے میں پریم چند کی روایت کو دراصل ''کفن'' کی روایت سمجھتے ہیں۔ پریم چند کی وفات 8 اکتوبر 1936ء کو بنارس میں ہوئی۔

تصانیف: پریم بتیسی۔ پریم پچیسی۔ زادِ راہ۔ سوزِ وطن۔ گئو دان۔ نرملا۔ میدانِ عمل۔ مانسرور (آٹھ جلدیں)۔

نمونہ کلام: ''جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مئے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی ہوا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ یہاں آنے والے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے'' (کفن افسانہ)

تحریر: زمرد اجمل

سید سجاد حیدر یلدرم
1880ء تا 1943ء

سید سجاد حیدر یلدرم کی پیدائش 1880ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بنارس میں حاصل کی۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے اعلا تعلیم حاصل کی۔ رسالہ ''معارف'' کے ذریعے افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے۔ آپ نے حاجی اسماعیل رئیس کو انگریزی پڑھائی اور معاوضے میں ترکی سیکھی۔ بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ترکی زبان کے مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور تین برس بغداد میں ہی مقیم رہے۔ قسطنطنیہ بھی گئے۔ ترکی زبان کے روشن خیال ادیبوں اور انقلابی پارٹی ینگ ٹرک کے پُرجوش کارکنوں سے گہرا رابطہ رہا۔ 1912ء میں اپنے عہد کے روشن خیال گھرانے کی تعلیم یافتہ اور ادیب لڑکی نذر زہرا بیگم سے شادی ہوئی۔ راجہ صاحب محمود آباد کے سیکرٹری اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار رہے اور بعد ازاں یوپی سول سروس میں واپس چلے گئے۔ 1935ء میں قبل از وقت پنشن لے لی۔ سجاد حیدر یلدرم رومانی تحریک سے وابستہ تھے۔ اس تحریک سے ان کا تعلق اس وقت ہوا جب یہ تحریک نصف النہار پر پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے اپنی اَدبی زندگی کا بیش تر حصہ رومانی تحریک کے رسالہ ''مخزن'' کے ساتھ بسر کیا۔ عمر کے آخری ایام دہرہ دون میں گزارے۔ یلدرم کو اُردو کے باقاعدہ انشائیہ نگار اور اولین افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُن کی کہانیوں میں افسانے کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ کر کے ہمارے اَدب میں اضافے کیے۔ سید سجاد حیدر یلدرم اُردو میں رومانی نثر کے معمار بھی ہیں۔ وہ 12 اپریل 1943ء کو رات دو بجے حرکت قلب بند ہونے سے لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: خیالستان۔ جلال الدین خوارزم شاہ۔ جنگ و جدل۔ ثالث بالخیر۔ زہرا۔ مطلوب حسیناں۔ آسیب الفت۔ ہما خانم۔ ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی۔

نمونہ کلام: ''نسرین نوش ایک پُرلطف تھکن سے ایک بے ہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں اُن پر نظر ڈالی اور اپنے لال لبوں سے برق تبسم گرا کے کہا''۔ (خیالستان)

تحریر: ارم شہزادی

حافظ محمود شیرانی
1880ء تا 1946ء
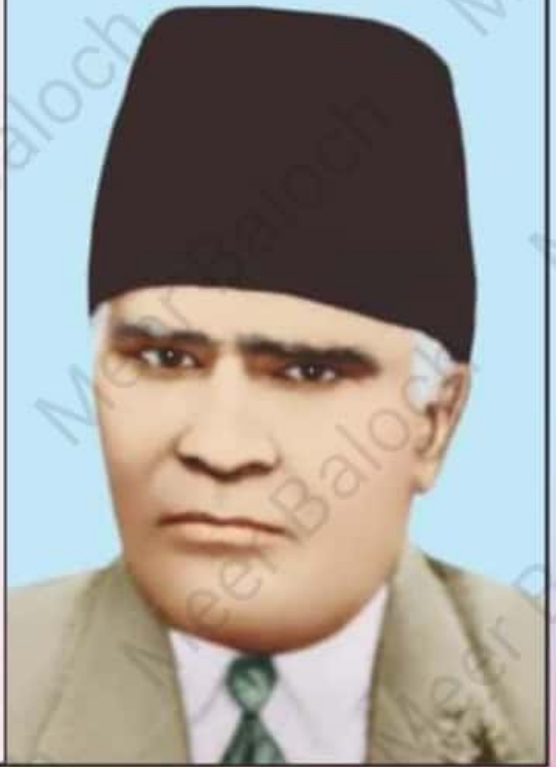
حافظ محمود شیرانی 5 اکتوبر 1880ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور رومانوی شاعر اختر شیرانی کے والد تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس لیے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کیا اور پھر اس دور کے رواج کے مطابق اُردو اور فارسی کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ منشی فاضل کی سند لاہور سے اعلا درجے میں حاصل کی۔ بیرسٹری کی تعلیم انگلستان سے حاصل کی۔ انگریزی زبان پر دسترس حاصل کر کے قانون کی ڈگری کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ پروفیسر آرنلڈ نے ان کے لیے تعلیمی وظیفے کا بندوبست کر دیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں اُردو اور فارسی کے معلم مقرر ہوئے۔ 1940ء میں اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ حافظ محمود شیرانی نے اَدبی ولسانی تحقیق کے سلسلے میں اہم ترین خدمات انجام دیں۔ کسی کتاب کی تدوین سے پہلے اس کی علمی حیثیت اس کے زمانہ تالیف و کتابت سے متعلق اور مصنف کے حالات سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ لسانی تحقیق میں ''پنجاب میں اُردو'' 1928ء میں شائع ہوئی۔ اس تحقیق میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پنجابی زبان اُردو کی ماں ہے۔ اُنھوں نے لسانی دلائل، تاریخی دلائل اور اَدبی دلائل سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو نے پنجاب میں جنم لیا۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ واحد جمع، مذکر مونث سب اُردو اور پنجابی سے ہی بنے ہیں'' پنجاب میں اُردو'' ان کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اُن کے اسی کام کو دیکھ کر اُردو کی تاریخ کے حوالے گجرات میں اُردو اور بنگال میں اُردو وغیرہ سامنے آئے۔ وہ ایک مایہ ناز محقق، مضمون نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ 16 فروری 1946ء کو ٹونک میں وفات پا گئے۔

تصانیف: تنقید شعر العجم۔ تنقید آب حیات۔ فردوسی پر چار مقالے۔ خالق باری۔ پرتھی راج رسا۔ پنجاب میں اُردو۔ قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر۔ مقالات حافظ محمود شیرانی۔ مثنوی عروۃ الوثقیٰ۔

نمونہ کلام: ''تعجب ہے کہ اُردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اُردو رکھ دیا گیا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ نہ قدما اس کا ذکر کرتے ہیں۔'' (پنجاب میں اُردو)

تحریر: عدیلہ زمان

چودھری محمد علی ردولوی
1882ء تا 1959ء
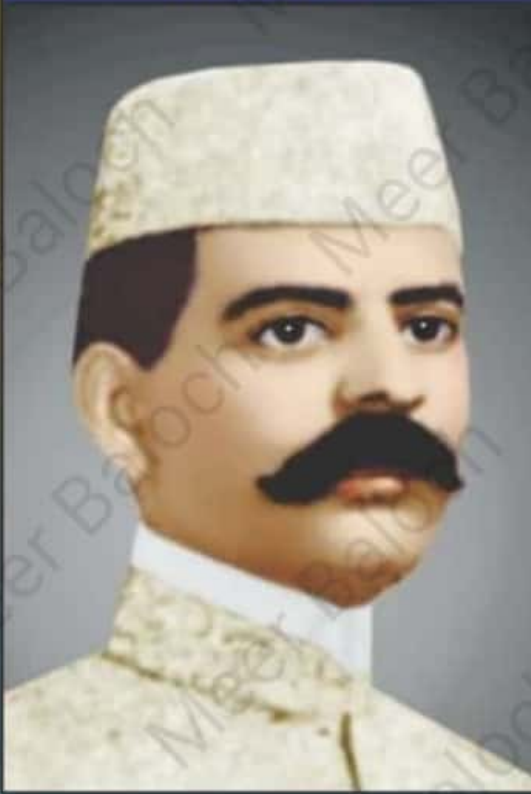
چودھری محمد علی ردولوی 18 مئی 1882ء کو ردولی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے لکھنؤ کے کالون تعلقہ دار کالج سے میٹرک کیا۔ اُنھوں نے باقاعدہ تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی اور اس کے بعد اُن کی شادی ہو گئی۔ شعر واَدب کے علاوہ موسیقی سے اُنھیں بہت لگاؤ تھا۔ محمد علی ردولوی اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد محسوسات خارجی پر ہی رکھتے تھے اور جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اُسے اپنے قاری کے سامنے سادہ انداز میں پیش کر دیتے تھے۔ وہ حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مشاہدے میں صداقت سے آنکھیں چرانا جرمِ عظیم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے بیان میں تخیل کا دائرہ کبھی دھندلا نہیں بناتے اس لیے اُن کا پیش کردہ امتزاجِ فن، اَدب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ علمی واَدبی خدمات کے شانہ بہ شانہ اُن کی سماجی خدمات چلتی تھیں۔ وہ آزاد طبع انسان تھے اور ملازمت کی پابندیوں سے اُن کا مزاج مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ اپنے افسانوں میں اُنھوں نے انسان اور اس کے گرد وپیش کو بالخصوص اپنا موضوع بنایا۔ اُن کے افسانوں میں اَودھ کا قصباتی ماحول سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں انشائیہ کا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور مزاح نگاری بھی موجود ہے۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری، مکتوب نگاری، مزاح نگاری، انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔ چودھری محمد علی ردولوی نے 10 ستمبر 1959ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: گویاَ دبستان کھل گیا۔ گناہ کا خوف۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر۔ اتالیق بی بی۔ کلیات چودھری محمد علی ردولوی۔ میرا مذہب۔ صلاح کار۔ خبطی۔ نقادی نکتے۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم۔ سیرۃ الاقطاب اُردو۔ پردے کی بات۔

نمونہ کلام: ”ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اگر ضرورت ہو تو مسل گُما دیں۔ ریل پر سے۔ کچہری کے احاطے سے۔ گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو۔ بستے سے ضروری کاغذ غائب ہو جائے باقی ویسے ہی رکھے رہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کا جل کا چور اصل بستہ لے گیا۔“

تحریر: ابدال رضا

مرزا فرحت اللہ بیگ
1883ء تا 1947ء

مرزا فرحت اللہ بیگ یکم ستمبر 1883ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ تھا۔ آپ نے دینی اور ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی اور ہائی تعلیم دہلی ہندو کالج سے حاصل کی۔ 1903ء میں ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد بی۔ اے کے لیے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہو گئے۔ 1905ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ 1907ء میں جب آپ حیدر آباد گئے تو آپ کی ملاقات مولوی عزیز احمد سے ہوئی۔ اُنھوں نے اپنی قابلیت کی وجہ سے محکمہ تعلیم میں اپنی جگہ قایم کی۔ اُنھوں نے بی۔ اے کے بعد گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دی۔ ملازمت میں وہ محنت کی وجہ سے ترقی کرنے لگے۔ آپ نے کھیل کے میدان میں بھی خاص نام کمایا۔ وہ فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ مرزا نے زیادہ نام مزاح میں کمایا۔ اُردو میں مرزا فرحت اللہ بیگ کو ایک حلیم الطبع اور شائستہ مزاج مزاح نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے صورت واقعہ کی ناہمواری اور غیر متوقع طور پر اچانک پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے مزاح کی اساس تیار کی ہے۔ مزاح نگار عموماً حد اعتدال کو قایم نہیں رکھ پاتے لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں پھکڑ پن اور ابتذال نام کو نہیں۔ اُن کے مزاح سے ایک مسکراہٹ لبوں پر آجاتی ہے اور قاری اس سے لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ پاتا۔ اُن کے مزاحیہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں یعنی وہ اپنے انداز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ وہ کالم نگار بھی تھے۔ اُنھوں نے 27 اپریل 1947ء میں حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔

تصانیف: مضامین فرحت۔ دہلی کی آخری شمع۔ نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی۔ میری داستان۔ میری شاعری۔

نمونہ کلام: ڈاڑھی تو منڈاتے ہو مونچھیں بھی منڈالو　　　تب نکلے گی اے فرحت کچھ صورت مردانہ

”میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے معنے تو رہ ہی گئے۔ کہنے لگے: اتنا بڑا واقعہ سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے؟ بس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق سے ایک ملا کا بیٹا ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلما، ایل ایل ڈی ہو گیا۔“

تحریر: سحر دلشاد

اصغر گونڈوی
1884ء تا 1936ء
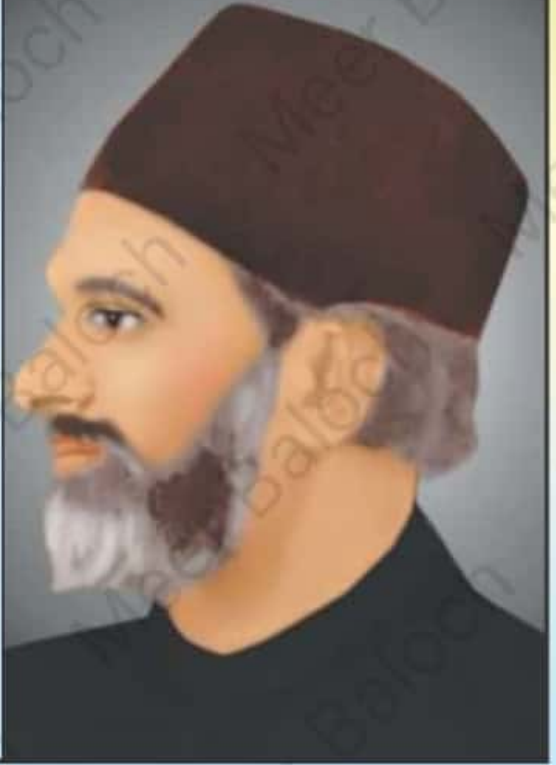
اصغر گونڈوی کا اصل نام اصغر حسین تھا۔ وہ یکم مارچ 1884ء کو گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد تفضّل حسین بسلسلہ ملازمت گونڈہ میں رہتے تھے جہاں وہ صدر قانون گو تھے۔ عربی و فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ چوں کہ گونڈہ میں اصغر نے مستقل رہایش اختیار کر رکھی تھی، اسی لیے اصغر گونڈوی کہلاتے ہیں۔ اصغر کی ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق مکتب سے شروع اور اُردو عربی میں خاصی مہارت حاصل کر لی اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے گورنمنٹ سکول گونڈہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے 1904ء میں آٹھویں کلاس کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران عربی اور فارسی کی کتابیں اپنے والد سے گھر پر پڑھیں۔ کچھ عرصے کے لیے اُنھوں نے انگریزی مدرسے میں بھی وقت گزارا اور پڑھ کر چھوڑ دیا۔ اُنھیں فطری طور پر علم واَدب کا بہت شوق تھا۔ یہ تعلیم وصحبت آگے چل کر "ہندستانی اکیڈمی" کے سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" کے شعبہ اُردو کے مدیر کی حیثیت سے ان کے تقرر میں کام آئی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے اُردو غزل کو بچانے کی کوشش کی ان شعرا میں اصغر گونڈوی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اصغر کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی اخلاق کی بلندی ہے۔ اصغر نے 1913ء میں ہفتہ وار "قصرِ ہند" کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ اصغر گونڈوی جدید اُردو غزل کا ایک انتہائی اہم نام ہیں۔ اس سے پہلے وہ 1929ء میں عطر چند کپور کے اَدبی مرکز سے وابستہ رہ چکے تھے۔ "نشاطِ روح" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فرسودہ اور پامال مضامین باندھنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے لیے نئی راہ نکالتے ہیں۔ اُن کی غزل نادر موضوعات کے باعث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اصغر گونڈوی بنیادی طور پر ایک شریف النفس، پاکیزہ مزاج اور آسودہ خاطر انسان تھے۔ آپ نے 30 نومبر 1936ء کو گونڈہ میں وفات پائی۔

تصانیف: نشاطِ روح۔ سرودِ زندگی۔

نمونہ کلام:

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے

تحریر: عمران تیمور

یاس یگانہ چنگیزی
1884ء تا 1956ء
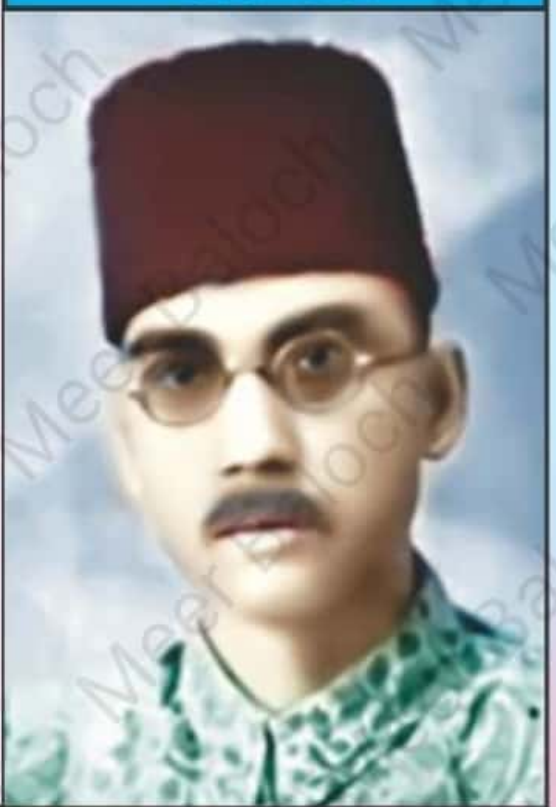
اصل نام مرزا واجد حسین تھا۔ یگانہ اور یاس تخلص کیا۔ محلہ مغل پورہ عظیم آباد پٹنہ میں ان کی ولادت 17 اکتوبر 1884ء کو ہوئی۔ سکول کے زمانے سے اُنھوں نے شاعری کا آغاز کیا اور بیتاب عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے۔ شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس لیے لکھنؤ جا بسے۔ مرزا یگانہ ایک ذہین شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی اَدبی معرکوں اور لڑائیوں میں گزاری۔ ان کو غزل سے بہت لگاؤ تھا۔ اُنھوں نے وہ راہ ترک کر دی جو پہلے سے مستعمل تھی۔ دبستان لکھنؤ میں آتش کے بعد یگانہ ہی سب سے منفرد شاعر ہیں۔ یگانہ کا کلام ان کے مختلف مجموعوں اور اس زمانے کے رسالوں میں بکھرا ہوا تھا جسے مشفق خواجہ نے جمع کر کے "کلیاتِ یگانہ" شایع کی جس نے یگانہ کی شاعرانہ شخصیت کی بازیافت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ عزیز، صفی، ثاقب و محشر وغیرہ کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ جب رسالہ "معیار" جاری ہوا تو یگانہ بھی غالب کی زمینوں میں غزلیں پڑھتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں کی جو غزلیں "معیار" میں چھپی ہیں، ان میں بھی یگانہ کی غزلیں شامل ہیں۔ اُنھوں نے "انجمن خاصانِ اَدب" کے نام سے ایک اَدبی انجمن قایم کی جس کے وہ سکریٹری تھے۔ وہ "اودھ اخبار" کے مدیر، اٹاوہ میں سکول ٹیچر، علی گڑھ میں پریس ملازم بھی رہے۔ لاہور میں "اُردو مرکز" سے وابستہ ہوئے۔ اقبال کے یہاں بھی ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ یگانہ ایک کلاسیکی غزل گو شاعر تھے۔ حالاں کہ اُنھوں نے قطعات و رباعیات بھی کہی ہیں لیکن ان کی اصل پہچان ان کی غزلیں ہی ہیں۔ اُنھوں نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو ایک نئی جہت اور اونچائی عطا کی اور ایسے مضامین نظم کیے جو پہلی بار حقیقت پسندانہ کیفیت کے ساتھ غزل کے افق پر نمودار ہوئے۔ یگانہ کا انتقال 4 فروری 1956ء کی صبح لکھنؤ میں ہوا۔

تصانیف: نشترِ یاس۔ آیاتِ وجدانی۔ ترانہ۔ گنجینہ۔ شہرتِ کاذبہ یا خرافاتِ عزیز۔ غالب شکن۔ انتخاب کلام۔ مکتوباتِ یگانہ۔ کلیاتِ یگانہ۔

نمونہ کلام:

جو دل نہیں رکھتا کوئی مشکل نہیں رکھتا — مشکل نہیں رکھتا کوئی جو دل نہیں رکھتا
کھینچے لیے جاتا ہے کہیں شوقِ شہادت — دم لینے کی تاب اب دلِ بسمل نہیں رکھتا

تحریر: شہر بانو

سید سلیمان ندوی
1884ء تا 1953ء

سید سلیمان ندوی 22 نومبر 1884ء کو بہار میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام حکیم سید ابوالحسن تھا جو کہ ایک صوفی منش تھے۔ تعلیم کا آغاز خلیفہ انور علی اور مولوی مقصود علی سے کیا۔ اُنھوں نے اپنے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب سے بھی تعلیم حاصل کی۔ پھلواری شریف، دربھنگا سے کسب فیض کیا۔ 1901ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہوئے جہاں وہ سات سال تک پڑھتے رہے۔ 1913ء میں دکن کالج پونا میں معلم مقرر ہوئے۔ 1940ء میں اُنھیں علی گڑھ یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اسلام کو جن علما پر ناز ہے ان میں سے ایک سید سلیمان ندوی ہیں۔ اُن کی علمی و اَدبی خدمات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کے استاد علامہ شبلی نعمانی ''سیرت النبی'' کی پہلی دو جلدیں لکھ کر انتقال کر گئے تو باقی چار جلدیں سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔ اپنے استاد کی وصیت پر ہی دارالمصنفین اعظم گڑھ قایم کیا اور ایک ماہ نامہ ''معارف'' بھی جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنا لیا اور مذہبی و علمی مشاغل جاری رکھے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کے صدر مقرر ہوئے۔ وہ ایک سیرت نگار، عالم، مورخ اور اہم کتب کے مصنف تھے جن میں سیرت النبی کو اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے 22 نومبر 1953ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: سیرت النبی۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ حیاتِ شبلی۔ رحمت عالم۔ نقوشِ سلیمان۔ حیاتِ امام مالک۔ اہل السنہ والجماعہ۔ یادِ رفتگاں۔ سیر افغانستان۔ مقالاتِ سلیمان۔ خیام۔ دروس الادب۔ خطباتِ مدراس۔ ارض القرآن۔ ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں۔ بہائیت اور اسلام۔ معارف۔ مسلمان عورتوں کی بہادری۔ لغات جدیدہ۔ علم معاش و معاد کی صحیح حیثیت۔ عربوں کی جہاز رانی۔ سیرۃ عائشہ صدیقہؓ۔ خلافت اور ہندستان۔ خطوطِ سلیمانی۔ تحقیقات الفاظ اُردو۔ برید فرنگ۔ بشریٰ۔

نمونہ کلام: ''اس وقت تک حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے، وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے۔ تصوف و فقہ کے اختلافی مسائل کی تحقیق یا فرق باطلہ کی تردید۔'' (حیاتِ شبلی)

تحریر: حمنا امجد

نیاز فتح پوری
1884ء تا 1966ء
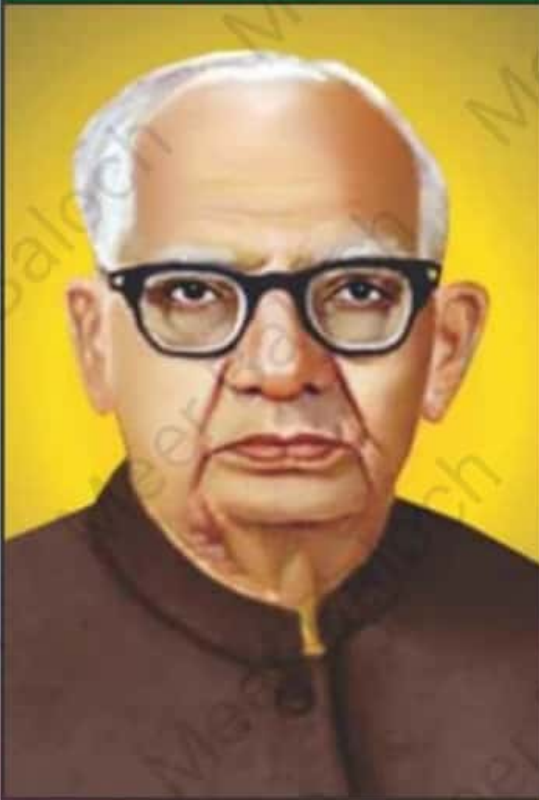
نیاز فتح پوری 28 دسمبر 1884ء میں یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ فتح پور، مدرسہ عالیہ رام پور اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے حاصل کی۔ 1922ء میں اُردو کا معروف اَدبی و فکری رسالہ ''نگار'' جاری کیا۔ آپ رومانوی تحریک سے وابستہ تھے اور شان دار رومانوی نثر تخلیق کرتے تھے۔ اُن کی علمی خدمات کے اعتراف میں 1962ء میں بھارت نے اُنھیں ''پدما بھوش'' کے خطاب سے نوازا۔ 1962ء میں ہی وہ ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور حکومت پاکستان نے بھی اُنھیں اعزاز سے نوازا۔ اُن کی نثر میں خیال اور خیال کی مصوری، شوق اور شوق کی تحلیل لفظی، حسن اور حسن کی پیکر آفرینی نمایاں ہے۔ وہ اگرچہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ تھے لیکن اُنھوں نے مذہب کو عقلیت کی میزان پر رکھا اور نتائج کا برملا اظہار اپنے رسالے ''نگار'' میں کیا۔ نیاز نے متعدد افسانے لکھے جو حقیقت سے بہت دور لے جاتے ہیں اور ان پر تصنع کا گمان ہوتا ہے۔ اُن کے ابتدائی انشایئے اور افسانے دیکھیں تو ان میں ماورائی کردار ملتے ہیں جو عام انسانی عادات و اطوار سے محروم دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نثر پر تکلف ہے اور شاعری کے بہت قریب ہے۔ وہ اچھے ناول نگار بھی ہیں، ان کی ناول نگاری پر آسکر وائلڈ کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ ایک نقاد کی بھی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ اس دبستانِ تنقید کے مشرقی نمایندے ہیں جسے لون جائنس اور والٹر پیٹر نے مغرب میں پروان چڑھایا۔ آپ کا انتقال 24 مئی 1966ء میں سرطان کی وجہ سے کراچی میں ہوا۔

تصانیف: من و یزداں۔ مالہ وماعلیہ۔ مشکلات غالب۔ استفسارات۔ انتقادیات۔ ترغیبات جنسی۔ تاریخ الدولتین توقیت تاریخ اسلامی ہند۔ چند گھنٹے علما کی روح کے ساتھ۔ جذبات بھاشا۔ نگارستان۔ جمالستان۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد۔ حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے۔ مختاراتِ نیاز۔ شہاب کی سرگزشت۔ ایک شاعر کا انجام۔ صحابیات۔ عرض نغمہ۔ مکتوباتِ نیاز۔ مذہب۔ محمد بن قاسم سے بابر تک۔ مذاہب عالمی کا تقابلی مطالعہ۔ شبنمستان کا قطرہ گوہریں۔

نمونہ کلام: نہ دنیا کا ہوں میں نہ کچھ فکر دیں کا　　محبت نے رکھا نہ مجھ کو کہیں کا

تحریر: ثنا یاسمین

تلوک چند محروم
1887ء تا 1966ء
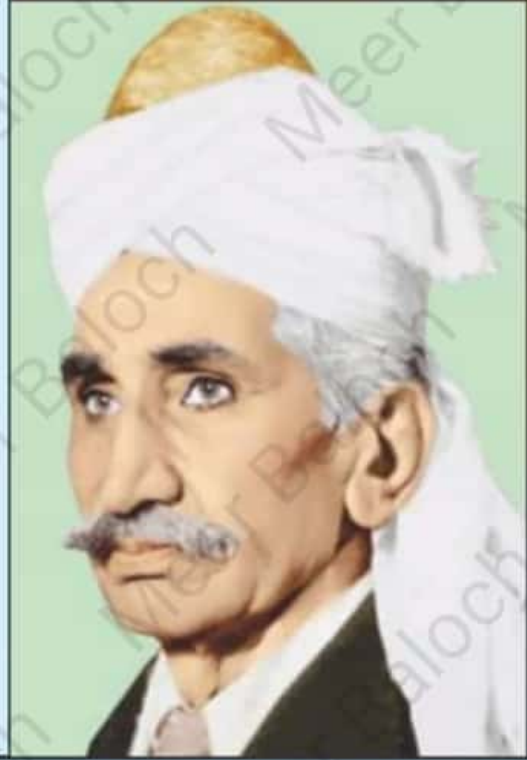
تلوک چند محروم یکم جولائی 1887ء میں تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے بی۔اے تک روایتی تعلیم حاصل کی۔1908ء میں مشن ہائی سکول ڈیرہ اسماعیل خاں میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔1933ء میں کنٹونمنٹ بورڈ سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔آپ جب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو گارڈن کالج راولپنڈی میں اُنھیں اُردو اور فارسی کے لیکچرر کی پوسٹ پر تقرری کی پیش کش ہوئی جو اُنھوں نے قبول کر لی جب کہ محرومؔ کی تعلیم بی۔اے تھی مگر اُنھیں شاعر کی حیثیت سے اور ان کی قابلیت کی وجہ سے لیکچرر رکھا گیا۔اُن کی بیٹی ''شکنتلا'' جل کر مر گئی ہندو لاش کو جلا کر اس کی راکھ کو گنگا میں بہا دیتے مگر محرومؔ نے ایسا نہ کیا بل کہ اس کو دفن کیا اور قبر بھی بنوائی۔ہندستان میں رہتے ہوئے آپ تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات کی وجہ سے راولپنڈی سے دہلی ہجرت کر گئے۔اُنھوں نے اپنے بیٹے جگن ناتھ آزادؔ کو وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اُنھیں جلایا نہ جائے اور دسویں پر قرآن پڑھوایا جائے، ان کے بیٹے نے ان کی وصیت پوری کی۔محرومؔ نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان میں شاعری کا جذبہ فطری تھا۔1901ء میں جب محرومؔ مڈل میں پڑھتے تھے تو اُنھوں نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ لکھا۔ہائی سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران رسالہ ''مخزن'' اور ''زمانہ'' میں ان کی نظمیں شائع ہوئیں۔ان کی نظمیں قومی جذبے سے بھرپور ہوتی تھیں۔اس حوالے سے وہ چکبست، سرور جہاں آبادی کی روایت کے امین تصور کیے جاتے ہیں۔محرومؔ نے نعتیں بھی لکھیں اور بچوں کے لئے بھی بہت کچھ لکھا، ان کے لیے جو نظمیں لکھیں ان سے ان میں قومی جذبات کو ابھارنے اور ان کی زندگی کو مثالی اقدار سے روشناس کروایا۔تقسیم ہند کے بعد دہلی گئے اور 6 جنوری 1966ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: کلام گنج معانی۔شعلہ نوا۔کاروانِ وطن۔رباعیات محرومؔ۔نیرنگ معانی۔بہار طفلی۔بچوں کی دنیا۔

نمونہ کلام:

تلاطم آرزو میں ہے یہ طوفاں جستجو میں ہے   جوانی کا گزر جانا ہے دریا کا اتر جانا

عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز   غیر کو راز داں نہیں کرتے

تحریر: ہما نذیر

ابوالکلام آزاد
1888ء تا 1958ء
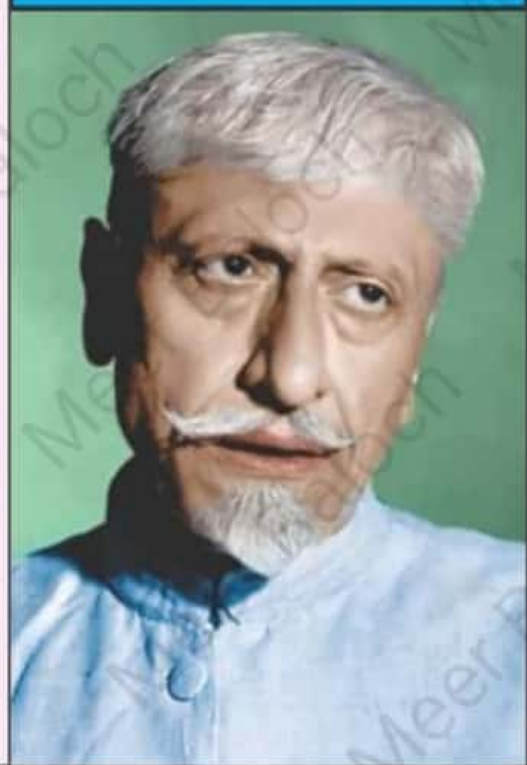
ابوالکلام آزاد 11 نومبر 1888ء کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔اُن کا اصل نام محی الدین احمد تھا اور ان کے والد محمد خیر الدین اُنھیں فیروز بخت کہہ کر پکارتے تھے۔مولانا کا سلسلہ نسب شیخ جمال الدین افغانی سے جا ملتا ہے۔والد کا تعلق مدینہ سے تھا جنھوں نے ہندستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی پھر جامعہ ازہر چلے گئے۔چودہ سال کی عمر میں علوم مشرقی کا تمام نصاب مکمل کر لیا تھا۔اُنھوں نے پندرہ سال کی عمر میں ماہ وار جریدہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔1914ء میں 'الہلال' نکالا۔مولانا بہ یک وقت عمدہ انشا پرداز، جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی اور ایک بہترین مفسر تھے۔آزاد، ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ان کے یوم پیدائش پر یوم تعلیم منایا جاتا ہے۔ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب کئے گئے تعلیمی اور سرکاری اداروں میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدر آباد، مولانا آزاد نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (بھوپال)، مولانا آزاد میڈیکل کالج (نئی دہلی)، مولانا آزاد انسٹیٹیوٹ آف ڈینٹل سائنسز (نئی دہلی)، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (نئی دہلی) شامل ہیں۔بھارت کے عظیم لیڈروں میں مولانا کا شمار ہوتا ہے۔انڈین نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لیڈر کے عہدہ کے ساتھ ساتھ پارٹی کے قومی صدر بھی کئی مرتبہ منتخب ہوئے۔مولانا آزاد ''تحریک عدم تعاون'' اور ''ہندستان چھوڑو تحریک'' میں شامل رہے۔آزاد، اُردو کے اہم صاحب اسلوب اُدبا میں شمار ہوتے ہیں۔اُنھوں نے 22 فروری 1958ء کو دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف: غبار خاطر۔ارکان اسلام۔اسلام میں آزادی کا تصور۔اُم الکتاب۔انسانیت موت کے دروازے پر۔ایمان اور عقل۔تحریک آزادی۔تحریک نظم جماعت۔جامع الشواہد۔فی دخول غیر المسلم فی المساجد۔حقیقت الصلوۃ۔حقیقت حج۔حقیقت زکوۃ۔خطبات آزاد۔رسول رحمت۔آزادی ہند (ترجمہ)۔

نمونہ کلام: ''زندگی کے بازار میں جس نے مقاصد کی بہت سی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں۔یہ اپنی کھوئی ہوئی تن درستی ڈھونڈ رہا ہوں۔معالجوں نے وادی کشمیر کی گل گشتوں میں سراغانی کا مشورہ دیا تھا۔چناں چہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلبرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔'' (غبار خاطر)

تحریر: آصف فلک

جگر مراد آبادی
1890ء تا 1960ء
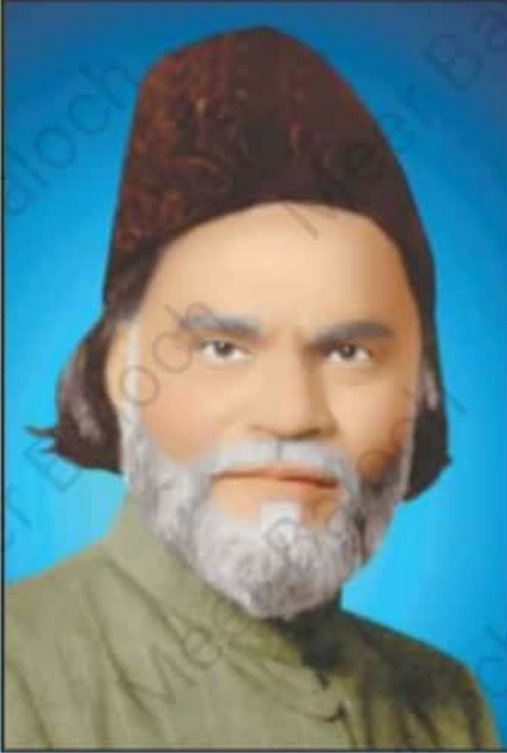
اصل نام علی سکندر تھا اور ''جگر'' تخلص استعمال کرتے تھے، مراد آباد کے باشندے ہونے کی وجہ سے نام کے ساتھ مراد آبادی لکھا کرتے تھے اور اَدبی دنیا میں جگر مراد آبادی کے نام سے مقبول ہوئے۔ وہ 6 اپریل 1890ء کو ریاست اتر پردیش کے شہر مراد آباد میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان دہلی سے ہجرت کر کے مراد آباد آیا تھا۔ جگر کے مورثِ اعلا شاہجہان کے دربار سے وابستہ تھے۔ جگر، علما کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے والد مولوی علی نظر صاحب دیوان شاعر تھے۔ جگر کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی اور پھر مکتب میں مشرقی علوم کے حصول کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے اُنھیں چچا کے پاس لکھنؤ بھیج دیا گیا جہاں مشن ہائی سکول میں جگر نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ ایک چشمہ ساز کمپنی میں کام کرنے لگے اور اُنھیں شراب کی لت بھی لگ گئی تھی۔ اُن کو وحیدن نامی لڑکی سے عشق ہوا اور ان کی شادی نسیم سے ہوئی۔ شاعری میں آپ کے استاد رسا رام پوری تھے۔ وہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے مقبول ہوئے اور اُنھیں ''شہنشاہ متغزلین'' بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ شاعرِ فطرت اور شاعرِ محبت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اُن کی عشقیہ غزلیں ہی ان کی شہرت کا سبب بنیں۔ اُنھیں مشاعروں کے کامیاب ترین شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اُنھوں نے غزل میں خالص ہندستانی مزاج اور اشیا و مظاہر کو شامل کیا اور یہ سب کچھ نہایت سادہ زبان اور دل نشین انداز میں شاعری کی سلک میں پرو دیا۔ اُنھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی اور اُنھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اُن کی وفات 9 ستمبر 1960ء میں گونڈہ میں ہوئی۔

تصانیف: داغِ جگر۔ آتشِ گل۔ شعلۂ طور۔ کلیاتِ جگر۔ اضطراب۔ لمعاتِ طور۔

نمونہ کلام: یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ابتدائے عشق میں دنیا کی نظریں مجھ پہ تھیں — انتہا یہ ہے کہ تو نے بھی نہ پہچانا مجھے

ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق — صاحبانِ کتاب ہیں ہم لوگ

تحریر: ثمرہ شہزادی

دیوان سنگھ مفتوں
1890ء تا 1975ء

دیوان سنگھ مفتوں نے 4 اگست 1890ء کو حافظ آباد میں ایک کھتری سکھ خاندان میں جنم لیا۔ اُن کے والد کامیاب ڈاکٹر تھے جس کی وجہ سے گھر میں خوش حالی تھی۔ دیوان سنگھ کی عمر ابھی ایک ماہ تھی جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور رشتہ داروں نے اُن کی جائیداد پر قبضہ جما لیا۔ اُن کو بارہ برس کی عمر میں دکان پر نوکری کرنا پڑی اور یوں وہ صرف پانچویں تک تعلیم حاصل کر سکے۔ اُنھیں مطالعہ کا بہت شوق تھا جس کی وجہ سے لکھنے کی طرف بھی دھیان گیا۔ اُنھوں نے 1924ء میں دہلی سے اپنا ہفتہ وار با تصویر اخبار ''ریاست'' نکالا جو اپنے مواد اور ہیئت دونوں کے لحاظ سے اعلا پایہ کے انگریزی جرائد کا ہم سر تھا۔ اس اخبار کو اُردو صحافت میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مظلوموں اور دردمندوں کی آواز کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے لاتے تھے۔ اُن کا اخبار ''ریاست'' مظلوموں کی پناہ گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اردو صحافت میں آزادیِ رائے اور بے لاگ تنقید و احتساب کی ایک ناقابلِ فراموش روایت قایم کی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں مختلف کام سیکھے اور مختلف پیشے اختیار کیے۔ ساتھ ساتھ اُنھوں نے حصولِ علم کے لیے ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھا۔ لکھنے پڑھنے کا چسکا اُنھیں صحافت کے میدان میں لے آیا اور پھر وہ ساری عمر کے لیے صحافت کے ہی ہو کر رہ گئے۔ سید جالب دہلوی اور خواجہ حسن نظامی سے اُنھوں نے صحافت کے گُر سیکھے اور اپنی محنت اور تگ و دو سے اُنھوں نے صحافت میں تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیے۔ دیوان سنگھ مفتوں کی خودنوشت سوانحِ حیات ''ناقابلِ فراموش'' اُردو اَدب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اخبار ''ریاست'' کے گرویدہ تھے اور جب اُنھوں نے ''ناقابلِ فراموش'' پڑھی تو دیوان سنگھ سے ملاقات کی اور اُن کی کتاب اور اخبار دونوں کی تعریف کی۔ اُنھوں نے 24 جنوری 1975ء کو وفات پائی۔

تصانیف: ناقابلِ فراموش۔ جذباتِ مشرق۔

نمونہ کلام: اُن جوہریوں نے جب یہ سنا کہ ان کے خلاف ریاست بہاول پور میں مقدمہ قایم کیا گیا ہے اور ایجنٹ گورنر جنرل کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں تو ان بچاروں کے ہوش اڑ گئے۔'' (ناقابلِ فراموش)

تحریر: ابدال رضا

عبدالماجد دریابادی
1892ء تا 1977ء

مولانا عبدالماجد 16 مارچ 1892ء کو دریاآباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے 1912ء میں لکھنؤ سے فلسفہ میں بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے فلسفہ کے لیے ایم اے او کالج میں داخل ہوئے اور اس کے بعد وہ سینٹ سٹیفن کالج چلے گئے لیکن مالی بحران کی وجہ سے ڈگری مکمل نہیں کر سکے۔ انگریزی میں ان کی پہلی کتاب "سائیکولوجی آف لیڈرشپ" لندن سے 1913ء میں شایع ہوئی۔ پہلا مضمون اُردو روزنامہ "وکیل" امرت سر میں نوسال کی کم عمری میں شایع ہوا تھا اور اپنے آپ کو ایک عقلیت پسند کہا۔ عبدالماجد دریابادی کئی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ اُردو میں تفسیر مجیدی اور ایک آزاد تفسیر بھی لکھی۔ اُنھوں نے قرآن مجید کی انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی ایک جامع تفسیر لکھی۔ اُن کی انگریزی اور اُردو تفاسیر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ تفاسیر اسلام پر مسیحیت کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کو سامنے رکھتے ہوئے مدلل انداز میں لکھی۔ اُنھوں نے 1950ء میں اپنی کتاب "حکیم الامت" تصنیف کی۔ اُنھوں نے قرآن، سیرت، سفرناموں، فلسفہ اور نفسیات پر 50 سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ریڈیو پر گفت گو کی، میزبانی بھی کی اور بہت سی کتابوں کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ وہ 6 جنوری 1977ء کو بارہ بنکی میں وفات پاگئے۔

تصانیف: آپ بیتی۔ اکبرنامہ۔ مبارک سفر۔ ہم آپ۔ انشائے ماجد۔ اقبالیات ماجد۔ خطبات ماجد۔ خطوط ماجد۔ مبادی فلسفہ۔ اُردو کا ادیب اعظم۔ فلسفہ اجتماع۔ فلسفہ جذبات۔ مردوں کی سیمائی۔ مضامین عبدالماجد دریابادی۔ تفسیر قرآن تفسیر ماجدی۔ تفسیر القرآن۔ حکیم الامت۔ بشریت انبیا۔ وفیات ماجدی۔ جوہر اور ان کی شاعری۔ مبادی فلسفہ۔ معاصرین۔ نشریات ماجد۔ سیاحت ماجدی۔ سفر حجاز۔ تمدن اسلام۔ تاثرات دکن۔

نمونہ کلام: "کم علم معلموں نے اپنی سہولت و آسانی کے لیے چندگنی چنی دعاؤں کا دستور باندھ لیا ہے اور بیچارے حاجیوں کو یہ سمجھا اور ڈرا رکھا ہے کہ طواف کے وقت صرف وہی مخصوص دعائیں پڑھی جاسکتی ہیں۔"

تحریر: محمد رفیق

عطاءاللہ شاہ بخاری
1892ء تا 1961ء
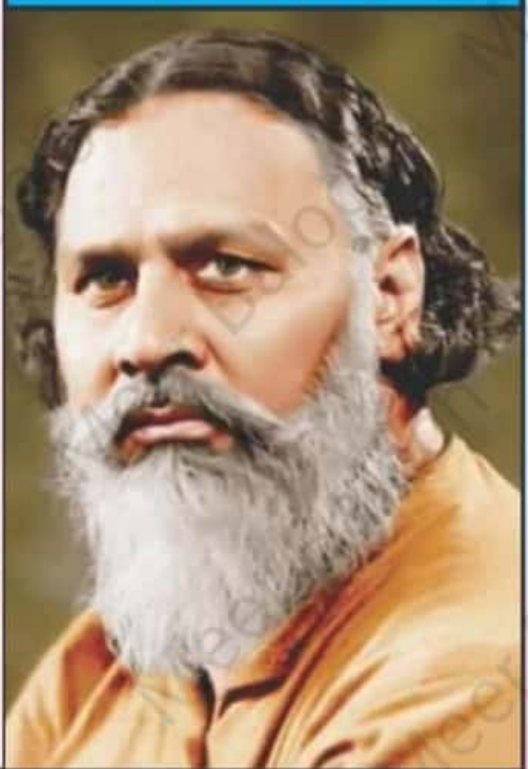
سید عطاءاللہ شاہ بخاری 23 ستمبر 1892ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں آپ کی والدہ وفات پاگئیں۔ ندیم تخلص تھا۔ کسی باقاعدہ مدرسے کے طالب علم نہیں تھے۔ آپ کی بیٹی صادقہ بانو نے لکھا ہے کہ اباجی نے فارسی کتابیں ننھیال میں ہی پڑھیں۔ دینی تعلیم خواجہ عنبر کی مسجد میں ایک مولوی صاحب سے حاصل کی۔ قرآن پاک دادا حافظ ضیاالدین سے حفظ کیا۔ مولانا نور احمد سے تفسیر قرآن پڑھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسن سے حدیث پڑھی۔ 1915ء میں سید مہر علی شاہ آف گولڑہ شریف کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ پہلے تحریک خلافت کے خلاف تھے لیکن بعد میں سید داؤد غزنوی کے دلائل سے قائل ہو کر اس تحریک کے حامی بن گئے جس میں ان کی خطابت نے جان ڈال دی۔ اُن کی زندگی سادگی، فقر و درویشی، صبر و تحمل اور عفو و درگزر سے عبارت تھی۔ غیبت سے سخت نفرت تھی۔ آپ جفاکش اور دلیر تھے۔ واقعہ جلیاں والہ باغ کے نتیجہ میں آپ نے مولوی داؤد غزنوی کے جواب میں تقریر کی اور وہاں سے آپ نے سیاست میں قدم رکھا۔ ایک سوشلسٹ نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید میں تھا سوال کیا کہ شاہ جی! آپ نے کبھی نماز ترک نہیں کی اور نہ کبھی روزہ چھوڑا پر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں ہے؟ شاہ جی مسکرائے، فرمایا بھائی! جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ امیر شریعت کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔ عربی فارسی، اُردو، پنجابی اشعار از بر تھے۔ قدرت نے آپ کو خطابت کا بے پناہ ملکہ ودیعت کیا ہوا تھا اُردو کے بہترین مقرر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُنھیں اُردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ وہ 21 اگست 1961ء کو ملتان میں وفات پاگئے۔

تصنیف: سواطع الالہام۔

نمونہ کلام:

دن کو پوجو، رات کو پوجو — رنگ برنگی دھات کو پوجو
مٹی پتھر پات کو پوجو — ایک نہ پوجو سارے کو پوجو

تحریر: عائشہ پروین

چودھری افضل حق
1893ء تا 1942ء

چوہدری افضل حق 1893ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چوہدری امیر خاں تھا۔ امرتسر کے اسلامیہ ہائی سکول، اسلامیہ کالج لاہور اور دیال سنگھ کالج لاہور کے طالب علم رہے۔ اپنی علالت اور بڑے بھائی کی اچانک وفات کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ 1917ء میں بطور انسپکٹر بھرتی ہوئے 1921ء میں مستعفی ہو کر کارکنانِ قومی کی صف میں شامل ہو گئے۔ پہلی بار ترکِ موالات کے سلسلے میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ کی سزا پائی۔ ہوشیار پور اور جالندھر رہے۔ دوسری بار گرفتاری ہوئی تو ابوالکلام آزاد نے آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ گاندھی کی سول نافرمانی تحریک میں شمولیت کی وجہ سے آپ کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ 1932ء میں رہا ہوئے تو فوراً مرتد قادیانیوں کے خلاف سرگرم ہوئے۔ 1932ء میں تحریک کپورتھلہ میں حصہ لیا۔ پنجاب اسمبلی کا الیکشن لڑا، مجلس احرار کے صدر رہے، دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں فوجی بھرتی کے خلاف تحریک میں چوتھی بار گرفتار ہوئے اور 1940ء میں راولپنڈی جیل سے رہا ہوئے۔ 1941ء میں سیاسی سرگرمیوں میں پھر مصروف ہو گئے۔ چوہدری افضل حق کو "زندگی" سے بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ زندگی کے دیباچے میں انہوں نے قید کی تنہائیوں کا واحد مشغلہ بھی قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد دراصل لوگوں میں زندگی کا شعور پیدا کرنے کی سعی ہے۔ "میرا افسانہ" میں آپ نے جیل کے حالات کو بیان کیا ہے۔ جنوری 1942ء میں ان پر ٹائیفائیڈ کا حملہ ہوا جس کے بعد یرقان اور نمونیہ نے حملہ کیا اور 8 جنوری 1942ء کو دفتر مجلس احرار بیرون دہلی دروازہ، لاہور میں آپ کا انتقال ہوا۔

تصانیف: زندگی۔ جواہرات۔ معشوقہ پنجاب۔ شعور (ڈرامہ)۔ دیہاتی رومان۔ آزادیٔ ہند۔ دین اسلام میرا افسانہ۔ تاریخ احرار۔ پاکستان اور اچھوت۔ محبوب خدا۔ خطوط افضل حق۔ مقالات و خطبات۔ اسلام میں امرا کا وجود نہیں۔ اسلام اور سوشلزم۔

نمونہ کلام: "رات ہو گئی کھانا کھایا، اس مست شباب نے ساز کے تاروں کو چھیڑا، برقی قمقمے کی روپہلی شعاعیں اس کے خوب صورت بربط پر تڑپ رہی تھیں" (زندگی)

تحریر: سونیا نیاز

غلام رسول مہر
1893ء تا 1971ء

غلام رسول مہر 13 اپریل 1893ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ جالندھر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم اسلامیہ کالج لاہور مکمل کی۔ آپ نے ملازمت کے سلسلہ میں حیدر آباد دکن میں کافی وقت گزارا جہاں سیاسی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے شاعری بھی شروع کی لیکن اس سے زیادہ نثر نگاری کو ترجیح دی۔ اس کے بعد آپ لاہور چلے آئے اور اپنی بقیہ زندگی لاہور شہر میں گزاری۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی صحافت کا آغاز "زمیندار" نامی اخبار سے کیا پھر آپ نے عبدالمجید سالک کے ساتھ مل کر ایک نیا اخبار روزنامہ "انقلاب" نکالا۔ مولانا اس اخبار سے اس کی بندش 1949ء تک وابستہ رہے۔ روزنامہ "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد آپ نے اپنی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ آپ نے مذہب، تاریخ، سیاست، تہذیب، تمدن، اَدب اور سیرت نگاری پر 100 سے زیادہ کتب یادگار چھوڑیں۔ وہ ایک مورخ، صحافی، مترجم، نقاد، ماہر اقبالیات اور ماہر غالبیات تھے۔ اُن کے اَدبی کارنامے اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ نے 16 نومبر 1971ء کو لاہور میں وفات پائی اور مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

تصانیف: تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا)۔ طبقات ناصری (ترتیب)۔ خطوط غالب (ترتیب)۔ سرودِ رفتہ۔ سید احمد شہید۔ سرگزشت مجاہدین۔ جزیہ اور اسلام۔ تاریخ پاکستان و ہند۔ نوائے سروش (مکمل دیوان غالب مع شرح)۔ فہرست معلومات گیلانی۔ تاریخ پاکستان۔ دیوان غالب عکسی۔ غالب۔ مطالب ضرب کلیم۔ مطالب بانگ درا۔ مطالب اسرار و رموز۔ مطالب بال جبریل۔ تاریخ تہذیب۔ سکندرِ اعظم۔ قسطنطنیہ۔ جنگ عظیم۔ تخلیق۔ فکر سلیم۔ ذہن انسانی کا ارتقا۔ جماعت مجاہدین۔ طیاروں کی پہلی کتاب (ترجمہ)۔ بہتر نگرانی، بہتر مدارس (ترجمہ)۔ ترکی، سرزمین اور باشندے (ترجمہ)

نمونہ کلام: "اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ غالب نے انگریزی ناولوں کو سنا ہو لیکن یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دو چیزیں کلکتہ میں ترجمہ ہو کر چھپ چکی تھیں، ایک مجتہدانہ ذوق رکھنے والی طبیعت ان سے نتائج اخذ کر سکتی تھی۔"

تحریر: حافظ محمد زبیر

مسعود حسن رضوی ادیب
1893ء تا 1975ء

مسعود حسن رضوی ادیب کی پیدائش 29 جولائی 1893ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ اُن کا نام محمد مسعود رکھا گیا لیکن ہائی سکول میں پہنچنے تک اُنھوں نے اپنا نام تبدیل کر لیا اور اپنا سید مسعود حسن رکھ لیا، جس میں رضوی اور پھر بعد میں ادیب کا اضافہ ہوا۔ اَدب سے ان کی دل چسپی سکول کے زمانہ ہی سے تھی کیوں کہ اُنھوں نے ایک بیاض تیار کی جس کا عنوان تھا "اشعار برائے بیت بازی" یہ ان کی پہلی تالیف تھی جو صرف تیرہ برس کی عمر میں تیار ہوئی جس وقت وہ پانچویں درجے کے طالب علم تھے۔ وہ بیت بازی کے مقابلوں میں تنہا، پوری جماعت کو ہرا دیا کرتے تھے۔ مسعود حسن رضوی ادیب 60 برس تک لکھتے پڑھتے رہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب بھی ہیں نقاد بھی، محقق بھی ہیں مرتب بھی، مولف بھی ہیں، اور حاشیہ نگار بھی، شاعر بھی ہیں اور ماہر قواعد زبان بھی، غرض ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جہتیں خاصی پھیلی ہوئی ہیں اپنے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کی بہ دولت وہ تحقیق وتنقید میں ہی ایک داستان ہیں۔ تنقید میں اعتدال وتوزن اور تحقیق میں تعمیری رویہ ان کے ہاں موجود ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو ڈراما اور سٹیج کے ابتدائی دور کی مفصل تاریخ ہے جس میں اُنھوں نے اُردو ڈرامے کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے امانت کی "اندر سبھا" اور واجد علی شاہ کی کتابوں کی بھی تدوین کی ہے۔ میر تقی میر پر ان کا کام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا 29 نومبر 1975ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

تصانیف: ہماری شاعری۔ رزم نامہ انیس۔ تاریخ مرثیہ۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ آئینۂ سخن فہمی۔ انیسیات۔ اسلاف میر انیس۔ عزیز لکھنوی حیات اور کارنامے۔ فرہنگ امثال۔ لکھنؤ کا عوامی سٹیج۔ امانت اور اندر سبھا۔ لکھنؤ کا شاہی سٹیج۔ لکھنؤیاتِ ادیب۔ نگارشات ادیب۔ اُردو ڈراما اور سٹیج ابتدائی دور کی مفصل تاریخ۔ واجد علی شاہ۔ اُردو زبان اور اس کا رسم خط۔

نمونہ کلام: "میر انیس قریب قریب ساری رات جاگتے تھے۔ نماز صبح پڑھ کر آرام کرتے تھے۔ کوئی نو بجے سو کر اٹھتے تھے۔ دس گیارہ بجے کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد میر مونس اور میر نفیس کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔"

تحریر: حافظہ سدرہ منظور

عبدالمجید سالک
1894ء تا 1959ء

عبدالمجید سالک 12 ستمبر 1894ء کو بٹالا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بٹالا اور پٹھان کوٹ میں حاصل کی اور پھر اینگلو عربک کالج سے تکمیل علم کی۔ 1912ء میں ان کی شادی ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور یہاں ریلوے اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے۔ اُنھوں نے 1914ء میں رسالہ "فانوس خیال" جاری کیا۔ 1915ء سے 1920ء تک وہ ماہنامہ "تہذیب نسواں"، ماہنامہ "پھول" اور ماہنامہ "کہکشاں" کے مدیر رہے۔ 1920ء میں وہ روزنامہ "زمیندار" کے عملہ ادارت میں شامل ہوئے۔ 1927ء میں اُنھوں نے مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ "انقلاب" جاری کیا۔ اُنھوں نے مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر صحافتی سطح پر بڑی کامیابیاں حاصل کیں اور اُردو صحافت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ وہ اس سے 1949ء میں اس کے اختتام تک وابستہ رہے۔ وہ روزنامہ "انقلاب" میں ایک کالم "افکار و حوادث" کے نام سے لکھا کرتے تھے جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔ مختلف رسائل میں ان کے افسانے، مقالات اور نظمیں "گمنام" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی خود نوشت "سرگزشت" کے نام سے لکھی۔ وہ ایک مشہور شاعر، کالم نگار، صحافی، مصنف اور عمدہ افسانہ نگار تھے۔ اس کے ساتھ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھے۔ اُن کا لگاؤ نظم کی طرف زیادہ تھا۔ شعر گوئی، اَدب، تنقید اور صحافت ان کے مشاغل رہے تھے۔ اُن کے شعری مجموعے کا نام "رہ و رسم منزلہا" ہے۔۔ عبدالمجید سالک 27 ستمبر 1959ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ لاہور کے مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

تصانیف: میراث اسلام۔ مسلم ثقافت ہندستان میں۔ ذکر اقبال۔ یاران کہن۔ سرگزشت۔ رہ و رسم منزلہا۔ چمپا اور دوسرے افسانے۔ تشکیل انسانیت۔ تاریخ بھی مزے کی چیز ہے۔ انڈونیشیا اور اس کے لوگ۔ امداد باہمی۔ بوڑھا بگولا۔ خودکشی کی انجمن۔ ایجادات۔ کاریگری۔ آئین حکومت ہند۔

نمونہ کلام:

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے ۔۔۔ چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے ۔۔۔ تمہی ہو گے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

تحریر: محمد عرفان

جوش ملیح آبادی
1894ء تا 1982ء

جوش ملیح آبادی کا اصل نام شبیر حسن خان ہے۔ جوش تخلص اور اپنے وطن ملیح آباد کی نسبت سے ملیح آبادی کہلائے۔ جوش 5 دسمبر 1894ء کو پیدا ہوئے۔ جوش ملیح آبادی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ جوش کے یہاں انقلاب کا نعرہ سب سے نمایاں تھا ان کی شاعری میں ترقی پسندیت زیادہ تھی۔ اُردو ادب کے نام ور اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم ہند کے چند برسوں بعد ہجرت کر کے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جوش نہ صرف اپنی زبان اُردو میں یدطولیٰ رکھتے تھے بل کہ عربی، فارسی ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ 1955ء تک وہ ہندستان میں مقیم رہے پھر اس کے بعد بہتر روزگار کی تلاش میں آپ نے پاکستان ہجرت کی۔ 1943ء تک فلموں میں بھی طبع آزمائی کی اور فلم انڈسٹری کے لیے گانے اور مکالمے لکھے۔ جوش مروت میں ایک ملازمت کے لیے کئی لوگوں کی سفارش کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص کی سفارش کے لیے اُس شخص کے ہمراہ گئے افسر نے کہا کہ اس کے لیے تو آپ نے کسی اور کی سفارش کی ہے فرمایا کہ اس مردود کو رکھ لیجیے کیوں کہ مجھے ساتھ لایا ہے۔ آپ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی تھے۔ آپ نے اُردو لغت کی ترتیب و تالیف میں بھر پور علمی معاونت کی نیز آپ نے انجمن ترقی اُردو کراچی اور دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ آپ کو ہندستان میں 1954ء میں پدم بھوشن انعام سے نوازا گیا اور بعد از وفات 2013ء میں پاکستان کے اعلا ریاستی اعزاز ہلال امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ 22 فروری 1982ء کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔

تصانیف: شعلہ و شبنم۔ جنون حکمت۔ فکر و نشاط۔ سنبل و سلاسل۔ حرف و حکایت۔ سرود و خروش۔ عرفانیات جوش۔ یادوں کی برات۔ روح اَدب۔ آواز حق۔ شاعر کی راتیں۔ نقش و نگار۔ پیغمبر اسلام۔ حسین اور انقلاب۔ آیات و نغمات۔ عرش و فرش۔ رامش و رنگ۔ مقالات جوش۔ اوراق زریں۔ جذبات فطرت۔ اشارات۔

نمونہ کلام:
اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی — وہ آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا
حوصلے سرنگوں امیدیں شل — آرزو بار یاس سے بوجھل

تحریر: شازیہ انجم

رشید احمد صدیقی
1894ء تا 1977ء

رشید احمد صدیقی 24 دسمبر 1894ء میں گاؤں مڑیا ضلع جونپور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے کانپور میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا لیکن ان کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق مزید بڑھ گیا۔ کچہری میں ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے اور ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ رشید احمد صدیقی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد رشید احمد صدیقی علی گڑھ چلے گئے اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر اور بعد ازاں صدر شعبہ رہے۔ آپ نے ساری زندگی علی گڑھ میں ہی گزاری۔ اُن کی زیادہ وابستگی طنز و مزاح کے ساتھ تھی۔ اکبر کے بعد اُردو میں طنزیاتی روح سب سے زیادہ رشید احمد صدیقی کے ہاں ہے۔ رشید احمد صدیقی کو اعلا درجے کا مزاح نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ طنز و مزاح سے بے ساختگی اس طرح سلب کر لیتے ہیں کہ ان سے صرف خواص کا زمرہ ہی لطف اٹھا سکتا ہے۔ اگرچہ مزاح اور مذاق کے اعتبار سے صدیقی صاحب مزاح نگار ہیں تاہم ان کے ہاں طنزیہ اشارات بھی ملتے ہیں۔ ان کے موضوعات اور مضامین پر علی گڑھ کے ماحول کا اثر نمایاں ہے۔ وہ قول محال کے ماہر ہیں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ ان کے طنز میں تلخی اور زہرناکی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ کسی واقعے سے متعلق اپنے ذاتی جذبات اور احساسات کو طنزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا شمار بیسویں صدی کے اہم مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے 15 جنوری 1977ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔

تصانیف: آشفتہ بیانی میری۔ علی گڑھ: ماضی و حال۔ انحراف۔ گنج ہائے گرانمایہ۔ خنداں۔ مضامین رشید۔ طنزیات و مضحکات۔ اُردو طنز و مزاح کی تنقیدی تاریخ۔ ہم نفسان رفتہ۔ جدید غزل۔ غالب کی شخصیت اور شاعری۔

نمونہ کلام: ''علی گڑھ بھی عجیب جگہ ہے یہاں اونٹ کروٹ نہیں لیتا بل کہ کروٹ اونٹ کا انتخاب کرتی ہے''۔
''اس زمانے میں لوگ اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی بیویوں کو آرٹ سمجھتے تھے''

تحریر: صدف انور

قاضی عبدالودود
1896ء تا 1984ء

قاضی عبدالودود نے 8 مئی 1896ء کو بہار میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ اور پٹنہ سے حاصل کی اور اعلا تعلیم کے حصول کے لیے 1923 میں انگلستان چلے گئے۔ وہاں معاشیات میں اعلا تعلیم کے بعد بیرسٹری بھی پاس کی۔ اُن کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ وہ مطالعے کے بہت شوقین تھے اور فرصت کے لمحات بھی ان کی دسترس میں تھے۔ اس لیے خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ سے جڑ گئے۔ اُنھوں نے کلاسیکی شعرا کے دواوین خصوصی طور پر میر، انشا، مصحفی، جرات اور سودا کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اُنھیں اُردو تحقیق کا معلم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کے مضامین ''معاصر'' پٹنہ سے چھپے اور اُنھوں نے خود بھی ایک رسالہ ''معیار'' انجمن ترقی اُردو کی جانب سے 1936ء میں جاری کیا۔ وہ تحقیق میں معیار کی بلندی کے قائل تھے۔ جب تک چھان بین مکمل نہیں کر لیتے تھے تب تک قلم اٹھانا بھی عیب عظیم سمجھتے تھے۔ وہ ایک بت شکن محقق تھے۔ وہ بڑے بڑے لوگوں کے فروگزاشتوں کو آشکار کرنے میں کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ قاضی صاحب راست گو، بے باک، اور حق پسند انسان تھے اور یہی باتیں ان کے تحقیقی میدان میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔ اُن کی سہل پسندی سے کبھی نہ بنی۔ اُنھوں نے سہل پسند محققین کی آنکھیں کھولیں کہ محنت شاقہ ہی تحقیق کا پہلا تقاضا ہوتی ہے۔ اُن کا انتقال 25 جنوری 1984ء کو بہار میں ہوا۔

تصانیف: آوارہ گرد اشعار۔ چند اہم اخبارات و رسائل۔ اشتر و سوزن۔ عیارستان۔ دردو سودا۔ دیوان رضا عظیم آبادی۔ فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ۔ فارسی شعر و ادب۔ چند مغالطے۔ گارساں دتاسی۔ غالب بہ حیثیت محقق۔ غالب کی راست گفتاری۔ جہان غالب۔ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں۔ کچھ غالب کے بارے میں۔ کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں۔ میر۔ محمد حسین آزاد بہ حیثیت محقق۔ شعرا کے تذکرے۔ تبصرے۔ تعیین زمانہ۔ تحقیقات ودود۔ اُردو میں اَدبی تحقیق کے بارے میں۔ زبان شناسی اُردو فارسی۔ اُردو شعر و ادب، چند مغالطے۔

نمونہ کلام: ''رات کو کوئی دو سو چور تلواریں لیے اس محلے میں آئے اور ان میں سے بعض تیلن کے مکان میں داخل ہوئے۔ اس کا جوان لڑکا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔'' (عیارستان)

تحریر: ابدال رضا

فراق گورکھپوری
1896ء تا 1982ء

رگھوپتی سہائے المعروف بہ فراق گورکھ پوری 28 اگست 1896ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ جدید شاعری میں فراق گورکھپوری کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ بہترین شخصیت کے مالک تھے حاضر جوابی میں بھی ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بین الاقومی اَدب سے بھی شغف تھا۔ تنقید میں رومانی تنقید کی ابتدا فراق سے ہوئی۔ فراق، انڈین سول سروس کے لیے منتخب ہوئے لیکن گاندھی کی تحریک عدم تعاون کی وجہ سے استعفا دے دیا جس کی پاداش میں اُنھیں جیل جانا پڑا۔ اس کے بعد وہ الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی زبان کے استاد مقرر ہوئے۔ یہاں پر اُنھیں زندگی کی حقیقتوں سے مزید آگاہی ملی۔ آپ کی شہرہ آفاق کتاب ''گل نغمہ'' کو ہندستان کا اعلا معیار اَدب گیان پیٹھ انعام بھی ملا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر بھی رہے۔ بطور شاعر اُنھوں نے اُردو شاعری کی اہم اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی اور قطعہ میں طبع آزمائی کی۔ اُنھوں نے اُردو نظم کی ایک درجن سے زاید اور اُردو نثر کی نصف درجن سے زاید کتب ترتیب دیں ساتھ ہی ساتھ انگریزی اَدبی و ثقافتی موضوعات پر چار کتابیں بھی تحریر کیں۔ فراق گورکھ پوری نے شاعری کے تنقیدی شعور کو پہلی مرتبہ زبان عطا کی۔ اُنھیں بہت سے جدت پسندوں سے زیادہ جدید شمار کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے مضامین میں غالب، حالی، ذوق، داغ، حسرت جیسے شعرا کی باز یافت کی۔ اُنھیں 1960ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، 1968ء میں پدم بھوشن اور سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، 1969ء میں پہلا گیان پیٹھ انعام اور 1981ء میں غالب اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فراق کا انتقال طویل علالت کے بعد 3 مارچ 1982ء کو ہوا۔ میت الہ آباد لے جائی گئی جہاں گنگا اور جمنا کے سنگم پر نذر آتش کیا گیا۔

تصانیف: گل نغمہ۔ گل رعنا۔ مشعل۔ روح کائنات۔ روپ۔ شبنمستان۔ سرگم۔ شعلہ ساز۔ اندازے۔ حاشیے اُردو کی عشقیہ شاعری۔ اُردو غزل گوئی۔

نمونہ کلام:

آج تک صبح ازل سے وہی سناٹا ہے
عشق کا گھر کبھی شرمندہ مہماں نہ ہوا

آج آغوش میں تھا اور کوئی
دیر تک ہم تجھے نہ بھول سکے

تحریر: علی رضا

رام بابو سکسینہ
1896ء تا 1957ء

رام بابو سکسینہ 27 ستمبر 1896ء کو فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے 1918ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔ 1922ء میں مہاراجہ بڑودا کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے جب کہ 1927ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ممبر بنے۔ اُردو کی اَدبی تاریخ نگاری کی ابتدا بے ضابطہ تذکروں سے ہوئی پھر نظم اور نثر کی الگ الگ تاریخیں لکھی گئیں لیکن اُردو اَدب کی پہلی جامع اور باقاعدہ تاریخ 1924ء میں بیوروکریٹ، نقاد اور محقق رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں لکھی تاکہ انگریزی دان طبقہ اُردو اَدب کی تاریخ سے واقفیت حاصل کر سکے۔ رام بابو سکسینہ کی تصانیف میں سے سب سے زیادہ مقبولیت اسی "اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر" کو حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ 1927ء میں "تاریخ اَدب اُردو" کے نام سے مرزا محمد عسکری نے کیا۔ رام بابو سکسینہ انگریزی تاریخ نگاری سے متاثر تھے لیکن ان کی تنقید کا اسلوب مشرقی اور جمالیاتی ہے۔ اُن کی اس تاریخ کا شمار اُردو کی چند اہم تواریخ میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ابتدائے اُردو سے لے کر علامہ محمد اقبال تک کے عہد کی نظم و نثر پر محیط ہے۔ اُنھوں نے اُردو زبان کی تاریخ کا جامع خاکہ پیش کرتے ہوئے شعرا اور اُدبا کے سوانحی حالات اور ان کے کلام و تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف اُردو اَدب کی تاریخ بیان کی گئی ہے بل کہ اَدبی تاریخ نویسی کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ رام بابو سکسینہ 21 دسمبر 1957ء کو انتقال کر گئے۔

تصانیف: A History of Urdu Literature، European & Indo European Poets of Urdu & Persian، A History of Indian Literature۔ پیامِ آخر۔ اوراقِ پریشاں۔ مثنویاتِ میر بہ خطِ میر۔ مرقعِ شعرا۔

نمونہ کلام: "حالی کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی جب کہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور انھی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔"

تحریر: محمد عمران الحسن

افسر صدیقی امروہوی
1896ء تا 1984ء

افسر صدیقی امروہوی 9 ستمبر 1896ء بروز بدھ کو امروہہ اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام منظور احمد صدیقی تھا۔ اُن کے جدِ اعلا، نوازش ولی عرف نواز صدیقی، 1713ء میں دہلی سے امروہہ آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ افسر کے والد کا نام شمس الدین تھا۔ میر فضل حسین سعید امروہوی سے تعلیم کی ابتدا کی۔ مختلف اساتذہ سے اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُردو مڈل، اُردو ٹریننگ اور ہندی مڈل کے امتحانات پاس کیے۔ فارسی، سندھی، انگریزی اور پنجابی زبانیں حسبِ ضرورت جانتے تھے۔ وہ شاعری میں مضطر خیر آبادی اور شوق قدوائی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ 1927ء میں کراچی منتقل ہو گئے اور اسی شہر میں باقی زندگی بسر کی۔ 1935ء میں اُنھوں نے ماہ نامہ "تنویر" جاری کیا جس نے کئی موضوعات پر خاص نمبر شایع کیے۔ 1962ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان سے وابستہ ہو گئے اور قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست کی تیاری پر مامور ہوئے۔ قدیم کلاسیکی متون کی تدوین اور فرہنگ سازی کے حوالے سے افسر صدیقی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اُنھوں نے انجمن ترقی اُردو کراچی میں مولوی عبدالحق کی زیرِ نگرانی متعدد کلاسیکی کتب کو مدون کر کے مبسوط دیباچے لکھے اور اُنھیں شایع کروایا۔ وہ ایک شاعر، محقق، مترجم اور صحافی تھے۔ اُن کی شاعری میں روانی اور تسلسل کا بہترین نمونہ اور انداز نظر آتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اُنھوں نے 9 فروری 1984ء کو کراچی میں وفات پائی اور سخی حسن کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

تصانیف: رباعیاتِ افسر۔ برقِ تخیل۔ تابشِ خیال۔ شبابِ تخیل۔ سرمایۂ تغزل۔ عروس الاذکار۔ تذکرہ شعرائے امروہہ۔ ہادی انجمع۔ فیضانِ انیس۔ گلستانِ قمر۔ مصحفی حیات و کلام۔ بیاضِ مراثی۔ مخطوطاتِ انجمن ترقی اُردو۔ بدائع الشعرا۔ مثنوی عاقبت بخیر۔ مثنوی نوسرہار۔ جوزف ولمات (ناول)۔ تلامذہ مصحفی۔

نمونہ کلام:

ہم تو جنوں میں کہہ گئے جو منہ میں آ گیا — اب ایک ایک لفظ کو سمجھا کرے کوئی

قیدِ حیات چند نفس ہے زمانے میں — گزرے قفس کے گوشے میں یا آشیانے میں

تحریر: اللہ دتہ

رفیع پیرزادہ
1898ء تا 1974ء

رفیع پیرزادہ 21 مارچ 1898ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق گجرات کے ایک معزز پیر گھرانے سے تھا۔ سنٹرل ماڈل سکول اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ اُنھوں نے ڈرامے کی تربیت جرمنی میں پائی تھی اور بارہ سال تک جرمن سٹیج پر اداکاری کی۔ اُنھوں نے آل انڈیا ریڈیو لاہور سے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ آپ صداکار ہونے کے ساتھ ساتھ تمثیل نگار، اداکار اور ہدایت کار بھی تھے۔ رفیع پیرزادہ ریڈیو کے منجھے ہوئے صداکاروں کی کارکردگی سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے جب تک اسے ویسا بنا نہ دیں جیسا وہ چاہتے تھے۔ رفیع پیرزادہ تمثیل نگاری کے باب میں بڑے مشکل پسند واقع ہوتے تھے ان کے ڈراموں میں جو ضوابط اُنھوں نے اپنائے تھے وہ صرف انھی کی ذات سے مختص ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اپنے ڈراموں میں اونچے مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں کہیں بھی اس مقام سے نیچے نہیں اترتے۔ اُن کے مکالموں میں سطحیت نہیں ملتی، سستی جذباتیت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں ادیبانہ خلاقیت کا رنگ گہرا ہے۔ رفیع پیر کے ڈرامے ہمارے تمثیلی اَدب کا اہم حصہ ہیں اُردو ڈرامے کے ارتقا میں ایک تاب ناک باب کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔ قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں کے لیے متعدد کامیاب اور دل چسپ ڈرامے لکھے۔ وہ ریڈیو میں ڈرامے کے پہلے پروڈیوسر تھے جنھیں 1936ء میں ریڈیو ڈرامے کی تکنیک کی جان کاری کے لیے جرمنی بھیجا گیا تھا۔ پارسی تھیٹر کے زوال کے بعد جن مصنفین نے ڈرامے کو زندہ کرنے کی کوشش کی ان میں رفیع پیرزادہ کا نام نمایاں ہے۔ اُن کا انتقال 11 اپریل 1974ء کو ہوا۔

تصانیف: نقاب۔ موت سے ملاقات۔ سناٹا۔ راز و نیاز۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ ساحل۔ مارآستین۔ نواب صاحب قبلہ۔

نمونہ کلام: ''عورت: معلوم ہوتا ہے تمھیں اس محبت رفتہ کی بعض باتیں خود یاد ہیں۔
مرد: ہاں جیسے کل کی بات ہو نا ہید نے الوداع کہتے ہوئے مجھ سے پیمان کیا جب تک تم لوٹ کر نہیں آتے۔''

تحریر: لطیفہ رؤف

احمد شاہ بخاری پطرس
1898ء تا 1958ء
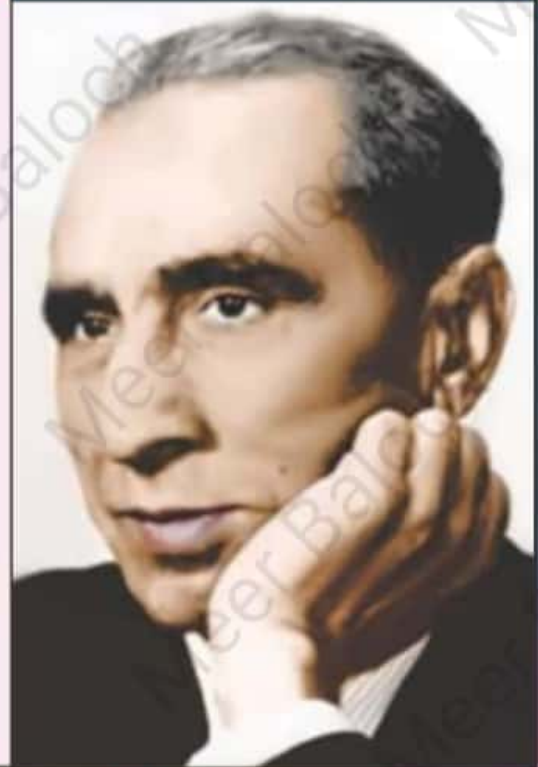
پطرس بخاری یکم اکتوبر 1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا پورا نام احمد شاہ بخاری جب کہ قلمی نام پطرس تھا جو سب سے پہلے رسالہ ''کہکشاں'' میں استعمال کیا گیا۔ اُنھوں نے قرآن کی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ نو سال کی عمر میں اُنھوں نے سکول کی تعلیم کا آغاز کیا اور مشن ہائی سکول پشاور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے کی ڈگری اسلامیہ کالج پشاور سے اور بی اے اور ایم اے کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج کے معروف مجلّے ''راوی'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے مسلمان پرنسپل بنے۔ اسی زمانے میں انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ان کے مضامین بھی چھپنے لگے۔ 1949ء میں اُنھیں اقوام متحدہ میں سفارتی ذمہ داریاں سونپی گئیں، بعد ازاں اُنھیں مستقل مندوب مقرر کر دیا گیا جہاں وہ شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ نیاز مندان لاہور کے بھی رکن رہے۔ اُنھیں اُردو زبان کے سب سے بڑے مزاح نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے بہت کم لکھا لیکن کمال لکھا۔ اُن کی شہرت کی وجہ ان کی تصنیف ''پطرس کے مضامین'' ہے۔ اُن کی مزاح نگاری کسی مقصد کی پابند نہیں اور نہ کسی اصلاحی نقطۂ نظر کے علمبردار ہیں۔ وہ دوسروں پر طنز کا کیچڑ اچھالنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی مزاح نگاری کو تمسخر اور طنز سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اُن کی مزاح میں شوخی اور لطافت کی پاکیزہ آمیزش ہے۔ وہ ایک نام ور مزاح نگار، شاعر، مترجم، نقاد، معلم، برطانوی ہندستان کے ماہر نشریات اور پاکستان کے سفارت کار بھی تھے۔ اُنھوں نے 5 دسمبر 1958ء کو نیویارک میں وفات پائی۔

تصانیف: پطرس کے مضامین۔ کلیات پطرس۔ پطرس کے خطوط۔ اقوام متحدہ میں تقاریر کا مجموعہ۔

نمونہ کلام: ''میں نے کہا آج کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔ کہنے لگے تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے۔ تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا، کیا کہا تم نے تین بجے ہیں۔ کہنے لگے تین......تو......نہیں کچھ سات ساڑھے سات......منٹ اوپر تین ہیں۔'' (پطرس کے مضامین)

تحریر: صنوبر بانو

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
1899ء تا 1978ء
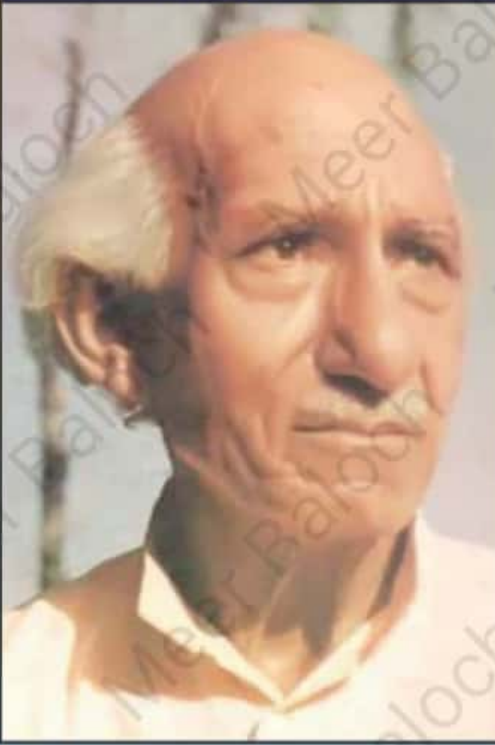
صوفی تبسم 4 اگست 1899 کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ 1920ء میں لاہور منتقل ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے فارسی کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں اُردو اور فارسی کے شعبوں کے صدر رہے۔ یہیں سے 1959ء میں ریٹائر ہوئے کچھ عرصہ پنجاب یونی ورسٹی میں بھی پڑھایا۔ 1962ء میں ہفت روزہ "لیل ونہار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لاہور کے ایرانی ثقافتی ادارے اور ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ صوفی تبسم نے غالب کے کلام کا منظوم ترجمہ کیا، دو جلدوں میں فارسی کلام غالب کی شرح تحریر کی اور امیر خسرو کے کلام کا بھی منظوم ترجمہ کیا جو "دوگونہ" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ صوفی تبسم نے بچوں کے لیے بہت لکھا لیکن بڑوں کے لیے بھی اُنھوں نے عظیم کارنامے سرانجام دیے۔ اُن کا ایک مشہور کردار ٹوٹ بٹوٹ ہے۔ 1965ء کی جنگ میں منفرد، جوشیلے اور پراثر "ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے" جیسے جنگی ترانے لکھے۔ صوفی تبسم نے علامہ اقبال کی زندگی میں ہی ان کی شاعری کے لیے بہت کام کیا جسے علامہ اقبال نے سراہا۔ 1976ء میں صوفی تبسم کو اقبال اکیڈمی کا نائب صدر مقرر کر دیا گیا اور آخری وقت تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اُنھوں نے دفتر زبان اُردو قائم کیا۔ صوفی تبسم کچھ عرصہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے سربراہ کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ اُردو، فارسی اور پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ وہ ہر میدان کے شہ سوار تھے، نظم ہو یا نثر، غزل ہو یا گیت، ملی نغمے ہوں یا بچوں کی نظمیں، کہاں کہاں ان کے نقوش باقی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے 7 فروری 1978ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: شرح غزلیات غالب فارسی۔ دوگونہ۔ جھولنے۔ نقشِ اقبال۔ یک ہزار و یک سخن۔ سرا پردہ افلاک۔ شرح صد شعر اقبال۔ انتخاب کلام اقبال۔

نمونہ کلام:

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ
کہاں میں اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ

تحریر: محمد ارسلان حسن

حفیظ جالندھری
1900ء تا 1982ء

حفیظ جالندھری، جالندھر میں 14 جنوری 1900ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ آپ نے باقاعدہ تعلیمی اسناد حاصل نہیں کی مگر اس کمی کو اُنھوں نے خود پڑھ کر پورا کیا۔ اُنھیں نامور فارسی شاعر مولانا غلام قادر گرامی کی اصلاح حاصل رہی۔ آپ نے ایک انگریز خاتون سمیت تین شادیاں کیں۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 1947ء میں لاہور آ گئے۔ حفیظ جالندھری پاک فوج میں ڈائریکٹر جنرل مورال، صدر پاکستان کے چیف ایڈوائیزر اور رائٹرز گلڈ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ آپ کی حب وطن کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ آپ نے افواج پاکستان میں شمولیت اختیار کی اور پھر آپ وطن کے حفاظت کی خاطر زخمی بھی ہوئے اس کے علاوہ آپ آزادی کشمیر کی جدو جہد میں صف اول میں کھڑے تھے اس مقصد کے لیے آپ نے کشمیری عوام کے لیے "وطن ہمارا آزاد کشمیر" نظم بھی لکھی۔ 1965ء کی جنگ کے دوران بہت سے ملی گیت اور نظمیں لکھیں۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری پاکستان کے اور اُردو زبان کے نام ور اور مقبول رومانوی شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ اس کے علاوہ وہ فلسفے پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ پاکستان کے قومی ترانے کے خالق ہیں جس کی وجہ سے آپ نے شہرت دوام پائی۔ حکومت پاکستان نے 14 اگست 1954ء کو اس کو پاکستان کے قومی ترانہ کے طور پر منظور کیا تھا۔ چار جلدوں میں "شاہنامہ اسلام" کے ذریعے اُنھوں نے اسلامی روایات اور قومی شکوہ کا احیا کیا جس پر اُنھیں "فردوسی اسلام" کا خطاب دیا گیا۔ آپ گیت، نظم اور غزل کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کو موسیقی سے لگاؤ تھا۔ آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔ حفیظ جالندھری نے 21 دسمبر 1982ء کو وفات پائی اور مینار پاکستان کے قریب دفن ہوئے۔

تصانیف: نغمہ زار۔ تلخابہ شیریں۔ سوز و ساز ہفت پیکر۔ ہندستان ہمارا۔ چراغ سحر۔ پھول مالی۔ حفیظ کی نظمیں۔ حفیظ کے گیت۔ بچوں کی نظمیں۔ چیونٹی نامہ۔ بہار کے پھول۔ شاہنامہ اسلام۔ بزم نہیں رزم۔ تصویر کشمیر

نمونہ کلام:

ابھی تو میں جوان ہوں
ابھی تو میں جوان ہوں
ہوا بھی خوش گوار ہے
گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنم ہزار ہے
بہارِ پُر بہار ہے

تحریر: آمنہ رشید

ہری چند اختر
1900ء تا 1958ء

پنڈت ہری چند اختر 15 اپریل 1900ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ایک معروف اُردو غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معروف صحافی بھی تھے۔ اُن کے اُردو کے استعمال میں روانی تھی۔ اُن کو فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ اُنھوں نے میٹرک کے بعد جلد ہی منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور بعد ازاں جامعہ پنجاب سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اُنھوں نے "پارس" لاہور کی ایک لمبے عرصے تک ادارت کی تھی جس کے مالک لالہ کرم چند تھے۔ وہ بھی پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے دفتر میں ملازم بھی تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ دہلی منتقل ہوئے تھے۔۔ پنڈت ہری چند اختر بنیادی طور پر روایتی شکل میں لکھتے تھے۔ اُن کی غزلیں سادگی اور روانی کے حوالے سے منفرد تھیں۔ "کفر و ایماں" کے عنوان سے غزلوں کا ایک مجموعہ ان کی زندگی کے دوران شائع کیا گیا تھا جس میں ان کا کافی کلام شامل تھا۔ اُن کی غزل پر کلاسیکی رنگ غالب ہے ہاں کہیں کہیں دور حاضر کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے جزوی طور پر ہی سہی کچھ نہ کچھ تجدد کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی نکتے کو شاعرانہ لطافت کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں مختلف نوعیت کے المیوں کی بہت زیادہ تعداد ہے جو ان کی ذات اور ان کے گرد و پیش میں موجود تھے۔ اُنھوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو نقادوں پر جم کر طنز کے تیر چلائے۔ پنڈت ہری چند اختر یکم جنوری 1958ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: حالی پانی پتی۔ کفر و ایماں۔

نمونہ کلام:

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا ... مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا
انھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے ... کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

اب آپ آ گئے ہیں تو آتا نہیں ہے یاد ... ورنہ ہمیں کچھ آپ سے کہنا ضرور تھا
شب غم وہم سنتا ہے صدائیں ... گماں ہوتا ہے کوئی آ رہا ہے

تحریر: اکبر خان

اے آر خاتون
1900ء تا 1965ء
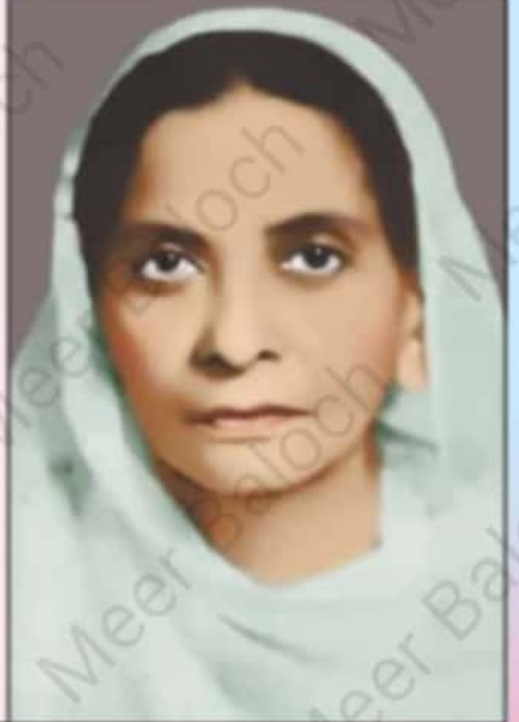
اے آر خاتون 1900ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا اصل نام امت الرحمٰن تھا۔ اُنھوں نے گھر میں رہ کر تعلیم بھی حاصل کی اور ساتھ ساتھ مضمون نگاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اُن کے مضامین رسالہ "عصمت" میں شائع ہوتے تھے۔ 1929ء میں اُنھوں نے اپنا پہلا ناول "شمع" تحریر کیا جو اپنے دل کش انداز تحریر کی وجہ سے بے حد پسند کیا گیا۔ اس ناول نے اُردو میں تانیثی ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اُن کا دوسرا ناول "تصویر" تھا۔ یہ ناول بھی بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد تو اے آر خاتون کے ناولوں کی قطار لگ گئی۔ افشاں، فاکہہ، چشمہ، ہالہ اور رمانہ ان کے ایسے ہی چند ناول ہیں جنھوں نے شائع ہوتے ہی دھوم مچا دی۔ اے آر خاتون کے ناولوں میں کہانی اور کردار میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ تاہم ان ناولوں میں برصغیر کے مسلمان معاشرے کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی بنتی بگڑتی صورت حال دکھائی دیتی ہے یہی ان کے ناولوں کا اختصاص بھی ہے اور مقبولیت کا سبب بھی ہے۔ چوں کہ اُنھوں نے تقسیم ہند اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس لیے ان کی تحریر میں ہجرت و فساد کے بے شمار موضوعات کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ اگر ان کے اسلوب کی بات کریں تو وہ سادہ، عام فہم اور دل کش ہے۔ اُن کی تحریر کو سمجھنے کے لیے عام قاری کو ذہنی ورزش نہیں کرنی پڑتی بل کہ وہ روانی سے اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان آ گئیں۔ اُن کے ناول پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی نشر کیے جا چکے ہیں جنھیں بے حد مقبولیت ملی جن میں افشاں، تصویر اور شمع قابل غور ہیں۔ اُن ناولوں کی ڈرامائی تشکیل فاطمہ ثریا بجیا نے دی۔ اُن کا انتقال 24 فروری 1965ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: افشاں۔ ہالہ۔ تصویر۔ شمع۔ چشمہ۔ رمانہ۔ فرحانہ۔ زیور۔ عصمہ۔

نمونہ کلام: "منصور تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہے۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اس وجہ سے ان لوگوں نے انھیں نہیں دیکھا۔ طاہرہ نے آہستہ سے کہا" یہاں چوروں کی طرح کیا دیکھ رہے ہو، وہیں چل کر دیکھ لینا۔ پہلے تو تمھیں یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔ اب کیوں پرائی لڑکی کو چھپ کر دیکھ رہے ہو۔" (شمع)

تحریر: عبدالحفیظ

امتیاز علی تاج
۱900ء تا 1970ء
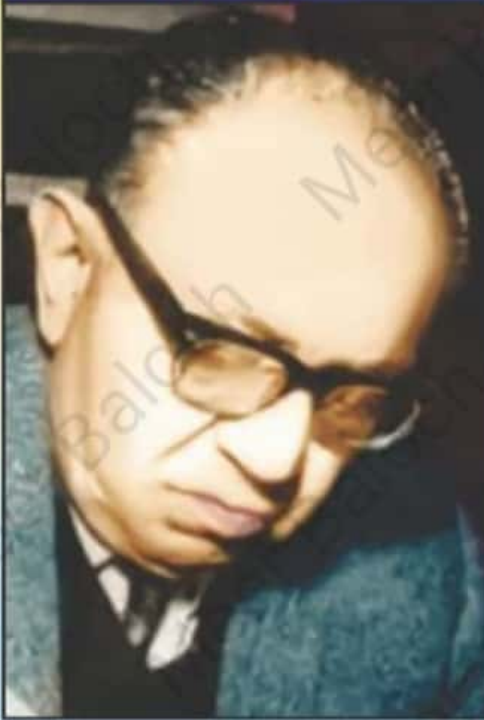
سید امتیاز علی تاج 13 اکتوبر 1900ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام سید ممتاز علی تھا جو ایک بلند پایہ مصنف تھے اور دارالاشاعت پنجاب کے مالک تھے۔ گھر میں خوش حالی اور ماحول علمی تھا۔ آپ کی والدہ محمدی بیگم خواتین کے لیے اخبار ''تہذیب نسواں'' کی مدیر تھیں۔ اُنھوں نے دو اصلاحی قصے ''شریف بیٹی'' اور ''آج کل'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ امتیاز علی تاج نے سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ڈراما نگاری کا شوق کالج میں پیدا ہوا۔ طالب علمی کے دور میں اَدبی رسالہ ''کہکشاں'' نکالنا شروع کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈرامیٹک سوسائٹی کے رکن رہے اور اَدب کا شاہ کار ڈراما ''انارکلی'' 1922ء میں لکھا۔ اُنھوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے اور بچوں کے لیے کتب بھی لکھیں۔ ''چچا چھکن'' ان کی مشہور تصنیف ہے، بچے بچے کی زبان پر چچا چھکن چچا چھکن آ گیا۔ اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیات زندگی کی ناہمواریوں کا بیان سادگی و سلاست، ماحول کی مناسبت سے کردار نگاری اور برمحل مکالمہ نگاری ہیں جو کہ کامیاب ڈرامے کی ضمانت ہوتی ہیں۔ وہ ڈراما نگار کے ساتھ ساتھ مزاح نگار بھی تھے۔ اُنھوں نے مزاح نگاری میں بھی اپنا الگ مقام حاصل کیا لیکن اُنھیں شہرت ڈراما نگاری کی وجہ سے ملی۔ مزاح نگاری میں اُنھوں نے زیادہ تر خود کو مزاح کا نشانہ بنایا اور کبھی شرم یا عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے انگریزی اور فرانسیسی ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اُنھیں حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز اور ڈرامے کے صدارتی اعزاز سے بھی نوازا۔ وہ مجلس ترقی اَدب لاہور کے ناظم رہے اور متعدد کتب شایع کیں۔ اُن کو 19 اپریل 1970ء کو لاہور میں قتل کر دیا تھا۔

تصانیف: انارکلی۔ غرناطہ۔ ہیبت ناک۔ آخری رات۔ پرتھوی راج۔ گونگی۔ بازارِ حسن۔ نکاحِ ثانی۔ قرطبہ کا قاضی (انگریزی ڈرامے کا ترجمہ)۔ خوشی (فرانسیسی ڈرامے کا ترجمہ)

نمونہ کلام: ''سلیم: لیکن دلآرام تم بھی یہ سمجھ کر غور کرنا۔ جو الزام تم انارکلی پر لگا رہی ہو وہ اب تم پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اگر تم کہہ سکتی کہ سلیم انارکلی کو چاہتا ہے تو سلیم کہہ سکتا ہے دلآرام سلیم کو چاہتی ہے۔'' (انارکلی)

تحریر: سونیا وحید

محمد دین تاثیر
۱902ء تا 1950ء

محمد دین تاثیر، اَدبی دنیا میں ایم ڈی تاثیر کے نام سے مشہور تھے۔ آپ 28 فروری 1902ء کو اجنالا ضلع امرت سر میں پیدا ہوئے۔ 1904ء میں آپ کے والدین نے وبائے طاعون میں انتقال کیا جس کے بعد آپ کی کفالت آپ کے خالو میاں نظام الدین رئیس لاہور نے کی۔ اُن کی اَدبی زندگی کا آغاز لڑکپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے روایت سے بغاوت کی اور مروجہ اسلوب سے ہٹ کر آزاد نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ایم اے کے بعد جامعہ پنجاب، لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ علامہ اقبال کی صلاح پر آپ انگریزی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے یونی ورسٹی آف کیمبرج گئے۔ تاثیر برصغیر سے وہ پہلے شخص ہیں جس نے انگلینڈ میں انگریزی اَدب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ 1935ء میں وطن واپس آنے کے بعد آپ ایم اے او کالج، امرت سر میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم تک مختلف عہدوں پر کام کیا۔ 1938ء کرسٹابیل جارج سے شادی ہوئی اور علامہ اقبال نے خود اس جوڑے کا نکاح نامہ تیار کیا۔ کرسٹابیل نے اسلام قبول کیا اور بلقیس تاثیر نام اپنایا۔ فیض احمد فیض کے ساتھ ساتھ آپ بھی ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ 1941ء میں سری نگر میں سری پرتاپ کالج کے پرنسپل بنے۔ 1942ء میں وہ نئے امر سنگھ کالج کے پرنسپل بنے جو سری پرتاپ کالج کی شاخ تھی۔ 1943ء میں اُنھیں حکومت ہند میں جنگ کی کوششوں میں مدد فراہم کی گئی۔ اُنھوں نے شملہ اور دہلی میں بھی کام کیا۔ 1947ء میں سری نگر گئے اور پھر پاکستان آ کر آزاد کشمیر کے محکمہ نشر و اشاعت کے انچارج ہو گئے۔ ہندستان کی تقسیم کے بعد آپ پاکستان ہجرت کر کے آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ایک شاعر، نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ اُن کا انتقال یکم دسمبر 1950ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: آتش کدہ۔ مقالاتِ تاثیر۔ کنول (ناول)۔

نمونہ کلام:

داورِ حشر مرا نامہ اعمال نہ دیکھ — اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
جس طرح ہم نے راتیں کاٹی ہیں — اس طرح ہم نے دن گزارے ہیں

تحریر: زبیر عبداللہ

محمودالظفر
1903ء تا 1956ء

محمودالظفر نے 1903ء میں رام پور میں آنکھ کھولی۔ اُن کے والد ریاست رام پور سے منسلک تھے۔ اُنھوں نے انگریزی ماحول میں پرورش پائی اور اعلا تعلیم کے لیے لندن چلے گئے جہاں اُنھوں نے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کی وجہ شہرت ''انگارے'' میں موجود ان کا افسانہ ''جواں مردی'' ہے جو بنیادی طور پر انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کا اُردو میں ترجمہ سجاد ظہیر نے کیا تھا۔ 1936ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو ترقی پسند مصنفین سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا نام بھی جگمگانے لگا۔ اُنھوں نے ترقی پسند تحریک کو تقویت دی اور ترقی پسند مصنفین کے ساتھ شانہ بہ شانہ اپنا کردار ادا کیا۔ ''انگارے'' کو انگریزوں نے ضبط کر کے اُس کی اشاعت پر پابندی لگادی۔ ''انگارے'' کے ضبط ہونے کی وجہ سے ان میں موجود مصنفین کو شہرت دوام حاصل ہوگئی۔ لوگوں میں تجسس کی فضا وسعت اختیار کرتی گئی اور وہ چھپ چھپ کر ''انگارے'' کی تحریریں دل چسپی سے پڑھنے لگے۔ محمودالظفر اُردو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامیہ کالج امرت سر کے پرنسپل کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ وہ معروف افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر تھے۔ اُن کی تحریر میں حقیقت نگاری کا نمایاں رنگ چھلکتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو نہایت سنجیدگی اور صاف گوئی سے الفاظ کا جامہ پہناتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی سے مبرا تحریر لکھنے کے قائل تھے۔ اُن کی تحریر میں مقصدیت کا پہلو نمایاں حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ وہ ادب برائے ادب کے بہ جائے ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ اُنھیں ایک سماجی کارکن کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ وہ ''انگارے'' کے اہم مصنفین میں سے ایک ہیں۔ اُن کا انتقال 1956ء میں ہوا۔

تصنیف: انگارے (شریک مصنف)

نمونہ کلام: ''جب سے میں بیمار ہوں سوائے اس کے کہ آپ کو یاد کروں اور ان عجیب عجیب چیزوں اور نئے نئے لوگوں کا خیال کروں جن سے آپ وہاں ملتے ہوں گے، مجھے اور کام نہیں۔ مجھے چلا نہیں جاتا اس وجہ سے پلنگ پر پڑی پڑی طرح طرح کے خیال کرتی ہوں۔ کبھی تو اس میں لطف آتا ہے۔'' (جواں مردی)

تحریر: ابدال رضا

چراغ حسن حسرت
1904ء تا 1955ء

چراغ حسن حسرت 1904ء میں بارہ مولا میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد اُنھوں نے کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کر دی اور ''عصر جدید''، ''جمہور'' اور ''استقلال'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ''شیرازہ'' کے نام سے ایک علمی و ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔ آپ نے کئی ماہوار رسالوں، ہفتہ وار، روزنامہ اخباروں کی ادارت کی۔ آپ اُردو کے ممتاز مطائبات نگار، شاعر، ادیب، اور صحافی تھے۔ نثر نویسی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ''سندباد جہازی'' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھتے تھے۔ ''جغرافیہ پنجاب''، ''کیلے کا چھلکا'' اور ''دوڈاکٹر'' لکھ کر آپ علمی دنیا میں خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''سرگزشت اسلام'' آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ گو چراغ حسن حسرت عام طور پر مزاحیہ کالم لکھنے کے حوالے سے مشہور تھے لیکن آپ کو شعر و شاعری سے بھی کافی حد تک شغف تھا۔ اُنھوں نے چار جلدوں میں اسلام کی تاریخ لکھی جو عام فہم تاریخوں کے زمرے میں اولین شمار کی جاتی ہیں۔ اُن کے بیش تر مضامین مزاحیہ ہوا کرتے ہیں جن میں طنز بھی پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے محکمہ پنچایت پنجاب میں ہفت روزہ ''ترجمان'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ ہندو صنمیات پر ''پربت کی بیٹی'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اُن کی زندگی میں مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''مطائبات'' شائع ہوا۔ آپ 26 جون 1955ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور میانی صاحب کے قبرستان میں پیوندِ خاک ہوئے۔

تصانیف: مردم دیدہ۔ دو ڈاکٹر۔ کیلے کا چھلکا۔ مطائبات۔ پربت کی بیٹی۔ مضامین حسرت۔ حرف و حکایت۔ جدید جغرافیہ پنجاب۔ اقبال نامہ۔ باتیں حسن یار کی۔ ارطغرل۔ کشمیر۔ قائداعظم۔

نمونہ کلام: غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے … کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

''لاری پیر کی ڈھلوانوں پر بڑھتی چلی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پہاڑوں اور پہاڑی دروں کو لوگ پیر کیوں کہتے ہیں، جہاں کے علاقے کے درمیان پہاڑوں کی جو دیوار سی کھنچی ہوئی ہے وہ کچھ زیادہ اونچی نہیں۔'' (مضامین حسرت)

تحریر: تنزیلہ اشفاق

شوکت تھانوی
1904ء تا 1963ء

شوکت تھانوی 2 فروری 1904ء کو اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ والدین نے آپ کا نام عمر رکھا۔ لیکن شوکت تخلص اور وطن "تھانہ بھون" کی رعایت سے تھانوی کا اضافہ کیا۔ شوکت تھانوی کی پرورش و تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ لڑکپن اور جوانی لکھنؤ میں ہی بیتی۔ اُنھوں نے اپنی اَدبی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا۔ اُنھیں صحافت سے دل چسپی تھی۔ ہندستان کے کئی مشہور اخباروں سے وابستہ رہے جہاں سے وہ مزاح نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ مزاح نگاری کی باقاعدہ ابتدا 1928ء میں روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ، کے فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" سے ہوئی۔ زبان اور بیان پر غیر معمولی قدرت، زندہ دلی اور جدت طرازی کے باعث مزاحیہ اور طنزیہ اَدب کی قریباً ہر صنف، نشائیہ، ناول، ڈراما، پیروڈی، خاکہ نگاری، کردار تراشی، اور شاعری وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ شرارت حاضر دماغی اور بات سے بات نکالنے کا ہنر ان کا کمال تھا۔ 4 مئی 1963ء کو لاہور میں اُنھوں نے وفات پائی۔

تصانیف: کائناتِ تبسم۔ خانم خاں۔ خدانخواستہ۔ مریخ کی سیر۔ مجھے خرید لو۔ پگلی۔ غم غلط۔ گہرستان۔ ہم زلف۔ انشا اللہ۔ پہلی بیگم۔ قاضی جی۔ سودیشی ریل۔ کارٹون۔ شیش محل۔ شوکتیاں۔ سسرال۔ راجا صاحب۔ بیدی کرسی۔ دیکھا جائے گا۔ بھابھی۔ لاٹری کا ٹکٹ۔ غزالہ۔ سانچ کو آنچ۔ رقاصہ۔ دوزخ۔ حامد مرحوم۔ جوڑ توڑ۔ مغالطہ۔ کہا مرزا غالب نے۔ مضامین شوکت۔ سیلاب تبسم۔ دنیائے تبسم۔ نورتن۔ مسکراہٹیں۔ شیطان کی ڈائری۔ خانم خان۔ بڑ بڑ بس۔ دل پھینک۔ مسٹر چار سو بیس۔ داماد۔ برقِ تبسم۔ مابدولت۔ لاہوریات۔ بار خاطر۔ اے دلربا تیرے لیے۔ بحرِ تبسم۔ بہروپیا۔ بکواس۔ بیگم صاحبہ۔ بیوی۔ گرگٹ۔ انشا اللہ۔ جی ہاں بچے ہیں۔ جوکر۔ خبطی۔ کھی کھی۔ کچھ یادیں کچھ باتیں۔ کتیا۔ مریض عشق پہ۔ مارشل لا۔ مولانا۔ مسٹر 58۔ مکرر ارشاد۔ نیلوفر۔ قاعدہ بے قاعدہ۔ قہقہے۔ سپنے۔ سوتیا چاہ۔ سنی سنائی۔ الٹ پھیر۔

نمونہ کلام: "یہ میز خاص ہماری میز ہے جو ہمارے پلنگ سے ملی ہوئی کمرہ کے ایک کونے میں محض اس لیے رکھی ہوئی ہے کہ اگر ہم لکھتے لکھتے اتفاقاً کبھی اونگھ جائیں تو صبح اپنے کو بستر ہی پہ پائیں۔" (بحرِ تبسم)

تحریر: محمد ثناء اللہ معینی

مجنوں گورکھپوری
1904ء تا 1988ء

مجنوں گورکھپوری کا اصل نام احمد صدیق تھا۔ وہ 10 مئی 1904ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ مجنوں گورکھپوری ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد فاروق دیوانہ شاعر تھے اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ مجنوں گورکھپوری کی ابتدائی تعلیم گھر گاؤں میں ہوئی۔ اُنھوں نے اوائل عمری میں ہی عربی، فارسی اور ہندی میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد بی۔ اے تک تعلیم گورکھپور، علی گڑھ اور الہ آباد میں مکمل کی۔ آگرہ یونی ورسٹی سے انگریزی اور کلکتہ یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ مجنوں گورکھپوری اُردو کے شاعر، مترجم اور افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے ترقی پسند اَدب کو تنقیدی سطح پر نظریاتی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مجنوں کی تمام شناختوں پر ان کی تنقیدی شناخت حاوی رہی ہے۔ اُنھوں نے بہت تسلسل کے ساتھ اپنے عہد کے اَدبی و تنقیدی مسائل پر لکھا۔ مجنوں گورکھپوری ابتدا میں رومانی نقاد کی صورت میں سامنے آئے لیکن بعد میں اُنھوں نے مارکسی نظریات کی اہمیت تسلیم کر لی اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے نقاد شمار ہوئے۔ ان کا مقالہ "اَدب کی جدلیاتی اہمیت" مارکسی فلسفے کی بنیادی سائنس کو تجزیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ مجنوں اَدبی مسائل کو مستقیم انداز میں حل نہیں کرتے بل کہ قولِ محال پیدا کر کے قاری کو الجھا دیتے ہیں۔ یہ حربہ اُنھوں نے تفہیم و تعبیر اقبال میں زیادہ استعمال کیا ہے۔ "اَدب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشیے" اُن کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ اُنھوں نے 4 جون 1988ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: تین مغربی ڈرامے۔ سراب۔ دوش و فردا تنقید۔ سمن پوش اور دوسرے افسانے۔ مرہم مد جلالی۔ سالومی (ترجمہ)۔ سرنوشت۔ سوگوار شباب۔ شعر و غزل۔ خواب و خیال۔ تاریخ جمالیات۔ پردیسی کے خطوط۔ نکاتِ مجنوں۔ آغاز ہستی۔ اَدب اور زندگی۔ تنقیدی حاشیے۔

نمونہ کلام:

چمن میں لائی ہے پھولوں کی آرزو تجھ کو
ملا کہاں سے یہ احساسِ رنگ و بو تجھ کو
تری طرح کوئی سرگشتہ جمال نہیں
گلوں میں محو ہے کانٹوں کا کچھ خیال نہیں

تحریر: محمد یار

امتیاز علی عرشی
1904ء تا 1981ء
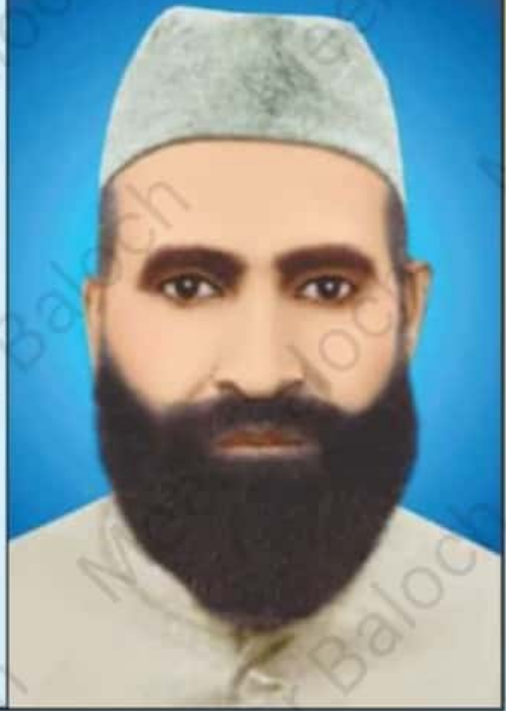
امتیاز علی عرشی 8 دسمبر 1904ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباؤ اجداد حاجی خیل قبائل، سوات سے ہجرت کر کے ہندستان آئے۔ مولانا عرشی کے والد معالج حیوانات تھے جو ریاست رام پور کے ہسپتال کے انچارج تھے۔ امتیاز علی عرشی کی شادی 1933ء میں ہاجرہ بیگم سے ہوئی۔ آپ نے پانچ سال کی عمر میں حصول تعلیم کا آغاز کیا۔ 1922ء تک جاری رہا تعلیم حاصل کرنے کے بعد طرح طرح کی ملازمتیں کیں۔ آخر میں رام پور آ گئے اور رضا لائبریری سے وابستہ رہے، جہاں نادر و نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ اب بھی موجود ہے۔ اس ذخیرے سے وہ خود بھی فیض یاب ہوئے اور علمی دنیا کو اس سے فیض پہنچایا۔ اُن کا اصل میدان عربی اُدب تھا لیکن اُردو میں تحقیق و تدوین کے ماہر تھے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ امتیاز علی خان عرشی نے تحقیق و تدوین میں بے شمار کارنامے سرانجام دیے۔ وہ عربی، فارسی اور اُردو کے عالم و فاضل و محقق، نقاد، ادیب، شاعر اور ماہر غالبیات ہونے کی بنا پر نمایاں مقام کے مالک تھے۔ آپ بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ اُن کی ساری زندگی تحقیق، تدوین اور تصنیف و تالیف میں گزری۔ اُن کا تحقیقی کام دوسرے محققین کے مقابلے میں معیار و مقدار دونوں کی حیثیت سے ممتاز و منفرد اہمیت رکھتا ہے۔ غالب ان کا خاص موضوع رہا، اُنھوں نے دیوان غالب کو زمانی اعتبار سے مرتب کیا۔ امتیاز علی عرشی 25 فروری 1981ء کو رام پور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: دیوان غالب نسخہ عرشی۔ مکاتیب غالب۔ تاریخ اکبری۔ باغ اُردو۔ فرہنگ غالب۔ نادرات شاہی۔ فارسی کا ہندستانی لہجہ۔ انتخاب غالب۔ مقالات عرشی۔ جاحظ کی کتاب الاخبار۔ قاطع برہان کا پہلا مسودہ۔ اُردو میں پشتو کا حصہ۔ قآنی ہند آصفی رام پوری شخصیت اور شاعری۔

نمونہ کلام: ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا　　نہیں جب ہوش میں ہم جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا

''اب ہمیں نسخہ رام پور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ نسخہ سید مہدی میاں صاحب نے جو مارہرے کے مشہور برکاتی خاندان کے ایک فرد تھے، نواب بہادر علی خان کے حضور پیش کیا تھا۔'' (مقالات عرشی)

تحریر: رافع عابد

اختر شیرانی
1905ء تا 1948ء

محمد داؤد خاں متخلص بہ اختر شیرانی 4 مئی 1905ء کو ریاست ٹونک راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ٹونک میں ہی حاصل کی۔ 15 برس کی عمر تک اُردو فارسی کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ اختر شیرانی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ اُنھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا لیکن والد کی کوشش کے باوجود کوئی اور امتحان نہ پاس کر سکے اور شعر و شاعری کو مستقل مشغلہ بنا لیا۔ آپ کے والد حافظ محمود شیرانی اورینٹل کالج میں فارسی کے استاد اور بلند پایہ عالم، محقق، ماہر لسانیات اور نقاد تھے۔ ''ہمایوں'' اور ''سہیلی'' کی ادارت کے بعد رسالہ ''انقلاب'' پھر ''خیالستان'' نکالا اور پھر ''رومان'' جاری کیا۔ ''شاہکار'' کی ادارت بھی کی۔ جوانی میں ہی اختر شیرانی کو شراب نوشی کی عادت پڑ چکی تھی اسی عادت نے ان کی جان لے لی۔ اختر شیرانی اُردو شاعری میں شاعر رومان کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کے ہاں رومانوی جذبات کی فروانی ہیں۔ اُنھوں نے نسوانی حسن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اُن کی شاعری میں سلمیٰ تو محض ایک نام ہے ورنہ اُنھوں نے عورت کے وجود سے پیار کیا اس طرح اختر کے ہاں نسوانی حسن کی تعریف و توصیف جا بجا ملتی ہے۔ عشق کی والہانہ کیفیات کو نظم کی صورت دی۔ اختر شیرانی کی شاعری میں کائنات عورت کے جمالیاتی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے قاری اس کے حسن سے متاثر بھی ہوتا ہے اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں تخیل کی فراوانی، انفرادیت، ماضی پرستی انقلاب پسندی اور جمال آفرینی پائی جاتی ہیں۔ اُردو شاعری میں اختر پہلا رومانوی شاعر ہے۔ اُنھوں نے جیتی جاگتی عورت کو نظم میں اہم موضوع کی حیثیت دی اور نظم کو خارج سے باطن کی طرف موڑ دیا۔ اس کے علاوہ فطرت کی رنگارنگی اور انسانی زندگی کا خلوص اور محبت ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ وہ 9 ستمبر 1948ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور میانی صاحب میں دفن ہیں۔

تصانیف: صبح بہار۔ اختر ستان۔ لالہ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز اور شہرو۔

نمونہ کلام:

دو چاند ہیں پہلو میں اب چاند کہیں کس کو　　ساقی کو اگر کہیے پیمانے کو کیا کہیے
کیا غضب ہے کہ ہجر غم سنا بھی نہ سکیں　　سینے کا زخم دکھاتے تو دکھا بھی نہ سکیں

تحریر: اقصیٰ جمیل

رشید جہاں
۱905ء تا 1952ء

ڈاکٹر رشید جہاں 5 اگست 1905ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ کے ازابیلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔ دو سال کے بعد اُنھوں نے دہلی کے لارڈ ہارڈنگ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا جہاں سے وہ 1934ء میں ڈاکٹر بن کر نکلیں۔ اسی سال ان کی شادی محمود الظفر سے ہوئی جو اُردو کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامیہ کالج امرت سر کے پرنسپل بھی تھے۔ یہاں ان کی ملاقات فیض احمد فیض سے ہوئی اور یوں اُنھوں نے ترقی پسند تحریک کے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ رشید جہاں شادی سے پہلے ہی افسانہ نگاری کا آغاز کر چکی تھیں۔ 1931ء میں جب سجاد ظہیر کی ادارت میں ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی تو اس میں رشید جہاں کا افسانہ ''پردے کے پیچھے'' اور ''دلی کی سیر'' شامل تھا۔ وہ پہلی بار 1932ء میں زیر بحث آئیں جب ان کے افسانے اور ڈرامے ''انگارے'' میں شایع ہوئے۔ اُن کے افسانے اس وقت کی جنسی اخلاقیات اور سماج میں رائج بنیاد پرستی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھے۔ ''انگارے'' کی اشاعت نے ایک سیاسی اور اَدبی ہلچل پیدا کر دی اور برطانوی حکومت نے اس مجموعے پر پابندی لگا کر اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں۔ رشید جہاں رسالہ ''چنگاری'' کی مدیرہ بھی رہیں جس کے ذریعے اُنھوں نے خواتین میں ذہنی بے داری کی شمع روشن کی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے لکھنؤ میں کئی ڈرامے تحریر کیے اور اُنھیں سٹیج بھی کیا۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر لکھنؤ میں ہوا جہاں اُنھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو بہت تقویت پہنچائی۔ وہ غیر روایتی خیالات کی حامل ایک اہم افسانہ نگار اور ڈراما نویس تھیں۔ وہ خواتین کے مسائل کو بے باک انداز میں بیان کرنے کا ملکہ رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے 13 اگست 1952ء کو ماسکو (روس) میں وفات پائی۔

تصانیف: انگارے۔ عورت اور دیگر افسانے۔ شعلہ جوالہ۔ وہ اور دوسرے افسانے، ڈرامے۔

نمونہ کلام: ''اصغر دلہن کے تو اللہ رکھے نو بچے تھے اور بچاری اقبال دلہن بانجھ مشہور تھیں۔ اولاد نہ ہونے کا غم ان کو کھائے جاتا تھا۔ اولاد نہ ہو تو نہ سہی لیکن جٹھانی کے طعنے اور مذاق زندگی وبال کیے ہوئے تھے۔''

تحریر: ابدال رضا

ممتاز مفتی
۱905ء تا 1995ء

ممتاز مفتی 11 ستمبر 1905ء کو بہ مقام بٹالہ ضلع گورداس پور میں مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرت سر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں میں پائی۔ بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ ممتاز مفتی اوائل دور میں لبرل اور مذہب سے بیگانے دانشور کی حیثیت سے مشہور اور سگمنڈ فرائڈ سے متاثر تھے۔ اُن کی تحریریں معاشرے میں موجود برائیوں کو اُجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''جھکی جھکی آنکھیں'' اَدبی دنیا لاہور میں شایع ہوا۔ اس طرح وہ مفتی ممتاز حسین سے ممتاز مفتی بن گئے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''ان کہی''، ''گہما گہمی''، ''چپ''، ''روغنی پتلے'' اور ''سے کا بندھن'' شامل ہیں۔ ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' سوانحی ناول جب کہ ''ہند یاترا'' اور ''لبیک'' سفر نامے ہیں۔ خاکہ نگاری میں ''اوکھے لوگ''، ''پیاز کے چھلکے'' اور ''تلاش'' جیسی کتابوں کے خالق ہیں۔ ان کو عورتوں کی زبان کا ملکہ حاصل ہے۔ اُن کے ہاں حقیقی انسانی زندگی بھرپور عکاسی موجود ہے۔ ممتاز مفتی کہانی، افسانہ اور شخصیت نگاری کا خوبصورت حوالہ ہیں۔ اُنھوں نے جس شخصیت کو بھی اپنا موضوع بنایا اسے خوبصورتی اور اچھوتے پن کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ وہ شخصیت اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ اُبھر کر سامنے آ گئی۔ ممتاز مفتی نے شخصیت نگاری، خاکہ نویسی کو نئی ہیئت دی، انداز دیا، اور ایک نیا اسلوب دیا۔ ممتاز مفتی شخصیت نگاری کے فن کے اُستاد ہیں۔ افسانہ نگاری کے حوالے سے اُردو اَدب میں ممتاز مفتی اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے تمام افسانے کسی نہ کسی کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ اُنھوں نے 27 اکتوبر 1995ء کو اسلام آباد میں انتقال کیا۔

تصانیف: ان کہی۔ گڑیا گھر۔ گہما گہمی۔ اسمارائیں۔ چپ۔ کہی نہ جائے۔ روغنی پتلے۔ سے کا بندھن۔ علی پور کا ایلی۔ الکھ نگری۔ ہند یاترا۔ لبیک۔ اوکھے لوگ۔ اور اوکھے لوگ۔ پیاز کے چھلکے۔ تلاش۔ اوکھے اولڑے۔ رام دین۔ غبارے۔ مداح ہومیوپیتھی۔ نظام سقا۔

نمونہ کلام: ''جب کبھی بیٹھے بیٹھائے آپا کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے چھوٹا سے بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہے''۔ (آپا)

تحریر: حبیبہ منظور

سید سجاد ظہیر
1905ء تا 1973ء

سجاد ظہیر کی پیدائش 5 نومبر 1905ء کو لکھنؤ کے ایک روایتی جاگیردار سید وزیر حسن کے ہاں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید اور گلستان و بوستان سے ہوئی۔ جوبلی ہائی سکول اور کرسچین کالج لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی لندن سے معاشیات کی ڈگری لی۔ 1929ء کو انھوں نے سائمن کمیشن کے خلاف جلوس نکالا جس کے نتیجے میں ان کے حصے میں پولیس کی لاٹھیاں آئیں۔ 1940ء کو انھیں برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کیا تب ان کی شادی کو صرف ایک سال ہوا تھا۔ ان کی بیگم کا نام رضیہ سجاد ظہیر تھا۔ وہ ایک رئیس گھرانے کے فرد تھے لیکن اُنھوں نے اپنی ذاتی، ذہنی اور معاشرتی زندگی کو عام انسانوں کی طرح گزارا۔ 1935ء میں سجاد ظہیر کی راہنمائی میں اُردو اَدب کی سب سے توانا، جاندار، متحرک اور منظم تحریک نے جنم لیا اور ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تحریک کارل مارکس کے نظریے کی ہی ایک کڑی تھی جس میں اس نے مزدوروں اور کسانوں کو برابری کے حقوق دینے کی بات کی۔ سجاد ظہیر کی وجہ شہرت افسانہ نگاری، ناول نگاری، خطوط نگاری اور ان کے تنقیدی نظریات ہیں۔ سجاد ظہیر کی اَدبی تنقید "روشنائی"، "ذکر حافظ" اور "مضامین سجاد ظہیر" میں دستیاب ہیں۔ ان کا معرکۃ الآرا ناولٹ "لندن کی ایک رات" اُردو اَدب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کی آمد "انگارے" سے ہوئی جس میں ان کے فرد اور سماج کے مسائل پر پانچ افسانے شامل ہیں۔ سجاد ظہیر کے اپنی بیگم کے نام خطوط کا مجموعہ "نقوش زنداں" کے نام سے شائع ہوا۔ اُنھوں نے 11 ستمبر 1973ء کو وفات پائی۔

تصانیف: لندن کی ایک رات۔ ڈلاری۔ جنت کی بشارت۔ نیند نہیں آتی۔ گرمیوں کی رات۔ پھر یہ ہنگامہ۔ نقوش زنداں (مجموعہ خطوط)۔ روشنائی (ترقی پسند تحریک کی تاریخ)۔ ذکر حافظ۔ مضامین سجاد ظہیر

نمونہ کلام: "ایک کامیاب فنکار، حقائق اور واقعات مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور ردعمل کے کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں کا مشاہدہ کر کے اور اُنھیں سمجھ کر اپنے دل و دماغ میں جذب کرتا ہے۔" (روشنائی)

تحریر: ثنا منور

محی الدین قادری زور
1905ء تا 1962ء

محی الدین قادری زور 25 دسمبر 1905ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام غلام محمد قادری زعم تھا جو کہ اچھے شاعر تھے۔ زور نے عثمانیہ کالج سے "لسانی سائنس" میں ایم۔اے اور 1930ء میں فرانس سے لسانی تحقیق کی خصوصی تعلیم حاصل کی۔ اُنھوں نے اکسٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ اُنھوں نے لسانی تحقیق، معاشرتی روداد نگاری، عالمانہ تنقید کے علاوہ افسانے لکھے اور شاعری بھی کی۔ زور نے قدیم اُردو اَدب کی حفاظت اور اُردو کی ترویج کے لیے "اَدبیات اُردو" کی بنیاد رکھی، ابوالکلام آزاد تحقیقی انسٹیٹیوٹ قائم کیا اور اَدبی اور علمی جریدہ "سب رس" جاری کیا۔ ڈاکٹر زور کو دکنی تہذیب اور اُردو زبان و اَدب سے پیار تھا۔ ڈاکٹر زور ایک ماہر لسانیات، محقق و مدون، ادیب شاعر، افسانہ نگار، سوانح نگار، مورخ، ادارہ اَدبیات کے بانی ہیں۔ لسانیات پر ان کی دو کتابوں "ہندستانی لسانیات"، "ہندستانی فونیٹکس" کی وجہ سے زور کو اُردو کا پہلا باقاعدہ ماہر لسانیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ "روح تنقید" میں ڈاکٹر زور نے مغربی تصورات تنقید سے براہِ راست استفادہ کیا۔ اُن کا سب سے بڑا کام دکنی ادب کی تحقیق و تدوین ہے۔ بحیثیت اَدبی مورخ اُنھوں نے "تاریخ اُردو اَدب"، "دکنی اَدب کی تاریخ"، "داستان اَدب حیدر آباد"، "اُردو شہ پارے" لکھیں۔ اُنھوں نے تاریخی اور نیم تاریخی افسانے بھی لکھے۔ "گارساں دتاسی"، "سرگزشت حاتم"، "سرگزشت غالب"، "سلطان محمد قلی قطب شاہ" جیسی سوانح بھی لکھیں۔ ڈاکٹر زور کی ابتدائی شاعری جوانی جب کہ دوسرے دور کی وادی کشمیر کے دل فریب نظارے پر فضا فرحت بخش ماحول پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر زور کا انتقال سری نگر میں 25 ستمبر 1962ء کو ہوا۔

تصانیف: ہندستانی لسانیات۔ طلسمات خیال۔ شاعر گولکنڈہ۔ گولکنڈے کے ہیرے۔ دکنی اَدب کی تحریک۔ کلیات قطب شاہ۔ حیات میر محمد مومن۔ داستان اَدب حیدر آباد۔ تذکرہ مخطوطات اُردو۔ معنی شکن

نمونہ کلام: "زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے۔" (ہندستانی لسانیات)

تحریر: وجیہہ سرور

سید عبداللہ
1906ء تا 1986ء

سید عبداللہ 5 اپریل 1906ء کو منگلور (مانسہرہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور ہزارہ ڈویژن کے مختلف سکولوں میں پائی، پھر لاہور سے ایم اے (فارسی) اور ایم اے (عربی) کر کے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔
ڈاکٹر سید عبداللہ مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے مگر بیش تر جامعہ پنجاب سے ہی منسلک تھے۔ عربی اور فارسی شعبوں کے صدر، لائبریرین اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ جامعہ پنجاب کے اسلامی دائرۃ المعارف منصوبے کے صدر رہے۔ انھوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1921ء میں انھیں اس کی وجہ سے چھ مہینے کی قید و بند کی سزا بھی دی گئی تھی۔ آپ حافظ محمود شیرانی کے شاگرد تھے ان کی کارکردگی کا اصل میدان اُردو اور فارسی اَدب کی تحقیق تھا۔ ''اَدبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ''، ''اُردو کے تذکرے'' اور ''مباحث'' ان کی گراں قدر تحقیقی کتب ہیں۔ آپ نے ابتدا میں لسانی، تاریخی اور سوانحی تحقیق میں دلچسپی لی اور ''ہریانی اُردو کا ایک نمونہ''، ''شہرآشوب کی تاریخ''، ''تخلص کی رسم اور تاریخ''، ''فارسی تذکروں میں تنقیدی عنصر'' جیسے موضوعات کو تحقیقی روشنی دی۔ آزادی کے بعد اَدب کی تاریخ اور تحریکوں پر زیادہ کام کیا۔ وسطی سے آخری دور میں تنقیدی اَدب کی طرف مائل رہے۔ آپ نے پاکستان کی پہلی اُردو کانفرنس مارچ 1948ء میں کروائی۔ آپ کو اُردو میں اَدبی خدمات کی وجہ سے ''دوسرے بابائے اُردو'' بھی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا انتقال 14 اگست 1986ء کو ہوا۔

تصانیف: اُردو اَدب کی ایک صدی۔ اطراف غالب۔ اُردو اَدب جنگ عظیم کے بعد۔ اَدبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ مباحث۔ طیف اقبال۔ سرسید احمد اور ان کے نامور رفقا۔ مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ۔ وجہی سے عبدالحق تک۔ مقامات اقبال۔ مسائل اقبال۔ نقد میر۔ شعرائے اُردو کے تذکرے۔ تفہیم اقبال۔ ولی سے اقبال تک۔ بحث و نظر۔ دفتری زبان اور نصاب تعلیم۔ اشارات تنقید۔

نمونہ کلام: ''میر اثر کوئی علم النفس کے اشتہاری یا با قاعدہ عالم تو نہ تھے مگر باتیں انھوں نے اس انداز میں کی ہیں کہ ان کے گہرے مطالعہ نفس انسانی سے منکر ہونا بھی دشوار ہی معلوم ہوتا ہے۔'' (ولی سے اقبال تک)

تحریر: امتیاز حسین

شاہد احمد دہلوی
1906ء تا 1967ء

شاہد احمد دہلوی 22 مئی 1906ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے فرزند تھے۔ جنوری 1930ء میں اُنھوں نے دہلی سے جریدہ ''ساقی'' جاری کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور اس کی دہلی شاخ کے سیکرٹری بن گئے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ یہاں اُنھوں نے ''ساقی'' کا دوبارہ اجرا کیا جس کا سلسلہ ان کی وفات تک رہا۔ اُردو کے صاحب طرز ادیب، اَدبی مجلّہ ساقی کے مدیر، مترجم اور ماہر موسیقی تھے وہ بہت اچھے نثر نگار تھے۔ ان کے خاکوں کے مجموعے ''گنجینہ گوہر''، ''بزم خوش نفساں''، ''بزم شاہد'' اور ''طاق نسیاں'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں ''دلی کی بپتا'' اور ''اجڑا دیار'' کے نام سے مرحوم دلی کے حالات قلم بند کیے۔ وہ ایک مترجم بھی تھے؛ اُنھوں نے انگریزی کی متعدد کتابیں اُردو زبان میں منتقل کیں۔ شاہد احمد دہلوی کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اُنھوں نے دہلی گھرانے کے مشہور استاد چاند خان سے موسیقی کی باقاعدہ تربیت لی اور تقسیم ہند کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ انیس احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام پیش کرتے تھے۔ اُنھوں نے موسیقی کے موضوع پر بھی مضامین قلمبند کیے۔ جن کا مجموعہ ''مضامین موسیقی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسے عقیل عباس جعفری نے مرتب کیا۔ حکومت پاکستان نے شاہد احمد دہلوی کو ان کی اَدبی خدمات کے صلے میں 14 اگست 1963ء کو صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ شاہد احمد دہلوی 27 مئی 1967ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔ اُنھیں گلشن اقبال کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

تصانیف: گنجینہ گوہر۔ بزم خوش نفساں۔ بزم شاہد۔ طاق نسیاں۔ دلی کی بپتا۔ دلی کی یادداشتیں۔ اجڑا دیار۔ سرگزشت عروس۔

نمونہ کلام: ''جو لکھ پتی تھے اور جن کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں وہ ایک ہی روز میں فقیر ہو گئے اور اُنھیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ جامع مسجد میں کئی ہزار آدمیوں نے پناہ لی تھی راشن کی دکانیں خالی ہو گئی تھیں۔'' (گنجینۂ گوہر)

تحریر: محمد آصف

عابد علی عابد
1906ء تا 1971ء

سید عابد علی عابد ڈیرہ اسماعیل خان میں 17 ستمبر 1906ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے جدِ امجد رجب علی ارسطو، غالب کے ہم عصر تھے۔ آپ کے دادا جان حسن علی پولیس میں اور آپ کے والد سید غلام عباس شاہ فوج میں ملازمت کرتے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول رنگ محل میں حاصل کی۔ آپ نے ایم اے، ایل ایل بی، ایم او ایل کا امتحان پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے درجہ اول میں پاس کیا۔ ایم۔اے فارسی میں یونی ورسٹی بھر میں دوسرے نمبر پر رہے۔ آپ نے وکالت بھی کی، اس کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں لیکچرر مقرر ہوئے اور بعد ازاں پرنسپل کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ اکیس سال تک مجلس ترقی اَدب سے بھی وابستہ رہے۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ رسالہ ''صحیفہ'' کا اجرا تھا جس کے آپ مدیر بھی رہے۔ آپ درس و تدریس کے علاوہ مختلف جرائد کے ادارتی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ آپ نے ریڈیو کے لیے بھی متعدد ڈرامے اور فیچر لکھے۔ آپ نے تنقید اور شاعری میں بھرپور خدمات انجام دیں۔ آپ نے مشرقی تنقید پر بہت زور دیا، آپ کی تنقید کے اندر روایت ہی نہیں بل کہ مشرقیت رچی بسی ہے۔ آپ نے مشرق اور مغرب کے اصول تنقید میں ربط قایم کیا اور اہم اصناف اَدب مثلاً داستان، افسانہ، ناول، ڈرامہ، غزل، مثنوی، قصیدہ اور نظم کے مزاج کا تجزیہ کر کے ان کی الگ الگ تنقیدی حیثیت کو متعین کیا۔ آپ نے اپنی شاعری میں فارسی اور اُردو کے اشعار کا استعمال کرتے ہوئے مشرق اور مغرب کے اہلِ قلم کے اقوال کے ذریعے اپنی بحث کو دل چسپ اور نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا انتقال 20 جنوری 1971ء میں لاہور میں ہوا۔

تصانیف: انتقاد۔ اصول انتقادِ اَدبیات۔ شعرِ اقبال۔ مقالات عابد۔ انتقادِ شعر۔ البدیع۔ البیان۔ اسلوب۔ داغ ناتمام۔ میں کبھی غزل نہ کہتا۔ تلمیحاتِ اقبال۔

نمونہ کلام: آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل　　جانے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول
وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد　　آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

تحریر: شاہد نواز

مالک رام
1906ء تا 1993ء

مالک رام 22 دسمبر 1906ء کو پھالیہ میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے بچپن ہی سے گھر میں کتابوں کو دیکھا اور بھائی کے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے مالک رام کو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مالک رام نے اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تاریخ میں ایم اے کیا اور امورِ خارجہ کی وزارت میں ملازم ہوئے۔ اَدبی زندگی کا آغاز علامہ اقبال کے عہد میں لاہور سے کیا۔ 1926ء میں جب مالک رام تقریباً انیس برس کے تھے۔ اُنھوں نے اپنا پہلا مضمون غالب اور ذوق کے نام سے لکھا جو نگار میں شایع ہوا۔ غالب اور ذوق کے مطالعے کی وجہ سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اُنھوں نے غالب کے مطالعے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ اُنھیں اُردو اَدب سے عام طور پر لیکن مرزا غالب سے خاص طور پر لگاؤ تھا۔ اُنھوں نے اُردو اور فارسی میں غالب کے زیادہ تر کلام کی تدوین کی اور حاشیے بھی لکھے۔ اُن کے استاد مولوی فقیر محمد نے شاعری سے روک دیا اور مالک رام کو نثر لکھنے کی ترغیب دی، تب سے آپ نے شاعری کو دوبارہ اختیار نہیں کیا۔ مالک رام کو ماہرین غالبیات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ جنوری 1967ء میں مالک رام نے سہ ماہی اُردو اَدبی ریویو قایم کیا جس کا نام ''تحریر'' رکھا۔ 1978ء تک اس کے مدیر رہے۔ اس تحقیقی مجلّے میں علمی مضامین پیش کیے جاتے تھے۔ مالک رام کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اُنھیں متعدد اَدبی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اُن کا انتقال 16 اپریل 1993ء کو دہلی میں ہوا۔

تصانیف: اسلامیات۔ تحقیقی مضامین۔ تذکرہ ماہ و سال۔ عورت اور اسلامی تعلیم۔ تلامذہ غالب۔ تذکرہ معاصرین۔ ذکرِ غالب۔ قدیم دلی کالج۔ مرزا غالب۔ تحریر۔ اپنے وطن میں اجنبی۔ عیارِ غالب۔ فسانہ غالب۔ حالی۔ گفتارِ غالب۔ کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں۔ تحقیقی مضامین۔ اُردو میں تحقیق۔ وہ صورتیں الٰہی۔ ذکرِ غالب۔

نمونہ کلام: ''جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔'' (تذکرہ معاصرین)

تحریر: منیبہ وحید

ماہرالقادری
1907ء تا 1978ء

ماہرالقادری 30 جولائی 1907ء کو کیسر کلاں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام منظور حسین تھا۔ اُنھوں نے عملی زندگی کا آغاز حیدرآباد دکن سے کیا پھر بجنور چلے گئے جہاں ''مدینہ بجنور'' اور ''غنچہ'' کے مدیر رہے۔ زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد دکن، دہلی اور بمبئی میں گزارا، پھر آپ کا مستقل قیام کراچی میں رہا۔ چند ماہ ملتان میں بھی گزارے۔ اس کے علاوہ اُنھیں سیروسیاحت کا بھی اتفاق رہا۔ 1928ء میں ریاست حیدرآباد کے مختلف محکموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ قیام حیدرآباد کے دوران جب نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر کا طوطی بولتا تھا تو اُنھیں عظیم شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔ 1943ء میں حیدرآباد سے بمبئی منتقل ہوگئے، وہاں فلمی دنیا میں کچھ وقت گزارا، کئی فلموں کے گیت بھی لکھے جو بڑے مقبول ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد اُنھوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور علمی جریدے ''فاران'' کا اجرا کیا۔ وہ ایک مشہور نقاد، محقق، صحافی اور نام ور شاعر تھے۔ وہ تبصرہ نگار بھی تھے۔ شاعری میں ان کی اٹھان ایک رومان پرور فنکار کے طور پر ہوئی۔ ابتدا میں ان کی غزلیں عاشقانہ ہیں جن میں عاشقانہ خوش مزاجی، طربیہ رنگ، رومانی جوش وخروش اور معاملہ بندی پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری ایک ٹھہراؤ اور توازن کے حامل عاشق صادق کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ آپ بعد میں تحریک اَدب اسلامی میں شامل ہوگئے اور ان کی شاعری کا دھارا مذہب کی طرف مڑ گیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اپنے فن کو اخلاقی موضوعات کے لیے وقف کر دیا اور اسلامی تاریخ اور مشاہیر اسلام کے کارناموں کو اپنی شاعری کا مرجع بنا لیا اور تادم آخر ان ہی موضوعات کے ساتھ منسلک رہے۔ ماہرالقادری 12 مئی 1978ء کو جدہ کے ایک مشاعرے کے دوران انتقال کر گئے اور مکہ مکرمہ میں جنت المعلیٰ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

تصانیف: ظہورِ قدسی۔ طلسم حیات۔ محسوساتِ ماہر۔ نغماتِ ماہر۔ نقشِ توحید۔ جذباتِ ماہر۔ کاروانِ حجاز

نمونہ کلام:

پردہ بھی جلوہ بن جاتا آنکھ تجلی ساز کہاں ہے
مسکرا کے اس نے پوچھا حالِ دل بوند آنسو کی ٹپک کر رہ گئی

تحریر: کومل لیاقت

مخدوم محی الدین
1908ء تا 1969ء

مخدوم محی الدین 4 فروری 1908ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی حیدرآباد سے ہی حاصل کی اور عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ باقاعدہ طور پر سیاسی میدان میں اترے اور ترقی پسند تحریک کو اپنے خیالات کے مطابق پا کر اس میں شامل ہوگئے۔ وہ خالصتاً مزدور طبقے کے شاعر تھے۔ عملی سیاست میں آنے کے بعد بھی اُنھوں نے اہلِ اقتدار سے لے کر رکشہ والے تک ہر کسی سے تعلق رکھا۔ اُنھوں نے حیدرآباد دکن میں جاگیرداری نظام کے خلاف لڑتے ہوئے وہاں کے تمام کسانوں کی قیادت کی اور باقاعدہ مسلح جدوجہد کی۔ اُن کا شعری سفر پینتیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اُن کے تین شعری مجموعے مختلف وقفوں میں شائع ہوئے۔ مخدوم محی الدین نے زیادہ تر نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی غزلوں کی تعداد محض اکیس ہے۔ ''آپ کی یاد آتی رہی رات بھر'' اور ''عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات ڈھلے'' ان کی نمایندہ غزلوں میں سے ہیں۔ نظموں میں بلور، ملاقات، عورت، وقت، بے درد مسیحا اور خواہش چند مقبول نام ہیں۔ اُن کا مزاج رومانی اور انداز انقلابی تھا اس لیے ان کی شاعری میں ترقی پسند انقلاب اور مارکسی نعرہ بازی کے ساتھ ساتھ جذبے کی حدت اور کسک بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری محض نعرے میں گم نہیں ہوتی بل کہ حقیقی شاعری کے حسن سے بھی مملو ہے۔ وہ اُردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کے نام ور رہنما بھی تھے جنھوں نے تقسیم ہندستان کے بعد وہاں مارکسی نقطۂ نظر کا علم بلند کیے رکھا اور مزدوروں کسانوں کے لیے آواز اٹھاتے رہے۔ آپ 25 اگست 1969ء میں دہلی میں انتقال کر گئے اور اُنھیں حیدرآباد دکن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

تصانیف: سرخ سویرا۔ گل تر۔ بساطِ رقص۔

نمونہ کلام:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے سانس کی طرح سے آپ آتے رہے، جاتے رہے
موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
بربطِ نواز بزم الوہی ادھر تو آ اے داعیِ پیامِ عبودی ادھر تو آ

تحریر: حبیب سلطان

شوکت سبزواری
1908ء تا 1973ء

شوکت سبزواری 13 اکتوبر 1908ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام سید شوکت علی تھا، اُنھوں نے فارسی عربی اور اُردو میں ایم اے اور بعد ازاں اُردو لسانیات میں پی ایچ ڈی کی۔ تقسیم ہند سے پہلے ڈھاکہ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اُردو وفارسی کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کے بعد کراچی میں موجود اُردو لغت بورڈ کے مدیر اور مدیر اعلا رہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ماہر لسانیات، نقاد، محقق اور شاعر تھے۔ ان کا نمایاں کام "اُردو لسانیات"، "اُردو قواعد"، "اُردو زبان کا ارتقا" اور "داستان زبان اُردو" ہے جن کی بہ دولت وہ اُردو ادب کی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کھڑی بولی یا ہندستانی (اُردو) بالائی دوآبے میں بولی جانے والی زبانوں کی فطری اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اُنھوں نے اپنی تصنیف "داستان زبان اُردو" میں اُردو کے آغاز کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے جس کے مطابق اُردو ہندستانی یا کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے۔ وہ کھڑی بولی اور ہندستانی کو ایک ہی زبان تصور کرتے ہیں اور اُردو کو اس کی اَدبی صورت گردانتے ہیں۔ وہ اُردو زبان کو عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی یا سنسکرت کے بہ جائے خود اُردو کے ہی اصولوں پر پرکھنا چاہتے تھے، اس تمنا کا اظہار اُنھوں نے ساٹھ کی دہائی میں کیا تھا اور پھر اس کا عملاً آغاز بھی کیا تھا یعنی اُردو گرامر کی ایک مبسوط اور جامع کتاب لکھنے کے لیے ابھی پہلا ہی باب مکمل کر پائے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اُن کے اس نامکمل کام کو ڈاکٹر قدرت نقوی کے حواشی اور مشفق خواجہ کے دیباچہ سے آراستہ کر کے شایع کر دیا تھا۔ اس ادھورے کام میں بھی اُردو اسم کی بحث مکمل طور پر موجود ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری 19 مارچ 1973ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: اُردو لسانیات۔ اُردو زبان کا ارتقا۔ اُردو قواعد۔ داستان زبان اُردو۔ غالب فکر وفن۔ نئی پرانی قدریں۔ فلسفہ کلام غالب۔ لسانی مسائل۔ معیارِ ادب۔

نمونہ کلام: "عربی میں بھی اعرابی حالتیں ہیں اور سنسکرت وغیرہ آریائی زبانوں میں بھی، لیکن آریائی زبانوں کی حالتیں تعداد میں عربی سے زیادہ ہیں۔" (لسانی مسائل)

تحریر: نسما یاسمین

کلیم الدین احمد
1909ء تا 1983ء

کلیم الدین احمد 15 ستمبر 1909ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر کیمبرج یونی ورسٹی گئے واپس آ کر پٹنہ یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور بعد میں صدر شعبہ مقرر ہو گئے۔ 1953ء میں پرنسپل کے منصب پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز بھی رہے۔ اُن کی تنقید دراصل مغربی اَدب اور خاص طور پر انگریزی اَدب کے زیر اثر وجود میں آئی، جس سے اُنھیں اپنی زبان کا اَدبی سرمایہ حقیر نظر آتا تھا۔ کلیم الدین احمد اُردو تنقید میں ایک بت شکن کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ شدت اور سخت گیری کے باوجود ان کی تنقید سے اُردو اَدب کو بہت فائدہ پہنچا۔ اُنھوں نے مغربی انداز تنقید پر زور دیا کیوں کہ وہ اپنے اَدب کو انگریزی اَدب کے ہم پلہ دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کی تنقید میں جا بجا برہمی کا اظہار ہوتا ہے ترقی پسند اَدب سے وہ اس لیے ناخوش تھے کہ وہاں حسن کاری معدوم تھی اور صرف اشتراکیت کا پرچار تھا۔ اُنھوں نے اَدب کی اَدبیت اور آفاقی قدروں پر زور دیا۔ اُن کا تنقیدی شعور برابر ارتقا پذیر رہا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی اَدب سے مرعوبیت اور فیصلے میں عجلت کی عادت کم ہو گئی شدت اور انتہا پسندی کی جگہ اعتدال وتوازن نے لے لی۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن اُنھوں نے اپنی نظمیں رسائل میں شایع نہیں کروائی تھیں لیکن بعد میں "بیالیس نظمیں" اور "پچیس نظمیں" کے نام سے ان کی شعری تصانیف شایع ہوئیں مگر اُنھیں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ اس میں صرف آزاد نظمیں تھیں۔ آپ نے 21 دسمبر 1983ء کو وفات پائی۔

تصانیف: اُردو شاعری پر ایک نظر۔ اُردو تنقید پر ایک نظر۔ عملی تنقید۔ سخن ہائے گفتنی۔ اپنی تلاش۔ کلیات شاد۔ دیوان جوشش عظیم آبادی۔ مقالات قاضی عبدالودود۔ تاریخ نور۔ بیالیس نظمیں۔ اُردو زبان اور فن داستان گوئی۔ دیوان جہاں۔ اَدبی تنقید کے اصول۔ فن داستان گوئی۔ اقبال ایک مطالعہ۔ فرہنگ اَدبی اصطلاحات۔ میر انیس۔ میری تنقید ایک باز دید۔ نذر کلیم۔ قومی مغربی تنقید۔ تحلیل نفسی اور اَدبی تنقید۔ دو تذکرے۔

نمونہ کلام: "اگر خیال میں جان ہو اور خیال احساس میں بدل گیا ہو تو اَدبیت سے نقصان نہیں ہوتا۔" (عملی تنقید)

تحریر: سہیل عباس

غلام عباس
1909ء تا 1982ء

اُردو کے مشہور افسانہ نگار غلام عباس 17 نومبر 1909ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میاں عبدالعزیز تھا۔ تعلیم اور پرورش لاہور میں ہوئی۔ ایف۔اے کے بعد تعلیمی سلسلہ برقرار نہ رہ سکا۔ اُنھوں نے مقامی رسائل میں لکھنا شروع کیا اور 1922ء میں ان کا اولین افسانہ ''بکری'' شایع ہوا۔ آپ نے چودہ برس کی عمر میں روسی افسانہ نگار لیوطالسائی کے افسانے جلاوطن کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ انیس برس میں فری لانس ادیب اور صحافی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ بچوں کے رسالے ''پھول'' اور خواتین کے پرچے ''تہذیبِ نسواں'' کے مدیر امتیاز علی تاج کے نائب بھی رہے۔ غلام عباس کی افسانہ نگاری کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا جب کرشن چندر، بیدی، منٹو، دیوندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، وغیرہ بھی افسانے میں کمال دکھا رہے تھے۔ غلام عباس طویل افسانے نہیں لکھتے تھے بل کہ مختصر نویس تھے۔ آپ افسانہ نگار، ناول نگار، بچوں کے ادیب اور شاعر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد غلام عباس آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور ریڈیو کے ماہانہ رسالے ''آواز'' کے مدیر مقرر ہوئے اور اس کے بعد اُنھوں نے ہندی رسالہ ''سارنگ'' بھی جاری کیا۔ 1929ء میں بی بی سی کے پروڈیوسر بن کر لندن چلے گئے۔ آپ کی پہلی شادی علی گڑھ میں اور دوسری ایک انگریز خاتون سے ہوئی تھی۔ کینیڈا اور امریکہ کے سفر کیے۔ آپ کو شہرت افسانہ نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ آپ کا زور زندگی کی حقیقتوں کو جاننے سمجھنے اور ان کو کم از کم الفاظ میں بیان کرنے پر تھا۔ آپ نے 2 نومبر 1982ء کو وفات پائی، آپ کی تدفین کراچی میں ہوئی۔

تصانیف: بکری۔ آنندی۔ جاڑے کی چاندنی۔ کن رس۔ گوندنی والا تکیہ۔ جزیرہ سخن وراں۔ دھنک۔ الحمرا کے افسانے۔ چاند تارے۔ ننھی کی گڑیا۔ برف کی پٹی۔ جلاوطن۔ بے چارہ سپاہی۔ چاند کی بیٹی۔

نمونہ کلام: ''شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔''

تحریر: اقرا شبیر

عبدالحمید عدم
1910ء تا 1981ء

عبدالحمید عدم 10 اپریل 1910ء کو گوجرانوالہ کے ایک گاؤں تلونڈی موسیٰ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اسلامیہ سکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک پاس کیا۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں ملازمت کے سلسلے میں عراق چلے گئے اور وہاں شادی کر لی۔ 1941ء میں ہندستان واپس آئے۔ 1948ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے۔ 1966ء میں ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ عدم نے اپنی شاعری کا آغاز ان دنوں میں کیا جب اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے روشن ستارے جگمگا رہے تھے۔ آپ کی وجہ شہرت رومانوی شاعری ہے جس کی وجہ سے آپ بے حد مقبول ہوئے۔ آپ نے غزل کو موضوع بنایا اور قطعات بھی لکھے۔ اُن کی غزلوں میں ہلکا ہلکا سوز بھی ہے اور عشق و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی۔ اُنھوں نے روایتی موضوعات، خم و گیسو، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور شیشہ و سنگ کا استعمال کیا جو نیا پن نہ ہونے کے باوجود بھی نیا ذائقہ ضرور دے جاتے ہیں، ایک طرح سے اُنھوں نے روایتی غزل کو مزید آب دار کیا۔ عدم نے 1960ء میں عمر خیام کی رباعیات کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا جسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خیام اور عدم کا فلسفۂ زندگی اور شاعری کا انداز ملتا جلتا ہے۔ اُنھوں نے ''ہیر وارث شاہ'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا جو ''داستانِ ہیر'' کے نام سے شایع ہوا۔ آپ نے پہلے اختر اور پھر عدم تخلص استعمال کیا۔ آپ نے زندگی کا زیادہ تر حصہ مے خانے میں گزارا۔ آپ نے 10 مارچ 1981ء میں لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: خرابات۔ نگار خانہ۔ چارہ درد۔ رم آہو۔ نقشِ دوام۔ شہرِ خوباں۔ پیچ و خم۔ قول و قرار۔ گردشِ جام۔ چاک پیرہن

نمونہ کلام:

کر دیا موسیٰ کو جس چیز نے بے ہوش عدم — بے حجابی نہیں وہ نیم حجابی ہوگی

میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا — ورنہ سفرِ حیات کا کافی طویل تھا

اے عدم احتیاط لوگوں سے — لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

تحریر: مصدف سلیم

احمد علی
1910ء تا 1994ء

احمد علی یکم جولائی 1910ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزاپور اور اعظم گڑھ میں زیرِ تعلیم رہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے انٹر کیا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ 1931ء سے 1941ء تک لکھنؤ یونی ورسٹی میں ہی انگریزی کے استاد رہے۔ بی بی سی کے نمایندے کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ پریسیڈینسی کالج میں انگریزی کے شعبے کے سربراہ رہے اور بنگال سینئر تعلیمی سروس میں شمولیت اختیار کی۔ 1948ء میں وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد، وہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے پرو موشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے کہنے پر 1950ء میں پاکستان فارن سروس میں شمولیت اختیار کی۔ اُنھوں نے پاکستان کے پہلے سفیر کے طور پر چین کا دورہ بھی کیا اور 1951ء میں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قایم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ احمد علی کا شمار سماجی حقیقت پسندی کے افسانے لکھنے والے اولین لوگوں میں ہوتا ہے۔ جب اُنھوں نے لکھنا شروع کیا اُردو میں رومانیت زور پر تھی۔ احمد علی کا پہلا اُردو افسانہ 'مہاوٹوں کی ایک رات' کے نام سے 'ہمایوں' کے سالنامہ جنوری 1932ء میں شایع ہوا۔ پھر اسی سال چھپنے والی متنازعہ کتاب 'انگارے' میں بھی اس کو شامل کیا گیا جس کی ساری کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ احمد علی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ وہ ناول نگار، شاعر، تنقید، مترجم سفارت کار اور عالم تھے۔ ان کا پہلا انگریزی ناول Twilight in Delhi کے نام سے شایع ہوا جو عرصے تک گفتگو کا موضوع رہا۔ انگریزی نظموں کے دو مجموعے بھی شایع ہوئے۔ غالب کی غزلوں کے انگریزی ترجموں کو بھی احمد علی کے اہم ترین کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ 14 جنوری 1994ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: شعلے۔ ہماری گلی۔ قید خانہ۔ موت سے پہلے۔ رات کے سمندر میں۔ رات کے چوہی۔ جامنی سنہری چٹان۔ جیل ہاؤس۔ دلی کی شام۔

نمونہ کلام: "میر صاحب غصہ سے کھولتے ہوئے باہر چلے گئے۔ گرمیوں کی شام تھی۔ ابھی تک گلی کوچوں سے گرمی کے بھپکے نکل رہے تھے۔ سڑک پر لوگ اپنی اپنی دکانوں کے سامنے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔"

تحریر: رابعہ فیاض

ن۔م راشد
1910ء تا 1975ء

اصل نام نذر محمد اور تخلص راشد تھا۔ ن۔م راشد کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اُن کے والد ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ یکم اگست 1910ء کو گوجرانولہ میں پیدا ہوئے اُنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ ن۔م۔ راشد کی مادری زبان پنجابی تھی مگر انھیں انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ راشد کا مشرقی اور مغربی علوم مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ ن م راشد اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب بھی رہے۔ آزاد نظم کو ایک تحریک کی شکل دینے میں راشد کا کردار بڑا اہم ہے۔ جدید اُردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کے حوالے سے راشد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی نظم قاری کے ذہن سے ہم آہنگ ہو کر آسان اور سہل بن جاتی ہے۔ راشد ایک ذہین اور تعلیم یافتہ انسان تھے چناں چہ اُنھوں نے مغربی اَدب کے مطالعے کے بعد اُردو نظم میں جدید لب و لہجے کو متعارف کرایا۔ ان کے ہاں نیا شعور اور نیا احساس ملتا ہے۔ ن۔م راشد کے فن کا کمال نظم میں نظر آیا۔ ن۔م راشد کا سب سے اہم خاصہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو شاعری میں بغاوت کی روایت قایم کی۔ آزاد نظم پہلی مرتبہ ن۔م راشد کی پہچان بن کر اُردو شاعری کے افق پر نمودار ہوئی۔ یہی نہیں اس کے آگے چل کر اُنھوں نے نثری نظم کے عمدہ تجربات کیے۔ راشد کی شاعری میں تہذیبی لاشعور ماضی کی پرزور نفی اور روایت سے انکار کا سراغ ملتا ہے۔ راشد کی نظموں میں چونکا دینے کا انداز، مایوسی بیزاری اور بالادست طبقے کی چیرہ دستیوں کی خلاف احتجاج نمایاں ہے۔ اُنھوں نے 9 اکتوبر 1975ء کو لندن میں وفات پائی اور اُنھیں ان کی خواہش کے مطابق نذرِ آتش کر دیا گیا۔

تصانیف: ماورا۔ ایران میں اجنبی۔ لا=انسان۔ جدید فارسی شاعری۔ گمان کا ممکن۔ روش (ترجمہ)۔ اے میں تمہاری ہوں۔ وقت کا آسمان۔

نمونہ کلام: "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے / زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں / ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو / رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی / ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پالے مرا / اور جرم عیش کرتے دیکھ لے"

تحریر: شاہندہ تحسین

سید وقار عظیم
1910ء تا 1976ء

سید وقار عظیم نے 15 اگست 1910ء کو الہ آباد میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے حاصل کی۔ چھٹی تک کان پور میں پڑھے اور اناؤ سے میٹرک کیا۔ اُنھوں نے 1934ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے بی۔ ٹی کیا۔ سید وقار عظیم نے اپنی تدریس جامعہ الہ آباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شروع کی تھی۔ وہ حکومت ہند کے سرکاری ادبی جریدے "آج کل" کے مدیر بھی رہے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہ محکمہ مطبوعات و فلم کے جریدے "ماہِ نو" کے بانی مدیر مقرر ہوئے۔ سید وقار عظیم نے لاہور آ کر "نقوش" کی ادارت سنبھالی اور 1950ء میں اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے یہ سلسلہ 1970ء تک جاری رہا۔ اس دوران اُنھوں نے اقبال اکیڈمی، مرکزی اُردو بورڈ، مجلس ترقی ادب، مجلس زبان دفتری اور جامعہ پنجاب کے تصنیف و تالیف کے شعبے میں بھی اپنی خدمات کا سلسلہ جوں کا توں جاری رکھا اور ہر کاوش کو نو دو گیارہ کر دیا۔ وہ افسانوی ادب کے اولین نقاد مانے جاتے ہیں۔ غالب کی صد سالہ تقریبات پر اُنھیں پہلا "غالب پروفیسر" بھی مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اُردو کے اعلا پایہ کے ادیب، نقاد، مترجم اور محقق ہیں۔ اُن کا انتقال 17 نومبر 1976ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: افسانہ نگاری۔ داستان سے افسانے تک۔ نیا افسانہ۔ ہماری داستانیں۔ فن اور فن کار۔ ہمارے افسانے۔ شرح اندر سبھا۔ اقبال بہ طور شاعر اور فلسفی۔ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ۔ چند قدیم ڈرامے۔ آغا حشر اور ان کے ڈرامے۔ اُردو ڈراما: فن اور منزلیں۔ افسانہ نگاری۔ اقبال معاصرین کی نظر میں۔ انشا کی تعلیم۔ داستان امیر حمزہ۔ فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ۔ منٹو کا فن۔ ہندستان پانچ ہزار سال پہلے۔ وقار غالب۔ مطالعہ کے بہتر طریقے۔ اقبال ادب۔ اقبال شاعر اور فلسفی۔ اقبالیات کا مطالعہ۔ اُردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ۔

نمونہ کلام: "عصمت نے اپنے ذاتی مشاہدات کو گہرے فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر مکمل طور پر قاری کے مشاہدات بنا دینے کا کام جس طرح "ٹیڑھی لکیر" میں انجام دیا ہے، اب تک کوئی عورت ناول نگار انجام نہیں دے سکی تھی۔" (داستان سے افسانے تک)

تحریر: ابدال رضا

فیض احمد فیض
1911ء تا 1984ء
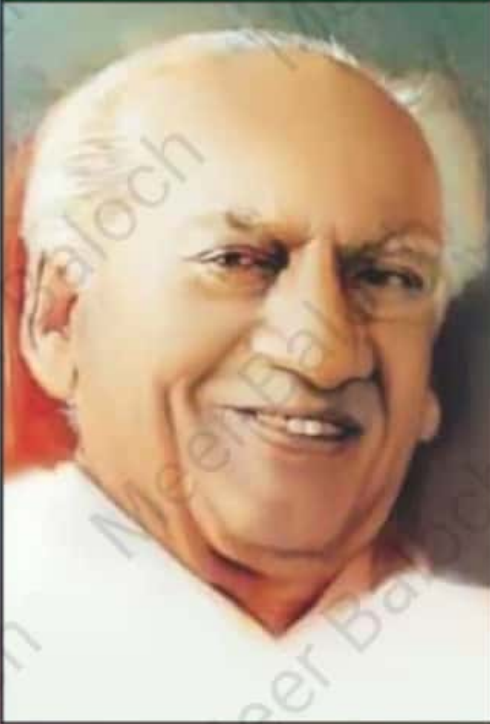
فیض احمد فیض سیالکوٹ کے گاؤں کالا قادر میں 13 فروری 1911ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سلطان محمد خان افغانستان کے امیر عبدالرحمن کے ہاں چیف سیکرٹری بھی رہے۔ فیض نے سکاچ مشن سکول، گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کو مولوی میر حسن سے علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اپنے گھر کے پاس ہی پنڈت راج نارائن ارمان کے ہاں ہونے والے مشاعروں سے فیض شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ 1941ء میں فیض نے ایلس جارج سے سری نگر میں شادی کی۔ فیض فوج میں رہے اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ پاکستان ٹائمز کے مدیر بھی رہے۔ 9 مارچ 1951ء کو فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں معاونت کے الزام میں حکومت نے گرفتار کر لیا۔ آپ نے چار سال، ساہیوال، حیدر آباد سرگودھا، کراچی کی جیلوں میں گزارے۔ جہاں سے آپ کو 1955ء کو رہا کیا گیا۔ 1962ء میں انسان دوستی کی بنیاد پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آپ کو نشان امتیاز، نگار ایوارڈز بھی حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔ آپ صحافی، مصنف شاعر، غنائی شاعر اور نقد نگار بھی تھے۔ فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے عالم شباب میں ہی آپ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ آپ صرف اس تحریک کے رکن ہی نہ تھے بل کہ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں بھی بہت مدد کی۔ آپ ملک سے اس غلامی کی فضا کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ آپ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے، ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو شاعری میں انقلاب بھی آ گیا۔ فیض کی شاعری رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج ہے۔ اُنھوں نے 20 نومبر 1984ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: نقش فریادی۔ دست صبا۔ زنداں نامہ۔ دست تہ سنگ۔ سر وادی سینہ۔ شام شہر یاراں۔ مرے دل مرے مسافر۔ نسخہ ہائے وفا۔ غبار ایام۔ میزان۔ متاع لوح قلم۔ مہ و سال آشنائی۔ قرض دوستاں۔ صلیبیں مرے دریچے میں۔ ہماری قومی ثقافت۔ سارے سخن ہمارے۔

نمونہ کلام:

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے — چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

تحریر: شاذیہ پروین

محمود نظامی
1911ء تا 1960ء

محمود نظامی نے 20 اگست 1911ء کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ اصل نام مرزا محمود علی بیگ تھا۔ اُنھوں نے اپنے نانا نظام الدین بیگ کی آغوش میں تربیت پائی۔ میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں اُنھیں ڈاکٹر تاثیر کی صحبت نصیب ہوئی۔ نظامی کے اَدبی ذوق کی تربیت میں ڈاکٹر تاثیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ 1940ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے اور ریڈیو پاکستان سے جڑے رہے۔ وہ کچھ مدت کے لیے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ محمود نظامی انگریزی اور اُردو اَدب کا مذاق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نشری تکنیک پر بھی اُنھیں عبور حاصل تھا۔ اپنی زیرِ ہدایت کئی ڈرامے نشر کیے اور خود بھی لکھے۔ وہ بچپن سے ہی خواجہ حسن نظامی سے بہت متاثر تھے۔ ایک دفعہ اپنے والد کے ساتھ خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خواجہ اپنے نوجوان عقیدت مند کی ذہانت اور صلاحیت سے بہت خوش ہوئے اور ازراہِ محبت اُنھیں اپنی کتابیں دیں اور کہا کہ "صاحب زادے آج سے تم نظامی ہو"۔ اُنھوں نے اس نسبت کو خوشی اور فخر سے قبول کیا اور محمود بیگ کے بہ جائے محمود نظامی کہلانے لگے۔ اُنھوں نے اُردو اَدب کا پہلا جدید سفرنامہ "نظر نامہ" کے نام سے لکھا جو جداگانہ اہمیت کا حامل تھا۔ محمود نظامی اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلہ میں اکتوبر 1952ء کو یونیسکو کے زیرِ اہتمام دوسرے ملکوں کی نشر گاہوں کا جائزہ لینے کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔ واپسی پر اُنھوں نے اپنے اس سفر کی روداد لکھ ڈالی اور اَدبی حلقوں سے خوب داد سمیٹی۔ اُن کی تحریر میں منظر نگاری کے اچھوتے نمونے جا بہ جا ملتے ہیں۔ اُن کا اسلوب سادہ، عام فہم اور شاعرانہ مزاج کا حامل ہے۔ وہ 11 جنوری 1960ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصنیف: نظر نامہ۔

نمونہ کلام: "چھ ایکڑ زمین پر واقع اس ایک سو ساٹھ فٹ بلند عمارت میں جس کا قطر ایک تہائی میل کے قریب ہے اور جس میں کبھی ستاسی ہزار تماشائی بہ یک وقت بیٹھ سکتے تھے، آج بھی ایک ہیبت اور عجب نظر آتا تھا کہ دیکھنے والا اس کی عظمت کا اندازہ کیے بنا نہیں رہ سکتا۔" (نظر نامہ)

تحریر: ابدال رضا

آل احمد سرور
1911ء تا 2002ء

آل احمد سرور 9 نومبر 1911ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ جونس کالج آگرہ سے بی ایس سی اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے انگریزی اور پھر اُردو میں ایم اے کیا۔ 1934ء میں وہ علی گڑھ میں انگریزی کے اور 1936ء میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ایک سال رضا کالج رام پور کے پرنسپل اور بعد میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں بھی رہے۔ 1955ء میں پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی آگئے۔ اور 1958ء میں یہیں سے بہ طور پروفیسر اور صدر شعبہ اُردو ریٹائر ہوئے۔ وہ 18 برس تک انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سیکرٹری اور "ہماری زبان" اور "اُردو اَدب" کے مدیر بھی رہے۔ اُنھوں نے شاعری بھی کی لیکن ان کی وجہ شہرت تنقید نگاری ہے۔ وہ ایک کھلا ذہن رکھنے والے نقاد تھے۔ اُنھوں نے کبھی خود کو کسی گروہ سے وابستہ نہ کیا تھا اور کبھی آزادیٔ فکر و نظر کا سودا نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک کو اُنھوں نے وقت کا تقاضا قرار دیا لیکن جب ترقی پسند اَدب، اَدب نہیں رہا تو وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ اُن کی تنقید کی خاص بات ان کا دل نشین اسلوب ہے جس میں سادگی و رعنائی دونوں ہیں۔ اُنھوں نے 9 فروری 2002ء کو دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف: سلسبیل۔ خواب باقی ہیں۔ تنقیدی اشارے۔ تنقید کیا ہے؟۔ نئے اور پرانے چراغ۔ اَدب اور نظریہ مسرت سے بصیرت تک۔ ذوقِ جنوں۔ خواب اور خلش۔ افکار کے دیے۔ ہمارا اَدب۔ فکرِ روشن۔ دانش ور اقبال۔ ہماری تعلیمی صورت حال۔ ہندستان کدھر۔ نظر اور نظریے۔ پہچان اور پرکھ۔ سوال نامہ اُردو رسم خط۔ اُردو تحریک۔ میرے گھر میں اجالا۔ کلیات آل احمد سرور۔ لفظ۔ کچھ خطبے کچھ مقالے۔ اقبال کے مطالعے کے تناظرات۔ عرفان اقبال۔ اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری۔ اقبال اور ان کا فلسفہ۔ ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب ایک تنقیدی جائزہ۔ ہندستان میں تصوف۔ حرف سرور۔

نمونہ کلام:

ہم جس کے ہو گئے وہ ہمارا نہ ہو سکا
یوں بھی ہوا حساب برابر کبھی کبھی

"اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بل کہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے۔" (تنقید کیا ہے)

تحریر: محمد آصف

اسرار الحق مجاز
1911ء تا 1955ء

اسرار الحق مجاز 19 نومبر 1911ء کو قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا حقیقی نام اسرار الحق تھا اور مجاز تخلص کرتے تھے۔ مجاز تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے اور پھر اپنے نام کے ساتھ لکھنوی لکھنا شروع کر دیا۔ مجاز نے 1935ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ یہاں ان کی ذہانت اور حاضر جوابی زبان زدِ عام تھی۔ 1936ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے شایع ہونے والے رسالے "آواز" کے پہلے مدیر بنے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے کچھ عرصہ بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں بھی کام کیا اور پھر "نیا اَدب" اور "پرچم" کی ادارت بھی کی۔ اس کے بعد ہارڈنگ لائبریری سے منسلک ہو گئے۔ مجاز کی مختصر زندگی کا خاصہ ان کی شاعری تھی۔ اُن کی سب سے مشہور اور بہترین کتاب "آوارہ" ہے جس کے چند بند 1953ء میں بنی فلم "ٹھوکر" میں گلوکار طلعت محمود کی آواز میں بہت مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ مجاز نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں۔ مجاز، انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ مجاز نے جس طرح سرمایہ داری نظام کی مذمت کی ہے اس کی مثال اُردو اَدب میں بہت کم ملتی ہے۔ اُن کی شاعری میں اس گھٹن کی تصویر ہے جس سے اس دور کا معاشرہ اور اس وقت ہر نوجوان گزر رہا تھا۔ اُن کی شاعری میں پیغامِ عمل اور فرسودہ، جارحانہ، غیر ملکی حکومت کی سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں ملتے ہیں۔ اپنی عشقیہ شاعری میں قلبی واردات اور احساسات کو دل کش اور موثر انداز میں پیش کیا۔ اُن کی انقلابی شاعری اور قومی موضوعات پر مبنی نظمیں ہماری تحریک آزادی اور جذبہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ مجاز نے 5 دسمبر 1955ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ حکومت ہند نے 2008ء میں ان کے حوالے سے یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔

تصانیف: کلیاتِ مجاز۔ شب تاب۔ آہنگ۔ آوارہ۔ انتخاب کلام اسرار الحق مجاز۔

نمونہ کلام:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا ۔۔۔ تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے ۔۔۔ میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے

آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی ۔۔۔ دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے

تحریر: ہیبت خان

احتشام حسین
1912ء تا 1972ء

سید احتشام حسین 21 اپریل 1912ء کو ہندستان میں اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبے ماہل میں پیدا ہوئے۔ ماہل میں مشاعرے بھی ہوتے تھے جن میں نامی شعرا شریک ہوتے۔ آپ کے چچا حکیم سید ابو محمد بھی شاعر تھے۔ والد کے اچانک انتقال کے بعد احتشام حسین کے سر گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ ان سخت حالات میں بھی وہ محنت، لگن اور ذہانت کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ماہل، اعظم گڑھ اور الہ آباد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کر کے لکھنؤ یونی ورسٹی میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے پھر الہ آباد یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی شادی 1939ء میں سید حسن عسکری صاحب رئیس قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ کی صاحب زادی ہاشمی بیگم کے ساتھ ہوئی۔ انھیں ہر درجے پر انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر سید احتشام حسین ایک کھرے انسان وسیع المطالعہ اور کشادہ نظر ادیب و شاعر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی تھی اس لیے ان کی تنقید پر مارکسی اثرات کو با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے، اس لیے ان کی تنقید پر مارکسیت کا لیبل لگا ہوا ہے۔ 1954ء میں امریکا کی ایک انجمن نے وہاں ذہنی رجحانات کا مطالعہ کروانے کے لیے مدعو کیا۔ ایک سال بعد امریکا اور لندن سے واپس آ کر اپنے مشاہدات سے سفرنامہ "ساحل و سمندر" لکھا جو بہت مشہور ہوا اور کتابی صورت میں شایع ہوا۔ ان کی ایک درجن سے زائد تنقیدی کتابیں اُردو اَدب کا سرمایہ ہیں۔ اُن پر مارکسیت کا غلبہ تھا مگر اُنھوں نے اعتدال کی راہ اختیار کی تھی لیکن شاعری مارکسیت سے ماورا ہے۔ احتشام حسین کو ترقی پسند نقادوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے بل کہ وہ ترقی پسند تنقید کے روحِ رواں ہیں۔ احتشام حسین کا انتقال یکم دسمبر 1972ء کو الہ آباد میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

تصانیف: اُردو اَدب کی تنقیدی تاریخ۔ اُردو لسانیات کا خاکہ۔ تنقیدی جائزے۔ تنقیدی نظریات۔ تنقیدی اور عملی تنقید۔ روایت اور بغاوت۔ روشنی کے دریچے۔ اَدب اور سماج۔ ہندستانی لسانیات کا خاکہ۔

نمونہ کلام:

کل تو خیر ان کی یاد آتی تھی ۔۔۔ آج کیوں ہے فضا اداس اداس

تیری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو ۔۔۔ جو اک چراغ بجھا سو چراغ جلتے ہیں

تحریر: کشف ماہ نور

سعادت حسن منٹو
1912ء تا 1955ء

سعادت حسن منٹو 11 مئی 1912ء کو سمبرالا ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ منٹو نے میٹرک کا امتحان تین مرتبہ دیا اور فیل ہوئے، اسی طرح ایف۔ اے کی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے۔ باری علیگ کے مشورے پر فلمی خبروں سے آغاز کیا پھر ترجمہ نگاری کی طرف آئے اور ایک ناول کا ترجمہ کیا جو "سرگزشت اسیر" کے نام سے چھپا۔ اُنھوں نے انقلاب روس کے موضوع پر آسکر وائلڈ کے ڈرامہ "ویرا" کا ترجمہ کیا جس سے انگریزی حکومت لرز گئی۔ ابتدائی زندگی کی ناکامیوں کے بعد جب وہ فلمی دنیا اور رسالہ "مصور" کے ساتھ وابستہ ہوئے تو اہم کامیابیاں حاصل کیں اور وہ مقام حاصل کر لیا جس کی لوگ خواہش کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد منٹو ترقی پسند تحریک سے متعلق رہے پھر حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہو گئے۔ اُنھوں نے ترقی پسند اَدب کا ترجمان رسالہ "اَدبِ لطیف" جاری کیا۔ منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور انسانی نفسیات سے بھرپور آگاہی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ اُردو اَدب میں حقیقت نگاری کے حوالے سے اہم ترین افسانہ نگار ہیں لیکن دوسری طرف ان پر فحش نگاری اور عریاں نویسی کے مقدمات بھی چلے مگر ان کا انداز نہ بدلا۔ سعادت حسن منٹو بہترین خاکہ نگار بھی تھے۔ ان کے خاکوں میں حقیقت نگاری کا واضح رنگ نظر آتا ہے اُنھوں نے اختصار نویسی اور کفایت لفظی کے ساتھ اعلا پائے کے خاکے لکھے۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز تراجم سے کیا اُنھوں نے ابتدا میں روسی اور فرانسیسی افسانوں کے ترجمے کیے، انارکلی نام سے ڈرامہ لکھا۔ کالم اور مضامین بھی تخلیق کیے۔ منٹو نے 18 جنوری 1955ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: خالی بوتلیں خالی ڈبے۔ اوپر نیچے اور درمیان۔ رتی، ماشہ، تولہ۔ سرکنڈوں کے پیچھے۔ شکاری عورتیں۔ نمرود کی خدائی۔ ٹھنڈا گوشت۔ سیاہ حاشیے۔ تلخ ترش شیریں۔ لاؤڈ سپیکر۔ گنجے فرشتے۔ انارکلی۔ منٹو نامہ۔ ویرا (ترجمہ)۔ سرگزشت اسیر۔ پگڈنڈی۔ نقوش۔

نمونہ کلام: "کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔" (نیا قانون)

تحریر: عالیہ سعید

میرا جی
1912ء تا 1949ء
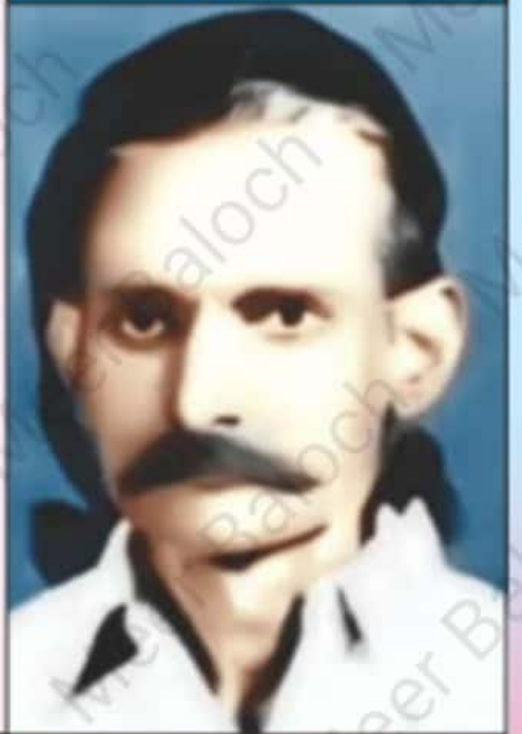
میرا جی کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا۔ وہ 25 مئی 1912ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے "ساحری" تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں بنگالی لڑکی "میرا سین" کے ساتھ یک طرفہ محبت کے باعث اُنھوں نے اپنا تخلص "میرا جی" رکھ لیا۔ میرا جی حلقہ ارباب ذوق کے علاوہ تنقید اور مغربی ادب سے بھی وابستہ رہے۔ میرا جی کے والد ریلوے انجینئر تھے اس کی وجہ سے میرا جی کی تعلیم بھی مختلف مقامات پر ہوئی مگر وہ میٹرک پاس نہ کر سکے۔ میرا جی بہت ذہین انسان تھے جس کی بدولت چھوٹی عمر میں ہی نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ میرا جی نے اپنی زندگی فقیرانہ انداز میں گزار دی۔ لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں اور عجیب و غریب لباس جس سے لوگوں کو کراہت محسوس ہوتی تھی۔ اُنھوں نے مغربی علوم اور مغربی زبانوں پر دسترس حاصل کی اردو شاعری اور تنقید میں گراں قدر کارنامے سرانجام دیے۔ "ادبی دنیا" کے مدیر اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ بیتیں گیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھیں باقی شاعر بھی قرار دیا گیا۔ اُنھوں نے غزل، گیت، آزاد نظم اور معرا نظم میں نئے موضوعات کو شامل کیا۔ ان کو اردو نظم کا مجدد تسلیم کیا گیا ہے۔ میرا جی کا شمار اردو کے جدید نقادوں میں ہوتا ہے اُنھوں نے نفسی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ میرا جی کا اساسی نظریہ ہے کہ "شعر و ادب زندگی کے ترجمان ہیں"۔ میرا جی تحسین کے ساتھ ساتھ تنقیص کے بھی قائل تھے۔ اردو تنقید نگاری میں میرا جی کی یہ انفرادیت ہے کہ اُنھوں نے صرف نظریہ سازی نہیں کی بلکہ ان کے عملی اطلاق سے شعرا کو تخلیقات کے حوالے سے جاننے کا بھی شعور پیدا کیا۔ "نگار خانہ" سنسکرت شاعر دامودر گپت کی کتاب جب کہ "خیمے کے آس پاس" عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ ہے۔ وہ 3 نومبر 1949ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: میرا جی کے گیت۔ میرا جی کی نظمیں۔ گیت ہی گیت۔ پابند نظمیں۔ کلیات میرا جی۔ تین رنگ۔ مشرق و مغرب کے نغمے۔ اس نظم میں۔

نمونہ کلام: کیوں نہ رنگ گل اک کلی بنتا ہے اور کھلتا ہے پھول — پھول کھلتے ہیں اگر کھل کر وہ مرجھاتے ہیں کیوں
نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستا بھول گیا — کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا

تحریر: [illegible] شفیق

اختر حسین رائے پوری
1912ء تا 1992ء

اختر حسین رائے پوری 12 جون 1912ء کو رائے پور میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے رائے پور، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور سوربون یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ایم۔اے۔ او کالج امرت سر میں پروفیسر اور وائس پرنسپل بھی رہے۔ آپ کی شادی حمیدہ بیگم سے ہوئی جو خود بھی افسانے اور ناول لکھتی تھیں۔ وہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد محکمہ تعلیم میں ڈپٹی سیکرٹری اور مرکزی وزارتِ تعلیم میں بھی مشیر رہے۔ اس کے علاوہ کراچی ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین اور یونیسکو کراچی شاخ کے اولین ڈائریکٹر رہ کر آخری عمر تک وزیٹنگ پروفیسر کراچی یونی ورسٹی میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اُن کی پہلی اور اہم شناخت بہ طور افسانہ نویس ہوئی۔ اُنھوں نے اُردو تراجم بھی کیے۔ وہ اُردو، انگریزی، ہندی، سنسکرت، گجراتی، بنگالی اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ ترقی پسند تحریک کے انتہائی اہم رکن تھے۔ تاریخی وتنقیدی کتب میں ''جبش اور اطالیہ''، ''اَدب اور انقلاب''، ''سنگِ میل'' اور ''روشن مینار'' یادگار مطبوعہ کتب ہیں۔ تراجم میں گورکی کی آپ بیتی، مقالاتِ گارساں دتاسی کے علاوہ سوانح نگاری کے ذیل میں ''گردِ راہ'' شامل ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو ترقی پسند تحریک میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے مقالے ''اَدب اور انقلاب'' پر ترقی پسند تحریک کی اساس استوار ہے۔ اُن کی تنقید کا پیمانہ روسی اَدب اور مارکسی نظریات ہیں اس لیے کلاسیکی اُردو فن پاروں کی طرف ان کی نظر التفات نہیں ہوتی اور وہ ان کو بھی مارکسی نقطہ نظر سے ہم آہنگ دیکھنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید میں کسی حد تک تعصب در آتا ہے۔ اُنھوں نے 2 جون 1992ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: جبش اور اطالیہ۔ پیامِ شباب۔ مقالاتِ گارساں دتاسی۔ پیاری زمین۔ شکنتلا۔ گورکی کی آپ بیتی۔ روشن مینار۔ گردِ راہ۔ اَدب اور انقلاب۔ زندگی کا میلہ۔ محبت اور نفرت۔ آگ اور آنسو۔ اَدب اور زندگی۔

نمونہ کلام: ''ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعیِ رائیگاں میں وقت گنواتا ہے''۔

تحریر: محمد نوید

قیوم نظر
1913ء تا 1989ء
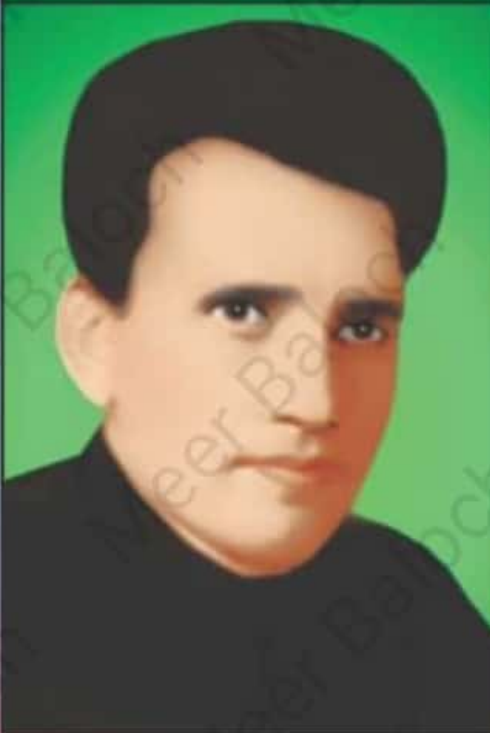
قیوم نظر کا اصل نام عبدالقیوم ہے۔ وہ 7 مارچ 1913ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور پنجابی زبان کے ممتاز شاعر کے علاوہ نقاد، ڈراما نویس اور مترجم تھے۔ وہ اُردو کے ان لکھنے والوں میں شامل ہیں جنھوں نے حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھنے میں اہم حصہ لیا۔ جن میں میراجی، ن م راشد، حفیظ ہوشیار پوری، حمید نظامی، سید نصیر احمد جامعی، اختر ہوشیار پوری، میر اقبال احمد، سید امجد حسین، آفتاب احمد خان، حمید شیخ، صفدر میر، تابش صدیقی، یوسف ظفر اور مختار صدیقی وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔ وہ حلقہ اربابِ ذوق کے اولین معتمد عمومی منتخب ہوئے۔ گورنمنٹ کالج میں اُردو اور پنجابی کے شعبہ جات میں درس و تدریس سے متعلق رہے اور پروفیسر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ قیوم نظر کی شاعری میں اُردو کی کلاسیکی شاعری کا گہرا اثر ہے 1933ء میں ان کی پہلی غزل چھپی تھی۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو نیا مزاج عطا کیا۔ وہ میر تقی میر اور فانی بدایونی کی غزلیہ روایت سے متاثر رہے سیاحت کا شوق تھا ان کی شاعری میں فطرت کے تجربات اچھوتے نوعیت کے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی اُردو غزلوں اور نعتوں کو پنجابی میں منتقل کیا۔ اُن کا مجموعہ کلام ''قلب ونظر کے سلسلے'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ بچوں کے لیے ایک کتاب ''بلبل کا بچہ'' بھی لکھی جس کی نظم بلبل کا بچہ کھاتا تھا کھچڑی پیتا تھا پانی بہت زیادہ مشہور ہوئی۔ وہ اُردو شاعری کے روایتی لہجے اور جدید شعری حسیات کا حسین و متوازن امتزاج رکھتے تھے۔ اُنھوں نے 23 جون 1989ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: پون جھکولے۔ قندیل۔ سویدا۔ واسوخت۔ زندہ ہے لاہور۔ اُردو نثر انیسویں صدی میں۔ امانت بلبل کا بچہ۔ قلب ونظر کے سلسلے۔ آفتاب داغ۔

نمونہ کلام:

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم — کچھ نہ کہہ سکے بہار سے ہم
ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ — خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم
یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں — پھرتے رہے بے قرار سے ہم

تحریر: عروبہ وحید

احسان دانش
1914ء تا 1982ء

اصل نام احسان الحق تھا۔ وہ 2 فروری 1914ء کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی دانش علی غربت کی وجہ سے احسان دانش کو زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ کر سکے۔ انھوں نے صرف پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ مزدوری کر کے گزر بسر کیا کرتے تھے۔ احسان دانش نے لاہور آ کر شاعری کا آغاز کیا ان کی شاعری قدرت اور اس ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں انھوں نے مزدوری کی چوں کہ وہ خود مزدور تھے، اس وجہ سے مزدور اور کمزور طبقے کے لوگوں کے درد کو محسوس کرتے تھے۔ وہ زندگی کی پستی سے بلندی کی طرف سفر کے دوران بہت سے تجربات سے گزرے اور انھیں بڑی قادر الکلامی سے نظم اور غزل کی اصناف میں پیش کیا۔ آپ شاعر، نثر نگار اور ماہر لسانیات تھے۔ اُردو ادب کی کوئی بھی صنف ہو عالمی ادبیات کی کوئی بھی جہت ہو اور معیارِ اَدب کا کوئی بھی اسلوب ہو ہر جگہ اس لافانی ادیب کے افکار کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ احسان دانش ایک دبستان علم واَدب کا نام ہے۔ وہ اُردو ادب کے ایک درخشاں عہد کی نشانی ہیں۔ احسان دانش کو اُردو اَدب میں انتہائی معتبر بزرگ انشا پرداز اور شاعر ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ مذہبی شاعری میں ان کا جوہر نعت میں کھل کر سامنے آیا۔ ان کی نثر میں بھی شعریت محسوس ہوتی ہے۔ آپ کو 22 مارچ 1978ء کو حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ آپ کا نمایاں کام آپ کی آپ بیتی "جہانِ دانش" ہے۔ اُن کا شعری اسلوب ہی ان کی شہرت کا باعث بنا۔ آپ کی شاعری میں سلاست اور روانی تھی لیکن اس کے ساتھ خیال کی ندرت بھی تھی۔ احسان دانش عوامی شاعر تھے۔ 21 مارچ 1982ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

تصانیف: ابلاغ دانش۔ تشریح غالب۔ آغاز سے الفاظ تک۔ فصل و سلاسل۔ زنجیر بحرا۔ ابرنسیان۔ اُردو مترادفات۔ درد زندگی۔ حدیث اَدب۔ لغت الاصطلاح۔ نصیر فطرت۔ میراث مومن۔ حدیث زندگی۔ درد زندگی۔ نوئے کارگر۔ آتش خاموش۔ گورستان۔ زخم و مرہم۔ شیرازہ۔ جہان دانش۔ جہان دیگر۔

نمونہ کلام:

نظر فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا — حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر — نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا

تحریر: ثنا یاسمین

جاں نثار اختر
1914ء تا 1976ء

جاں نثار اختر 8 فروری 1914ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام سید جاں نثار حسین رضوی تھا اور تخلص اختر استعمال کرتے تھے۔ گوالیار میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے اُردو کیا۔ 1940ء میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1943ء میں ان کی شادی صفیہ سے ہوئی۔ پاکستان کی آزادی کے وقت ملک کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے ریاست بھوپال میں رہائش اختیار کی اور حمیدیہ کالج میں صدر شعبہ اُردو و فارسی مقرر ہوئے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ جب حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندیاں لگا دیں تو ترقی پسند تحریک بھی اس پارٹی کی سرگرمیوں کا ایک رخ تھی اس لیے اختر کو نوکری سے استعفا دینا پڑا اور اُنھوں نے پھر ممبئی کی راہ اختیار کی۔ صفیہ آپ کی جدائی میں کڑھ کڑھ کر تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئیں اور انتقال کر گئیں۔ آپ کے دو مجموعہ ہائے خطوط "حرفِ آشنا" اور "زیرِ لب" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ اختر نے بمبئی میں فلموں کے گیت لکھنے شروع کر دیے اور شہرت پائی۔ اُنھیں شاعری کا شوق وراثت میں ملا۔ اُنھوں نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی لیکن اُنھیں زیادہ مقبولیت رباعی صنف میں ملی۔ اُنھوں نے شادی شدہ زندگی اور اس سے متعلقات گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں، غرض میاں و بیوی کا پیار و تکرار اور نفسیات کا حسن خوبصورتی سے رباعیوں میں سمویا۔ اُن کی شاعری کا آغاز رومانوی انداز میں ہوا لیکن یہ رومانویت آہستہ آہستہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر نعرے اور للکار کی صورت اختیار کر گئی جس میں جذبے کی حدت کم اور جھنجھلاہٹ اور کھوکھلا پن زیادہ ہے۔ اُنھوں نے 18 اگست 1976ء کو بمبئی میں وفات پائی۔

تصانیف: سلاسل۔ تارگریباں۔ نذر بتاں۔ جاوداں۔ گھر آنگن۔ خاک دل۔ پچھلے پہر۔

نمونہ کلام:

کس کو معلوم تھا کہ عہدِ وفا — اس قدر جلد ٹوٹ جائے گا
کیا خبر تھی کہ ہاتھ لگتے ہی — پھول کا رنگ چھوٹ جائے گا
محبت کے نغمے ابلتے رہیں — جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں

تحریر: اقرا اقبال

میرزا ادیب
1914ء تا 1999ء

میرزا ادیب 4 اپریل 1914ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام دلاور حسین اور والد کا نام میرزا بشیر علی تھا۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ ابتدا میں شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا مگر بعد میں نثر کو اپنی شناخت بنالیا جس میں افسانہ، ڈراما، سفرنامہ، تنقید، تراجم، تالیفات، بچوں کے لیے کہانیاں غرض ہر صنف شامل ہے۔ جس میں اُنھوں نے گراں قدر تخلیقات پیش کیں جو اُردو کی توقیر میں اضافے کا باعث بنیں۔ میرزا ادیب نے رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیے جن میں سے ''اَدبِ لطیف'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے اور ان کے کئی فیچر اور ڈرامے ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئے۔ اُنھیں ڈرامہ نگاری کے حوالے سے خاص فن کار مانا جاتا ہے۔ میرزا ادیب ان اُدبا میں شامل ہیں جن کے ہاں ڈرامہ خالص شکل میں نظر آتا ہے یعنی وہ افسانے کی ڈرامائی شکل نہیں ہے۔ اُنھوں نے طویل ڈرامے بھی لکھے ہیں اور یک بابی ڈرامے بھی۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسایل پر اعلا درجے کے ڈرامے تخلیق کرتے تھے جن کا اُدبی معیار بھی عمدہ ہے۔ اُن کے مکالمے پر اثر اور جان دار ہونے کے ساتھ ساتھ گہری کاٹ کے حامل بھی ہیں۔ اُن کے ڈراموں کے کردار حقیقی زندگی سے اٹھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ قاری کی ذہنی پستی کی خاطر ڈرامہ قربان نہیں کرتے۔ ان کی اعلا خدمات کے اعزاز میں اُنھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ اُن کی وفات 31 جولائی 1999ء کو لاہور میں ہوئی۔

تصانیف: آنسو اور ستارے۔ فصیلِ شب۔ ستون۔ پس پردہ۔ دستک۔ دیواریں۔ خاک نشین۔ لہو اور قالین۔ مٹی کا دیا۔ ناخن کا قرض۔ شیشے کی دیوار۔ لمحوں کی راکھ۔ شیشہ میرے سنگ۔ جنگل۔ صحرانورد کے خطوط۔ کمبل۔ نانی اماں کی عینک۔ گلی گلی کی کہانیاں۔ صحرانورد کے رومان۔

نمونہ کلام: ''ابا جی مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو ابا جی کیا کریں گے، یہ دیکھنے کے لیے کیا ہوتا ہے کہ میں نے امی جی کا کہنا نہ مانا۔ اُنھوں نے سالن کم دیا تو میں نے زیادہ پر اصرار کیا'' (مٹی کا دیا)

تحریر: صائمہ نورین

نسیم حجازی
1914ء تا 1996ء

نسیم حجازی 19 مئی 1914ء کو ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد شریف حسین تھا۔ برطانوی راج سے آزادی کے وقت آپ کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا پھر باقی ساری زندگی آپ نے پاکستان میں ہی گزاری۔ وہ ایک نام ور تاریخی ناول نگار تھے۔ اُنھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے شعبے سے کیا اور ہفت روزہ ''تنظیم'' کوئٹہ، روزنامہ ''حیات'' کراچی، روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی اور روزنامہ ''کوہستان'' راولپنڈی سے منسلک رہے۔ اُنھوں نے بھی بلوچستان اور سندھ میں تحریکِ پاکستان کو مقبول بنانے میں تحریری جہاد کیا اور بلوچستان کو پاکستان کا حصہ بنانے میں فعال کردار ادا کیا۔ حکومتِ پاکستان نے اُنھیں تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا۔ وہ تاریخی ناول نگاری کی صف میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اُنھیں اُردو میں تاریخی ناول کا امام کہا جاتا ہے۔ اس صنف میں اُنھوں نے شرر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اُنھوں نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے تاریخی واقعات کو جگہ دی ہے۔ اُنھوں نے تاریخ پر مبنی تیرہ ناول، طنز و مزاح پر مبنی چار کتابیں اور ایک سفرنامہ تحریر کیا ہے۔ آپ کے ناول ''آخری چٹان'' اور ''شاہین'' پر ڈرامہ سیریز جب کہ ''خاک اور خون'' پر فلم بھی بنائی گئی ہے۔ اُن کی تصانیف کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے 2 مارچ 1996ء کو راولپنڈی میں وفات پائی۔

تصانیف: خاک اور خون۔ یوسف بن تاشفین۔ آخری چٹان۔ آخری معرکہ۔ اندھیری رات کے مسافر۔ کلیسا اور آگ۔ معظم علی۔ اور تلوار ٹوٹ گئی۔ داستانِ مجاہد۔ انسان اور دیوتا۔ محمد بن قاسم۔ پاکستان سے دیارِ حرم تک۔ پردیسی درخت۔ گمشدہ قافلے۔ پورس کے ہاتھی۔ قافلہ حجاز۔ قیصر و کسریٰ۔ ثقافت کی تلاش۔ شاہین۔ سوسال بعد۔ سفید جزیرہ۔

نمونہ کلام: ''بلوچستان میں یوسف کے قیام کے آٹھ دن ایک دل کش خواب کی طرح گزر گئے۔ اس نے تین دن زیارت میں قیام کیا تھا۔ ایک دن گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں کی سیر کی تھی۔ اگلے دن ایک سکول ماسٹر کی رفاقت میں خلیفت کی چوٹی سے ہو آیا''۔ (پردیسی درخت)

تحریر: اقصیٰ لطیف

خواجہ احمد عباس
1914ء تا 1987ء

خواجہ احمد عباس 7 جون 1914ء کو پانی پت (حالی کے گھر) میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم حالی مسلم ہائی سکول میں حاصل کی جوان کے پرنانا، مولانا حالی نے قایم کیا تھا۔ میٹرک اور بی اے کرنے کے بعد 1935ء میں اُنھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا۔ صحافت کا شوق میدان صحافت میں لے آیا۔ بمبئی کرانیکل کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1936ء میں پہلی تصنیف ''محمد علی'' شایع ہوئی۔ ''ایک لڑکی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جس کے بعد متعدد افسانوی مجموعے ''زعفران کے پھول''، ''پاؤں میں پھول''، ''اندھیرا اجالا''، ''کہتے ہیں جس کو عشق'' اور ڈرامے ''زبیدہ''، ''یہ امرت ہے''، ''چودہ گولیاں'' اور ''انقلاب'' منظرِ عام پر آئے۔ خواجہ احمد عباس افسانہ نگار تھے، ناول نویس تھے، ڈرامہ نگار تھے، صحافی تھے، کالم نگار تھے، فلم ساز تھے اور خاکہ نگار بھی۔ اُنھوں نے سفرنامے لکھے، آپ بیتی لکھی، ڈراموں میں ایکٹنگ کی اور اُردو، ہندی اور انگریزی میں بہت سے مضامین تحریر کیے۔ ان کا سفرنامہ ''مسافر کی ڈائری'' بھی شایع ہو چکا ہے۔ متعدد فلموں کے مصنف اور ڈائریکٹر بھی رہے۔ ''سونے چاندی کے بت'' ان کی شاہ کار تصنیف ہے۔ اُن کی زندگی کا ہر مرحلہ ایک یا دوسری عورت سے متاثر ہوا ہے، یہ اثر اُن کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس یکم جون 1987ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: نئی دھرتی نئے انسان۔ نیلی ساری۔ زعفران کے پھول۔ تین مائیں ایک بچہ۔ بھوک۔ نئی جنگ۔ سونے کی چار چوڑیاں۔ اگر مجھ سے ملنا ہے۔ دریافت۔ دیا جلے ساری رات۔ ایک لڑکی۔ انقلاب۔ کہتے ہیں جس کو عشق۔ میں کون ہوں۔ محمد علی۔ سونے چاندی کے بت۔ زبیدہ۔ یہ امرت ہے۔ چودہ گولیاں۔ مسافر کی ڈائری۔ پاؤں میں پھول۔

نمونہ کلام: ''آؤ مسافری، یہاں! اس چنار کے سایے میں بیٹھ جاؤ میں ابھی پانی پلاتی ہوں...... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمھاری...... پنکچر ہو گیا ہے...... کوئی بات نہیں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے...... اب بیس کوس کی ہی تو بات ہے۔'' (زعفران کے پھول)

تحریر: نبیلہ شوکت

مجید امجد
1914ء تا 1974ء

اصل نام عبدالمجید اور قلمی نام مجید امجد تھا۔ مجید امجد 29 جون 1914ء کو میاں علی محمد کے گھر جھنگ میں پیدا ہوئے۔ مجید امجد ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ اُن کی والدہ اُنھیں اپنے ساتھ اپنے والد کے گھر لے آئیں۔ اُن کے نانا میاں نور محمد نے، جو اپنے وقت کے عالم فاضل بزرگ تھے، مجید امجد کی ابتدائی پرورش کی۔ مجید امجد والد کے زندہ ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئے۔ اُن کی شادی ان کی ماموں زاد سے ہوگئی یہ شادی بھی کام یاب نہ ہو سکی۔ مجید امجد کی زندگی بہت غموں میں گزری۔ جس کی وجہ سے آپ نے اداس شاعری کرنا شروع کر دی۔ زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کی مصوری کرنے والا یہ شاعر اپنی زندگی میں کچھ زیادہ شہرت حاصل نہیں کر سکا کیوں کہ اس کی ساری عمر علم و ادب کے بڑے بڑے مرکزوں سے دور ساہیوال میں ایک معمولی ملازمت میں بسر ہوئی۔ وہ خود بھی کم آمیز، تنہائی پسند اور درویشانہ طبیعت کے مالک تھے۔ مگر ان کی وفات کی بعد نقادوں نے ان کے فن اور ان کی شاعری کی داخلی توانائی اور منفرد لہجے کو پہچانا اور ان کی شاعرانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اُن کی زندگی میں ان کا ایک ہی شعری مجموعہ ''شب رفتہ'' شایع ہوا۔ نظم میں نت نئے ہیئتی تجربات کرنے والے درویش صفت مجید امجد کی وفات کے بعد ان کی شاعری پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں گہرا دکھ اور کرب نمایاں ہے۔ اُنھیں اپنے اردگرد جو ماحول ملا وہ بھی منافقانہ اور مکارانہ رویوں سے بھرا تھا۔ مجید امجد کی شاعری میں دردمندی کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ مجید امجد نے نثری نظم میں بھی اپنی انفرادیت اور فن کاری کا لوہا منوایا ہے۔ مجید امجد کے مشاہدے کی یہ خوبی کہ اشیا کی طرف ان کے جھکاؤ کا انداز جذباتی ہے، تجرباتی نہیں۔ اُنھوں نے 11 مئی 1974ء کو ساہیوال میں وفات پائی اور جھنگ میں دفن ہوئے۔

تصانیف: شب رفتہ۔ شب رفتہ کے بعد۔ لوحِ دل۔ آٹو گراف۔ کلیاتِ مجید امجد۔

نمونہ کلام: ''کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی / چوں چوں، چڑ چڑ چہکاتی لالی / بیٹھے بیٹھے اڑ کر / اڑتے اڑتے مڑ کر / بجلی کے ایک تار پہ آ کر بیٹھ گئی ہے / موت کا جھولا جھول رہی ہے''

تحریر: رمشا محمود

کرنل محمد خان
1914ء تا 1999ء

کرنل محمد خان 5 اگست 1914ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اور اعلا تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ لاہور کے اَدبی حلقوں میں آمدورفت کے باعث لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ اسی دوران جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی اور اُنھوں نے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ 1947ء میں جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اُنھوں نے پاکستان کے دفاع میں حصہ لیا۔ 1965ء میں جب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی تو کرنل محمد خان نے 'رن کچھ' کے محاذ پر خدمات سرانجام دیں۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر ترقی کی منزل طے کر کے کرنل کے عہدہ پر جا کر ریٹائرڈ ہوئے۔ کرنل محمد خان نے ابتدائی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُنھوں نے زیادہ تر مضامین فوجی زندگی کے بارے میں لکھے ہیں۔ ان کے طرزِ بیان میں یہ خوبی تھی کہ قاری اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ جس ماحول میں وہ موجود ہوتے ہیں اس کی تصویر الفاظ میں کھینچ دیتے ہیں۔ واقعات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہونٹوں پر ہنسی آجاتی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ فوج کی زندگی بڑی رنگین اور متنوع اوصاف کی حامل ہے۔ کرنل محمد خان کی وجہ شہرت ان کی کتاب ''بجنگ آمد'' ہے۔ ان کی یہ کتاب سفرنامے کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جب ان کی یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو لوگوں نے اس ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُنھوں نے اپنی فوجی زندگی کو اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ ''بجنگ آمد'' کے بعد ''بسلامت روی'' شایع ہوئی۔ اس کتاب کی بہت تعریف کی گئی۔ اس پر اعتراض بھی ہوا کہ اس میں عورتوں کا بہت ذکر ہیں۔ یورپ میں عورت کو تو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تیسری کتاب ''بزم آرائیاں'' ہے، جس میں ان کا انداز اور مزاج بزمیہ ہے۔ اُنھوں نے 23 اکتوبر 1999ء کو وفات پائی۔

تصانیف: بجنگ آمد۔ بزم آرائیاں۔ بسلامت روی۔ بدیسی مزاح۔

نمونہ کلام: ''ہمیں ہٹلر سے شکایت رہے گی کہ اس نے دوسری جنگ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا'' (بجنگ آمد)

تحریر: انعم ستار

عزیز احمد
1914ء تا 1978ء

پروفیسر عزیز احمد 11 نومبر 1914ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام بشیر احمد تھا۔ عزیز احمد نے ابتدائی تعلیم ضلع عثمان آباد میں مکمل کی۔ 1928ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایف اے کیا۔ 1934ء میں اعزاز کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے بی اے کیا۔ اُن کی اَدبی زندگی کا آغاز تعلیم کے دوران ہی ہوا۔ 1943ء میں ان کی تین اہم منظومات پر مشتمل ایک مجموعہ ''ماہ لقا اور دوسری نظمیں'' شایع ہوا۔ مولوی عبدالحق کی کوششوں سے عزیز احمد کو اعلا تعلیم کے لیے وظیفہ ملا اور وہ انگلستان چلے گئے۔ اس کے بعد کچھ وقت یورپ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ عزیز احمد 1941ء تا 1945ء شہزادی درِ شہوار کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان آگئے اور فلم و مطبوعات کے محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ محکمہ مطبوعات کی ملازمت کے دوران کئی اُردو انگریزی رسالے ان کے زیرِ انتظام پاکستان سے شایع ہوئے۔ 1957ء میں وہ لندن یونی ورسٹی میں اُردو اور ہندی کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوئے جہاں وہ 1962ء تک کام کرتے رہے، اسی سال وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر بن کر کینیڈا کی ٹورنٹو یونی ورسٹی میں شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہو گئے 1965ء میں انھیں پروفیسر بنا دیا گیا اور وہ باقی ساری عمر اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ 1972ء میں اُنھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں یونی ورسٹی آف لندن نے ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ اُردو، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ترکی، اطالوی اور جرمن زبانوں میں گفتگو کر لیتے تھے۔ آپ نے 16 دسمبر 1978ء کو ٹورانٹو (کینیڈا) میں وفات پائی۔

تصانیف: آگ۔ ہوس۔ گریز۔ کلیات عزیز احمد۔ کالج کے دن۔ ماہ لقا اور دوسری نظمیں۔ ایسی بلندی ایسی پستی۔ ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت۔ اقبال اور پاکستانی اَدب۔ اقبال نئی تشکیل۔ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں۔ معمارِ اعظم۔ نسل اور سلطنت۔ ترقی پسند ادب۔ تاریخ تمدن کشمیر۔ عمر خیام۔ تری دلبری کا بھرم۔

نمونہ کلام: ''اس طرح نور جہاں نے پہلی مرتبہ بیگم مشہدی کی تصویر کا دوسرا رخ دیکھا کہ یہ ہنسنے ناچنے والی چالیس سال کی مغرب زدہ خاتون دق کی مریضہ بھی ہے۔'' (ایسی بلندی ایسی پستی)

تحریر: ثمرہ

کرشن چندر
1914ء تا 1977ء

کرشن چندر 23 نومبر 1914ء کو وزیر آباد، گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والد نے کی جو لاہور میں ایک میڈیکل افسر تھے۔ اُنھوں نے 1929ء میں ہائی سکول کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد 1935ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ بعد میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو میں ملازم رہے پھر بمبئی چلے گئے اور فلموں میں کہانیاں لکھنا شروع کی۔ یہ ریڈیو کے ساتھ کافی وقت تک منسلک رہے اور ریڈیو میں اپنے کام کی مہارت سے کافی نام کمایا۔ اُنھوں نے اپنا زیادہ وقت کشمیر میں گزارا۔ رومانیت اور حقیقت پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی خاص لگاؤ تھا۔ کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے خاص نمایندوں میں سے تھے۔ اس تحریک میں آپ نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ آپ نے اس تحریک کے عروج کو دیکھا۔ اُن کی وابستگی رومانیت اور حقیقت پسند تحریک دونوں کے ساتھ تھی۔ کرشن چندر کی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کا رومانی طرزِ نگارش ہے۔ وہ طبعاً رومانی فن کار تھے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اس رومانی فضا میں کھوئے نہیں رہے، جلد ہی اس فضا سے نکل کر وہ حقائق کی دنیا کی طرف گامزن ہو گئے۔ ان کی وجہ شہرت ان کے افسانوں میں حسن فطرت کی وجہ سے ہے۔ اُن کے مشاہدے کی دنیا بڑی وسیع تھی۔ ان کے زاویہ نظر میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلی آ رہی ہے۔ ''ان داتا'' میں تو کرشن چندر رومان پرست کے بجائے تلخ حقیقت نگار اور انقلاب پسند کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ کرشن چندر تقسیم ہند کے مخالف تھے اور انھوں نے 1947ء کے فسادات کے حوالے سے بہت لکھا ہے۔ اُن کا انتقال 8 مارچ 1977ء کو بمبئی میں ہوا۔

تصانیف: ہم وحشی۔ طلسم خیال۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔ کالو بھنگی۔ کتاب کا کفن۔ گدھے کی واپسی۔ ہوائی قلعے۔ چاندی کا کماؤ۔ آدھا راستہ۔ آسمان روشن۔ پشاور ایکسپریس۔ پورے چاند کی رات۔ تین غنڈے۔ شکست۔

نمونہ کلام: ''میرا خاوند زندہ ہوتا تو تمھاری طرح باتیں کرنے والوں کی زبان کھینچ لیتا اور تمھاری چوٹی پکڑ کر اس طرح گھسیٹتا کہ تمھارے موم سے چمکتے ہوئے سر ایک گھڑی میں گنجے ہو جاتے''

تحریر: سحر دلشاد

رحمان مذنب
1915ء تا 2000ء

رحمان مذنب 15 جنوری 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تربیت عالم گیری مسجد لاہور کے مہتمم مفتی عبدالستار کے گھرانے میں ہوئی۔ اُن کے خاندان کے ایک بزرگ مفتی عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد تھے۔ رحمان مذنب کی خوبی یہ تھی کہ وہ بچپن میں ہی مطالعے کا شوق رکھتے تھے اور انھوں نے افسانوں کے مطالعے میں کافی وقت صرف کیا۔ اس طرح وہ افسانہ لکھنے لگے اور ساتھ ساتھ شاعری میں بھی قلم آزمائی کرنے لگے لیکن شاعری میں وہ ناکام ہو گئے۔ اُنھوں نے شاعری اس لیے بھی چھوڑ دی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ شاعری تو اشاروں کنایوں کا کھیل ہے جب کہ افسانہ تو زندگی کے ہر زاویے کی تشریح کرتا ہے۔ رحمان مذنب نے افسانہ نگاری کا آغاز 1937ء سے کیا۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں جن میں سے چند ایک پر اُنھیں ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ وہ شہرت کے متمنی نہ تھے۔ وہ ان خوش قسمت افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے فن کی تحسین ان کی زندگی میں مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا''، مولانا حامد علی خان مدیر ''ہمایوں''، شاہد احمد دہلوی مدیر ''ساقی'' نے بھی کی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے مستقل رکن تھے۔ وہ جنس کی نفسیات پر کہانیاں لکھنے کے حوالے سے معروف ہیں۔ وہ صحافی، ڈراما نگار، افسانہ نگار، نقاد، محقق اور اعلا پائے کے ادیب تھے۔ اُن کا آخری افسانہ 1999ء میں شائع ہوا، یوں ان کی افسانہ نگاری کا دورانیہ ساٹھ سال کے عرصے پر محیط رہا۔ اُنھوں نے 16 فروری 2000ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

تصانیف: گل بدن۔ خوشبو دار عورتیں۔ تہذیب و تمدن اور اسلام۔

نمونہ کلام: ''ڈاکٹر نے پیسے کی آمد نہ روکی لیکن اس نے پیسہ کمانے کے لیے کسی کو تنگ بھی نہیں کیا۔ اپنے آپ پیسہ آتا۔ وہ بڑی محنت سے کام کرتا۔ امیر سے امیر اور غریب سے غریب مریض پر ایک جیسی توجہ دیتا۔ پوری احتیاط سے معائنہ کرتا۔ یوں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا۔ مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی اور وہ زیادہ وقت دینے لگا۔ دن کو کبھی کبھی دو دو بج جاتے اور رات کو دس دس۔'' (گل بدن)

تحریر: محمد عمیر

عصمت چغتائی
1915ء تا 1991ء

عصمت چغتائی 21 اگست 1915ء کو بدایوں کے متوسط مسلم گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کا آبائی وطن بھوپال ہے جب کہ آگرہ میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اردو کے افسانوی ادب میں عصمت چغتائی ایک اہم نام ہے۔ وہ ایک بے باک، نڈر اور باغیانہ ذہن رکھنے والی ادیبہ تھیں۔ عصمت نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔ 1937ء میں اسلامیہ گرلز ہائی سکول بریلی میں ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ کچھ عرصہ جودھ پور میں ملازمت کی اور بعدازاں ممبئی میں انسپکٹریس آف سکولز ہوئیں اور سپرنٹنڈنٹ آف سکولز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ 1948ء میں مشہور افسانہ نگار، مصنف وہدایت کار شاہد لطیف سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ عصمت کے خاوند فلموں میں ہدایت کار تھے اور اس سے متاثر ہو کر عصمت نے بھی فلموں کے مکالمے اور کہانیاں لکھنا شروع کر دیں اور بعدازاں کچھ فلمیں خود بھی بنائیں۔ انھوں نے اپنا کام خاوند کی وفات کے بعد بھی جاری رکھا۔ عصمت چغتائی نے تقریباً 13 فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فرائڈ کے نظریے کی پیروکار تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے قدامت پرستی کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ عصمت چغتائی ایک ممتاز فکشن نگار اور اُردو ادب میں نئے افسانے کی معمار ہیں۔ ان کے ناولوں کو بھی بہت شہرت ملی۔ ان کی وجہ شہرت جنسی معاملات پر مبنی ان کا افسانہ ''لحاف'' ہے۔ عصمت نے اپنے جنسی رجحان اور بے باکی اور باغیانہ سوچ کی وجہ سے خاصی شہرت پائی۔ عصمت چغتائی نے ممبئی میں 24 اکتوبر 1991ء کو وفات پائی۔

تصانیف: ضدی۔ ٹیڑھی لکیر۔ تین اناڑی۔ عجیب آدمی۔ معصومہ۔ لحاف۔ بدن کی خوشبو۔ چوٹیں۔ ایک قطرہ خون۔ چھوئی موئی۔ چوتھی کا جوڑا۔ دوزخی۔ سودائی۔ تاویل۔ دھانی۔ بانکپن۔ شیطان۔ ہنستے ہنستے۔ ہیروئن۔

نمونہ کلام: ''جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں تو پاس کی دیواروں پر اس کی پرچھائیاں ہاتھی کی طرح جھومتی ہیں اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے'' (لحاف)

تحریر: ثمرہ شہزادی

راجندر سنگھ بیدی
1915ء تا 1984ء

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ مطالعے کا شوق اپنے والد سے وراثت میں پایا۔ میٹرک کرنے تک آپ چھ ہزار کہانیاں پڑھ چکے تھے۔ کالج میں داخلہ لیا مگر والدہ کی وفات کی وجہ سے تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے اور ڈاک خانے میں نوکری سے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ محسن لاہوری کے نام سے راجندر سنگھ کی ادبی زندگی کا آغاز 1932ء میں ہوا۔ تقسیم کے بعد دہلی چلے گئے اور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر رہے اور بہت شہرت پائی۔ پھر ممبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ آپ نے تقریباً ستر فلمیں لکھیں اور ہدایات بھی دیں۔ متوسط اور نچلے طبقے کے مسائل کی منظر کشی ان کے افسانوں میں عروج پر ہے۔ خاص طور پر اس معاشرے کی عورت کے کردار اور مزاج کے اعلیٰ نمونے ان کی تحریر میں ملتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے ہمدردی، محبت، احساس اور رواداری جیسے معصوم جذبات سے اپنی تحریر میں رنگ بھرے۔ بھولا، لاجونتی، کوکھ جلی، بگولی، تلادان، اپنے دکھ مجھے دے دو، دوار، گرہن جیسی تخلیقی کہانیاں ان معصوم جذبات کا حسین ظریفانہ پہلو ہے۔ آپ عورت کی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے صاحب طرز ادیب گردانے جاتے تھے۔ ان کی تحریر میں متوسط طبقوں کے متنوع کرداروں، ان کے رنگا رنگ ماحول اور ان کے درمیان انسانی رشتوں کے ابھرتے جذبات سے ایک ''معنی'' کا جہان پیدا ہوا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندوستانی عورت کے کردار اور مزاج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ آپ کی خدمات کے عوض بھارتی حکومت نے راجندر سنگھ بیدی ایوارڈ شروع کیا۔ ان کا انتقال 11 نومبر 1984ء کو ممبئی میں ہوا۔

تصانیف: دانہ ودام۔ گرہن۔ بے جان چیزیں۔ سات کھیل۔ اپنے دکھ مجھے دے دو۔ جو گیا۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔ یکی بودھ۔ لاجونتی۔ ایک چادر میلی سی۔ دستک۔ بیدی کے افسانے۔ چلتے پھرتے خاکے اور مضامین۔ نیمی لڑکی۔ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی۔ کوکھ جلی۔ مہمان۔ مقدس جھوٹ۔ رانو۔

نمونہ کلام: ''میں تو کہتا ہوں سورج کی کرن بھی کسی گلزار پر اس طرح نہیں کھیلتی جیسے مسکراہٹ اس بچے کے چہرے پر کھیل جاتی ہے۔'' (لاجونتی)

تحریر: میر علی رضا جرال

اختر الایمان
1915ء تا 1996ء

اختر الایمان 12 نومبر 1915ء کو گڑھوال میں پیدا ہوئے۔ اس قلمی نام کو چننے کی وجہ یہ تھی کہ اس سے 1334 ہجری کا سال نکلتا ہے جو 1915ء یعنی ان کا سال ولادت ہے۔ اُن کے والد کا نام مولوی فتح محمد تھا۔ اختر الایمان کا پیدائشی نام راؤ فتح محمد رکھا گیا تھا۔ آپ جدید نظم کے مایہ ناز شاعر تھے اور اُنھوں نے بالی وڈ کو بھی خوب سیراب کیا۔ وہ ابتدائی ملازمتوں کے بعد فلموں میں کام کرنے سے پہلے پونے گئے تھے اور پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں تا حیات فلموں میں مکالمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ نے اپنی سوانح اور نظموں میں کئی لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جن سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ اُن کی شادی سلطانہ منصوری سے ہوئی۔ یہ شادی ہندستان کی تقسیم کے دور میں ہوئی تھی۔ اولاد کی تعداد چار ہے جن میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اختر الایمان کا رالف رسل سے گہرا واسطہ تھا۔ اختر الایمان نظم کے شاعر تھے، ان کی تمام نظمیں ہیئت کے لحاظ سے آزاد یا معرا ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ روایتی شعری وضع داری سے خود کو الگ رکھا۔ اُن کی شاعری کو فکری لحاظ سے اس عہد کا ضمیر کہا گیا ہے۔ اُن کا آخری مجموعہ ''زمستان سرد مہری'' کے نام سے ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔ ان کے حلقہ احباب میں میراجی، راجندر سنگھ بیدی، جان نثار اختر اور قاضی سلیم تھے جن سے ان کے گھریلو مراسم تھے۔ اُن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا لیکن وہ اس کے اندھے مقلد نہیں تھے وہ خارج کے ساتھ ساتھ انسان کے داخل کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اس طرح ان میں جذبات کی فراوانی بھی نظر آتی ہے۔ اُنھیں 1962ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اُن کا انتقال 9 مارچ 1996ء کو بمبئی میں ہوا۔

تصانیف: سب رنگ۔ یادیں۔ زمستان۔ سرد مہری۔

نمونہ کلام:

نہ زہر خندلبوں پر، نہ آنکھ میں آنسو — نہ زخم ہائے دروں کو ہے جستجوئے مآل
نہ تیرگی نہ طلاطم نہ سیل رنگ و نور — نہ خار زار تمنا نہ گمرہی کا خیال
نہ آتش گل و لالہ نہ داغ سینے میں — نہ شورش غم پنہاں نہ آرزوئے وصال

تحریر: ہما نذیر

سید ضمیر جعفری
1916ء تا 1999ء

سید ضمیر جعفری نے یکم جنوری 1916ء کو جہلم میں آنکھ کھولی۔ اپنے گاؤں سے ابتدائی تعلیم اور بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا، پھر روزنامہ ''احسان'' سے عملی زندگی کا آغاز کیا، حسرت کے رسالے ''شیرازہ'' کے بھی مدیر رہے۔ اس کے بعد فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک ہو گئے جہاں سے 1966ء میں ریٹائرمنٹ لی اور پھر سی ڈی اے کے تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر بن گئے۔ شمالی علاقہ جات کے مشیر اور اکادمی ادبیات پاکستان سے بھی جڑے رہے اور ٹی وی کے لیے پروگرام بھی کرتے رہے۔ اُنھیں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی اور ہمایوں گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ وہ بہ یک وقت صحافی، شاعر اور مزاح نگار تھے۔ اُنھوں نے مزاح نگاری میں ندرت اور جدت سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی۔ اُنھوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی لیکن طنزیہ و ظریفانہ شاعری میں ان کا رتبہ آسمان کی بلندی کو چھوتا نظر آتا ہے۔ اُن کی سنجیدہ شاعری کا موضوع وطن سے محبت ہے۔ اُن کے مزاح میں تلخی کا عنصر کم اور شگفتگی زیادہ ہے۔ اور وہ نچلے متوسط طبقوں کی ناہمواریوں اور مضحکہ خیزیوں کا ذکر بہت دل کش انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے مزاح میں فوجی زندگی، خود پر مزاح، انگریزی مزاح نگاروں کی تقلید، شخصیاتی مزاح، سائنس و ٹیکنالوجی سیاسی سوجھ بوجھ، روزمرہ کے معاملات، تحریف اور واقعاتی مزاح کو اس طرح برتتے ہیں کہ قاری کی طبیعت سے اکتاہٹ میلوں دور بھاگنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور راحت کا جنم ہوتا ہے۔ اُنھوں نے انگریزی شاعری کے اُردو میں تراجم بھی کیے۔ اُنھوں نے 16 مئی 1699ء کو اسلام آباد میں وفات پائی۔

تصانیف: جزیروں کے گیت۔ کھلیان۔ ولایتی زعفران۔ لہو ترنگ۔ مسدس بے حالی۔ گنر شیر خان۔ من میلہ۔ مافی الضمیر۔ ضمیریات۔ رموز وطن۔ من کے تار۔ متاع ضمیر۔ قریہ جاں۔ نشاط تماشا (کلیات)۔ آگ اکتارہ۔ کارراز۔ ہندستان میں دو سال۔ اڑتے خاکے۔ کتابی چہرے۔ جنگ کے رنگ۔ حفیظ نامچہ۔ آزیزی خسر (ناولٹ)۔ گورے کالے سپاہی۔ ضمیر حاضر، ضمیر غائب۔ خد و خال۔ نظر غبارے۔

نمونہ کلام: تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوں میں — جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

تحریر: ابدال رضا

نعیم صدیقی
1916ء تا 2002ء
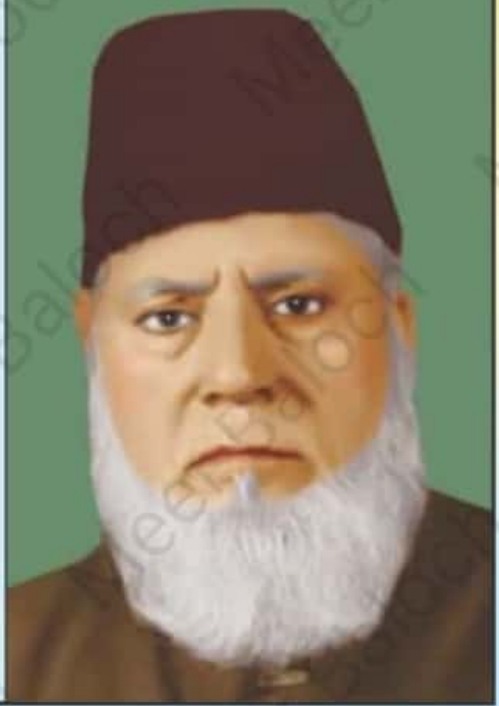
نعیم صدیقی 5 جون 1916ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام فضل الرحمٰن تھا۔ اُن کے والد کا نام قاضی سراج الدین تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں اور خانپور سے حاصل کی، اُنھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد تحریک اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعدازاں پنجاب یونی ورسٹی میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے کسبِ فیض کیا تاہم پارٹی کی قیادت سے ناقابلِ مصالحت اختلاف کی وجہ سے جماعت اسلامی چھوڑ دی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسلامی مذہبی اور سیاسی جماعت "تحریک اسلامی" کی بنیاد رکھی۔ اَدبی زندگی کا آغاز مولانا نصر اللہ خان کی ادارت میں کراچی سے کیا بعد میں ماہانہ "چراغ راہ" میں شامل ہوئے اور نو سال تک مدیر رہے۔ ماہ نامہ "ترجمان القرآن" کے مدیر بھی رہے۔ اُنھیں ایک منفرد انداز کے شاعر ہونے کی حیثیت سے سراہا گیا۔ مولانا نے اپنی مختصر کہانیوں اشعار اور مضامین کے ذریعے اسلامی اَدب اور شاعری کو اجاگر کیا۔ اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ملک نصر اللہ خان کے اخبار "مسلمان" سے ہوا۔ وہ مضمون نگاری اور کالم نویسی بھی کرتے رہے۔ نعیم صدیقی نے حرکت وعمل سے بھرپور ایک طویل اور انتہائی سادہ اور کفایت شعار زندگی گزاری۔ وہ 25 ستمبر 2002ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: محسن انسانیت۔ المودودی۔ تحریکی شعور۔ تحریک اسلام دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل میں۔ حق وباطل۔ اپنی اصلاح آپ۔ ہندستان کے فسادات اور ان کا علاج۔ بنیاد پرستی۔ افشاں۔ پھر ایک کارواں لٹا۔ نور کی ندیاں رواں۔ ہندستان کے فسادات اور ان کا علاج۔ کمیونزم یا اسلام۔ بیمہ زندگی۔ نغمہ احساس۔ بارود اور ایمان۔ دفترِ بے معنی۔ میرا نام ہے تعلیم۔ پیمانہ امروز۔ قومی ملکیت۔ شعلہ خیال۔ ذہنی زلزلے۔ توافق للبقا۔

نمونہ کلام: "جوانی کے دائرے میں قدم رکھنے تک یہ انوکھا بچہ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور شریر بن کر سامنے نہیں آتا بلکہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے۔" (محسن انسانیت)

شب کتنی بوجھل بوجھل ہے ہم تنہا تنہا بیٹھے ہیں
ایسے میں تمہاری یاد آئی جس طرح کوئی الہام آئے

تحریر: جبین رجب

احمد ندیم قاسمی
1916ء تا 2006ء
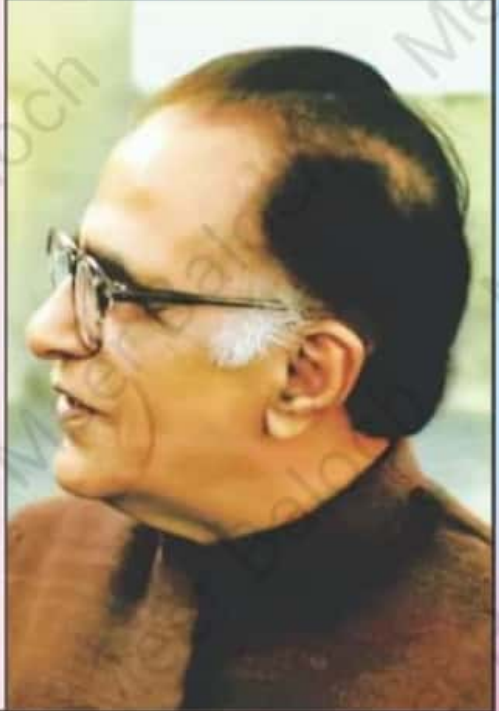
احمد ندیم قاسمی مغربی پنجاب کی وادی سون سکیسر میں ایک گاؤں انگہ ضلع خوشاب میں 20 نومبر 1916ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام احمد شاہ تھا اور اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے جب کہ ندیم آپ کا تخلص تھا۔ اپنے پردادا محمد قاسم کی رعایت سے قاسمی کہلائے۔ اُن کے والد کا نام پیر غلام نبی اور والدہ کا نام غلام بی بی تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ 1920ء میں انگہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس لیا 1932ء میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور چلے گئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے میٹرک کیا اور صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی۔ اے کیا۔ قاسمی کی ابتدائی زندگی مشکلات سے بھری تھی۔ آبائی گاؤں کو خیرباد کہہ کر لاہور پہنچے تو گزر بسر کا کوئی سہارا نہ تھا۔ کئی بار فاقہ کشی کی بھی نوبت آئی۔ انھی دنوں اُن کی ملاقات اختر شیرانی سے ہوئی تو اُنھوں نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ اختر شیرانی کی شاعری اور شخصیت سے آپ کا لگاؤ آخر تک رہا۔ ریفارمر کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ایکسائز سب انسپکٹر کے طور پر ملازمت بھی کی۔ 1931ء میں شاعری کی ابتدا کی۔ اُن کی متعدد نظمیں روزنامہ انقلاب لاہور اور زمیندار لاہور کے سرِ ورق پر شائع ہوتی رہیں اس سے اُن کو عالمِ جوانی میں ہی غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ "ادب لطیف" کے ایڈیٹر اور ریڈیو پاکستان کے سکرپٹ رائٹر بھی رہے۔ انجمن ترقی پسند کے سرگرم رکن اور سیکرٹری بھی رہے۔ پہلا شعری مجموعہ 1942ء میں اُردو اکیڈمی لاہور سے اور پہلا افسانوی مجموعہ 1939ء میں شائع ہوا۔ اُنھوں نے 10 جولائی 2006ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: چوپال۔ بگولے۔ طلوع وغروب۔ گرداب۔ سیلاب۔ آنچل۔ کپاس کا پھول۔ سناٹا۔ دھڑکن۔ رم جھم۔ دشتِ وفا۔ شعلہ گل۔ دوام۔ لوحِ خاک۔ ندیم کی نظمیں۔ ندیم کی غزلیں۔ تہذیب وفن۔ ادب اور تعلیم کے رشتے۔ علامہ محمد اقبال۔

نمونہ کلام:

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

تحریر: شاہد نواز

قدرت اللہ شہاب
1917ء تا 1986ء

قدرت اللہ شہاب 26 فروری 1917ء کو گلگت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اُنھوں نے ریاست جموں و کشمیر اور موضع چمکور صاحب ضلع انبالہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے انگلش کیا۔ 1941ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات سرانجام دیں۔ 1943ء میں بنگال میں متعین ہوگئے۔ آزادی کے بعد حکومت آزاد کشمیر کے سیکرٹری جنرل ہوگئے، بعد ازاں پہلے گورنر جنرل پاکستان غلام محمد، پھر اسکندر مرزا اور بعد میں صدر ایوب خان کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ صدر یحییٰ خان کے دور میں وہ ابتلا کا شکار بھی ہوئے اور یہ عرصہ اُنھوں نے ہالینڈ اور انگلستان کے نواحی علاقوں میں گزارا۔ شہاب نامور اُردو ادیب اور بیوروکریٹ تھے۔ ابتدا میں ان کی شناخت ایک افسانہ نگار کی تھی جنھوں نے "ماں جی" اور "یا خدا" جیسے شاہکار افسانے لکھے۔ جب اُنھوں نے اپنے زمانہ ملازمت پر مبنی اپنی یادداشتیں "شہاب نامہ" کے نام سے لکھیں تو اَدبی اور سیاسی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی۔ "شہاب نامہ" ان کی آپ بیتی بھی ہے اور پاکستان کی سیاسی اشرافیہ کی کارگزاریوں اور اقتدار کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ہونے والی سازشوں اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی داستان بھی ہے۔ شہاب نے پاکستان کے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے "پاکستان رائٹرز گلڈ" قایم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ آخری عمر میں وہ روحانیت کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ اُنھوں نے 24 جولائی 1986ء کو اسلام آباد میں وفات پائی اور اسلام آباد کے سیکٹر H-8 کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

تصانیف: شہاب نامہ۔ یا خدا۔ نفسانے۔ ماں جی۔ سرخ فیتہ۔

نمونہ کلام: "ایک رات میرے کمرے میں اینٹوں اور پتھروں کی جگہ مردار ہڈیاں برسنے لگیں۔ ہڈیوں میں چند انسانی کھوپڑیاں بھی تھیں۔ جا بجا بکھرا ہوا ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا یہ انبار اتنا کریہہ المنظر تھا کہ صبح کا انتظار کیے بغیر میں نے اُنھیں اکٹھا کر کے ایک چادر میں باندھا اور اُنھیں تالاب میں پھینکنے کے لیے باہر لان میں نکل آیا"۔ (شہاب نامہ)

تحریر: محمد اشرف عباس شاہ

شورش کاشمیری
1917ء تا 1975ء

آغا شورش کاشمیری 14 اگست 1917ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام عبدالکریم اور غریب گھرانے سے تعلق تھا۔ معاشی بدحالی کے باعث میٹرک بھی مکمل نہ کر سکے۔ اپنے تعلیمی شوق کو مطالعہ سے پورا کیا۔ "زمیندار" اخبار کی وجہ سے صحافت کا شوق ہوا اور اسی اخبار میں ہی ملازمت شروع کر دی۔ پھر اپنا ہفت روزہ اخبار "چٹان" شروع کیا۔ صحافت کے ساتھ "تحریک شہید گنج" میں بھی حصہ لیا اور جلسوں میں تقاریر کیں جس کی وجہ سے مولانا ظفر علی خان سے قربت پیدا ہوگئی۔ آغا شورش کاشمیری کو اپنی تقاریر کی وجہ سے قریباً بارہ سال پابند سلاسل رہنا پڑا۔ آپ "مجلس احرار اسلام ہند" کے جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری سے متاثر تھے۔ 1974ء کی تحریک ختم نبوت آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔ وہ تب تک چین سے نہ بیٹھ سکے جب تک 1973ء کے آئین میں ختم نبوت کو شامل نہ کرا لیا اور یوں قادیانیوں کو اسلام سے خارج کرانے میں ان کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ سیاسی جدوجہد کے دوران اُنھوں نے زندگی کے ساڑھے بارہ برس قید و بند کی صورت میں بھی گزارے۔ آغا شورش کاشمیری ایک باریک بین صحافی، نڈر سیاست دان اور خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ اُنھوں نے سیاسی شاعری، آپ بیتی، خاکہ نگاری اور سفرنامہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ آپ 25 اکتوبر 1975ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ ابوالکلام آزاد۔ فیضانِ اقبال۔ قیدِ فرنگ۔ قلمی چہرے۔ نورتن۔ کلیات شورش کاشمیری۔ پسِ دیوارِ زنداں۔ موت سے واپسی۔ تحریکِ ختم نبوت۔ فنِ خطابت۔ گفتنی و ناگفتنی۔ اس بازار میں۔ چہرے۔

نمونہ کلام: اب جی رہا ہوں گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ   یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں میں

"میں جب پہلی دفعہ ان سے کراچی میں ملا تو میرے دل پر ان کا ایک خوف سا نقش تھا۔ دوسری دفعہ لاہور میں ملا تو ان کی عظمت نے حواس کو گھیر رکھا تھا۔" (قلمی چہرے)

تحریر: حافظ محمد اویس

شان الحق حقی
1917ء تا 2005ء

شان الحق حقی 15 ستمبر 1917ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد احتشام الدین حقی افسانہ نگار اور فارسی کے جید عالم تھے۔ شان الحق حقی نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے بی اے اور سینٹ سٹیفنز کالج سے ایم اے انگلش کیا۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ آپ ایک شاعر، افسانہ نگار، مترجم، لغت نگار محقق اور نقاد کی حیثیت سے اُردو دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی ابتدائی شہرت ایک شاعر کے طور پر ہوئی اور ان کے مجموعہ کلام "تار پریشاں"، "حرف دل رس" اور "دل کی زبان" کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُن کی دوسری اہم شناخت ایک محقق اور ماہر لغت کی ہے۔ وہ اُردو لغت بورڈ کراچی سے اٹھارہ سال وابستہ رہے اور اُردو کی سب سے بڑی لغت "قومی اُردو لغت" کی تالیف میں معاونت کی۔ آپ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے بھی وابستہ رہے اور اس ادارے کے لیے لسانی تحقیق کے حوالے سے گراں قدر علمی خدمات سرانجام دیں۔ آپ کثیر اللسان محقق تھے۔ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت، ترکی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ان زبانوں کی کتابوں کے اُردو زبان میں شاندار تراجم کیے ہیں۔ جدید آکسفرڈ اُردو انگریزی ڈکشنری آپ ہی کی مرتب کردہ ہے۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز اور تمغہ قائد اعظم بھی دیا گیا۔ انھوں نے پھیپھڑوں کی بیماری کے باعث 11 اکتوبر 2005ء کو کینیڈا میں وفات پائی۔

تصانیف: تار پیراہن۔ نکتہ راز۔ افسانہ در افسانہ۔ خیابان پاک۔ نشید حریت۔ ارتھ شاستر۔ انجان راہی۔ نقد و نگارش۔ مقالات ممتاز۔ شاخسانے۔ مقام غزل۔ بھگوت گیتا (اُردو ترجمہ)۔ درپن درپن۔ انتخاب کلام ظفر۔ قطعات تاریخ اہل قلم۔ لسانی مسائل و لطائف۔ نذر خسرو۔ آئینہ افکار غالب۔ نوک جھونک۔ سہانے ترانے۔ پھول کھلے ہیں رنگ برنگے۔ تیسری دنیا۔ فرہنگ تلفظ۔ اوکسفرڈ اُردو انگلش ڈکشنری۔

نمونہ کلام:

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے ... ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

بڑی تلاش سے ملتی ہے زندگی اے دوست ... قضا کی طرح پتا پوچھتی نہیں آتی

تحریر: فیصل شہزاد

کیفی اعظمی
1918ء تا 2002ء

سید اطہر حسین رضوی، جو کیفی اعظمی کے نام سے جانے جاتے ہیں، 14 جنوری 1919ء کو اعظم گڑھ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام سید فتح حسین رضوی تھا جو تحصیل دار تھے اور بہرائچ میں رہا کرتے تھے، یوں کیفی کے بچپن کے کئی سال بہرائچ میں گزرے اور بعد میں بھی ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور یوں وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے ملاقات کرتے رہتے تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم روایتی اُردو عربی اور فارسی پر محیط ہے۔ انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی نظم لکھی۔ انھوں نے بیسویں صدی میں پیرزادہ قاسم اور جون ایلیا کے ساتھ بہت سے یادگار مشاعروں میں حصہ لیا۔ وہ اپنے وقت کے بہت عظیم شاعر تھے۔ 1947ء میں وہ حیدرآباد آ گئے۔ وہاں انھوں نے ایک مشاعرے میں حصہ لیا۔ جہاں انھیں ایک عورت پسند آ گئی۔ کیفی نے اسی عورت سے شادی کر لی۔ اس عورت کا نام "شوکت اعظمی" تھا۔ بعد میں وہ فلموں اور تھیٹر کی مشہور اداکارہ بنی۔ ایک دفعہ کیفی بمبئی اپنے ایک دوست کی دعوت پر آئے یہاں انھیں قریب دس سال کی جدوجہد کے بعد بالی وڈ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بے شمار نظمیں لکھیں، کیفی بنیادی طور پر نظموں کے شاعر تھے۔ عورت، اندیشہ، ٹرنک کال، حوصلہ، تبسم، مکان اور دوسرا بن باس ان کی مشہور نظمیں ہیں جو ان کی نمایندہ نظموں کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ اُن کو بھارتی حکومت کی طرف سے سوویت لینن ایوارڈ ملا۔ علمی اور فلمی دنیا میں بے شمار کامیابیاں اور شہرت سمیٹنے کے بعد وہ 10 مئی 2002ء کو ممبئی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: آخر شب۔ آوارہ سجدے۔ سرمایہ۔ جھنکار۔ کیفیات۔ خانہ جنگی۔ نئے گلستاں۔

نمونہ کلام:

تیری امید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو ... تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں

انسان کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں ... دو گز زمین بھی چاہیے دو گز کفن کے بعد

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں ... دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں

بستی میں اپنی ہندو مسلماں جو بس گئے ... انساں کی شکل دیکھنے کو ہم ترس گئے

تحریر: زیبا زاہد
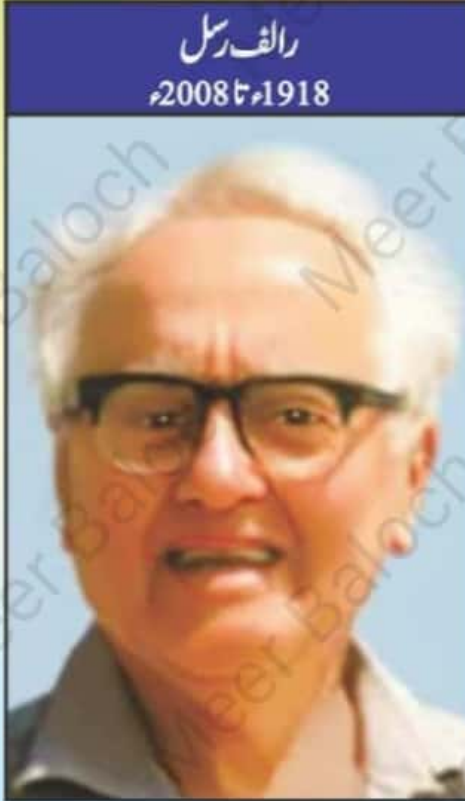
رالف رسل
1918ء تا 2008ء

رالف رسل 21 مئی 1918ء کو لندن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی سولہ سال کی عمر میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔ اُنھوں نے 1940ء میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کی اور دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے پر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ 1942ء میں رالف کو فوجی افسر کے طور پر ہندستان بھیج دیا گیا، یہاں ان کے ساتھی سپاہی اُنھیں اُردو سکھاتے رہے۔ ساڑھے تین برس انڈین آرمی میں گزارنے کے بعد وہ 1945ء میں برطانیہ واپس چلے گئے اور اُردو زبان کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اُنھوں نے لندن یونی ورسٹی سے اُردو زبان میں ڈگری حاصل کی۔ 1949ء میں اُنھوں نے ہندو پاک کا سفر کیا جہاں اُنھوں نے ایک سال علی گڑھ یونی ورسٹی اور اور دیگر جامعات میں اُردو ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ واپس برطانیہ جا کر اُنھوں نے لندن یونی ورسٹی میں اُردو پڑھانا شروع کر دی اور یہ کام وہ 1981ء تک کرتے رہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی اُردو زبان میں تحقیق اور درس و تدریس میں گزار دی۔ وہ لندن یونی ورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اُردو پڑھاتے رہے۔ رسل کے مطابق نئی اصطلاحات کے لیے فارسی و عربی کی بہ جائے انگریزی الفاظ کو قبول کرنا چاہیے۔ اُن کے کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور کام کرنے کو اوقات متعین تھے۔ کرشن چندر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور شوکت تھانوی وغیرہ سے ان کے قریبی روابط تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی پبلشر ان کا ایک لفظ ہی بدل دے۔ اُن کا انتقال 14 ستمبر 2008ء کو لندن میں ہوا۔

تصانیف: The Pursuit of Urdu Literature,How Not to Write the History of Urdu Literature:And Other Essays on Urdu and Islam,An Anthology of Urdu Literature,A New Course in Urdu

نمونہ کلام: "الہ آباد کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہمیں دس دن کی چھٹیاں مری میں گزارنی تھیں۔ مری ایک ہل اسٹیشن ہے یعنی ایک ایسا مقام جو ہمالیہ کی سب سے نیچے پہاڑوں میں واقع ہے۔" (ترجمہ)

تحریر: اقرا اقبال
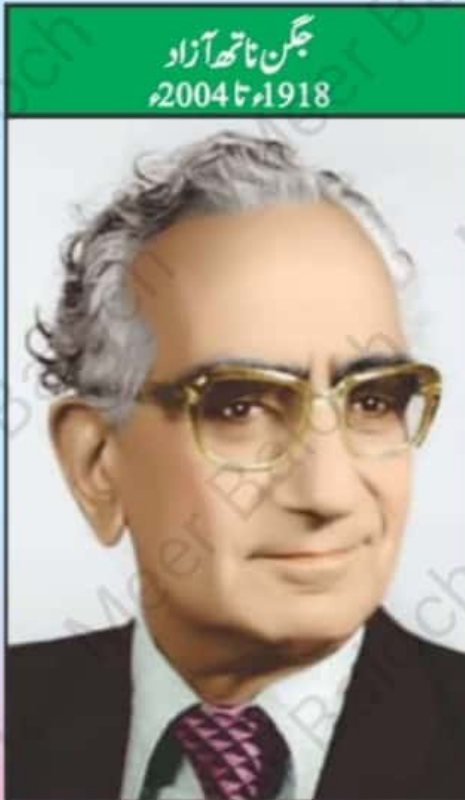
جگن ناتھ آزاد
1918ء تا 2004ء

جگن ناتھ آزاد 5 دسمبر 1918ء کو عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد تلوک چند محروم بھی اُردو کے معروف شاعر تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی، پھر میاں والی، راول پنڈی اور لاہور کے معتبر تعلیمی اداروں میں پڑھتے رہے۔ آپ نے بہت چھوٹی عمر سے ہی اخبارات میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ "آزاد"، "اَدبی دنیا" لاہور اور تقسیم ہند کے بعد "ملاپ" دہلی کے مدیر بھی رہے۔ اُنھیں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر علیم الدین سالک اور سید عابد علی عابد جیسے اساتذہ سے ملنے اور فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہندستان میں وزارت محنت اور وزارت اطلاعات و نشریات سے وابستہ رہے اور ان کے اُردو رسالے کے مدیر بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جموں یونی ورسٹی کشمیر میں صدر شعبہ اُردو بن گئے جہاں اُنھیں ڈی لٹ کی ڈگری پیش کی گئی۔ اُنھوں نے علامہ اقبال کی مشہور فارسی کتاب "جاوید نامہ" کا اُردو ترجمہ کیا اور اقبال کی سوانح عمری "روداد اقبال" بھی لکھی۔ اُنھوں نے متعدد سفرنامے بھی لکھے جب ابھی اُردو میں سفرنامے لکھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ آزاد ایک صحافی، شاعر، مصنف اور ماہر تعلیم تھے لیکن ان کی شاعری ہی ان کی شہرت کی وجہ بنی جن میں ان کے شعری مجموعے "طبل و علم" جو 1948ء میں چھپا اور دوسرا مجموعہ "کلام پیکراں" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نظم "اے سرزمین پاک" کہی جسے 12 اگست 1947ء کو ریڈیو پاکستان سے اس نئے ملک پاکستان کے قومی ترانے کے طور پر نشر کیا گیا۔ اُنھیں ہندستان، چین، روس، کینیڈا اور پاکستان سمیت کئی حکومتوں کی طرف سے اعزازات سے نوازا گیا۔ اُنھوں نے 24 جولائی 2004ء کو دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف: چارسو۔ العطش۔ تعمیر فکر۔ نسیم حجاز۔ اقبال اور مغربی مفکرین۔ نوائے پریشاں۔ طبل و علم۔ کلام پیکراں

نمونہ کلام:

خرد والو! مری دیوانگی پہ طنز کرتے ہو
جنوں میرا شعور انجمن کی آزمائش ہے

یہ کیا طلسم ہے کہ تیری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ دور جا سکوں

تحریر: اقرا شہزادی

مجروح سلطان پوری
1919ء تا 2000ء

مجروح سلطان پوری یکم اکتوبر 1919ء کو سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام اسرار الحسن تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کے سبب لاڈ پیار سے پالا گیا۔ جب مجروح کو سکول بھیجنے کا وقت آیا تو تحریک خلافت شباب پر تھی اس لیے آپ کے والد نے انگریزی کی مخالفت میں آپ کو ایک مقامی مکتب میں داخل کروادیا گیا جہاں سے اُنھوں نے اُردو، فارسی اور عربی پڑھی۔ مجروح ساتویں جماعت تک سکول میں پڑھتے تھے اور بعد میں درسِ نظامی میں سات سالہ عالم کا کورس مکمل کیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے لکھنؤ کے "تکمیل الطب کالج" سے یونانی طریقہ علاج کی تعلیم حاصل کی اور حکیم بن گئے۔ اُنھیں شعروشاعری سے لگاؤ تھا۔ سلطان پور میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جس میں وہ شرکت کیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کی شہرت کا آغاز سلطان پور سے ہوا۔ اُن کی ذہنی تربیت میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جگر مرادآبادی کا بہت ہاتھ ہے۔ مجروح کو رشید احمد صدیقی نے تین سال تک اپنے گھر میں رکھ کر کلاسیکی ادب کا مطالعہ کروایا۔ 1945ء میں جب مجروح، جگر مرادآبادی کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے ممبئی گئے تو اُنھیں خوب پذیرائی ملی اور اس وقت کے مشہور فلمی ڈائریکٹر ان کی شاعری سن کر بہت متاثر ہوئے جنھوں نے مجروح کو فلم کے گیت لکھنے کے لیے پانچ ہزار ماہوار تنخواہ پر رکھ لیا۔ اُن کے لکھے ہوئے گانے بہت مشہور ہوئے۔ مجروح کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے، اس کی پاداش میں اُنھیں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ فلمی زندگی میں اُنھوں نے ساڑھے تین سو اُردو گیت لکھے۔ شاعری اور فلمی گانوں کی وجہ سے اُنھیں پاکستان اور بھارت کے علاوہ روس، امریکہ، کینیڈا، فرانس اور خلیجی ممالک میں انعامات سے نوازا گیا۔ اُنھیں "داداصاحب پھالکے ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا۔ اُنھوں نے 24 مئی 2000ء کو ممبئی میں وفات پائی۔

تصانیف: غزل۔ مشعل جاں۔ کلیات مجروح سلطان پوری۔

نمونہ کلام: میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام — ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

تحریر: اقرا اقبال

محمد حسن عسکری
1919ء تا 1978ء

محمد حسن عسکری 5 نومبر 1919ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جدید اُردو زبان و اَدب میں ہمہ جہت زندگی سے بھرپور نثر لکھنے، اَدب کو صدیوں پر محیط تہذیب کے روحانی تجربے کے طور پر پڑھنے، نشاۃ ثانیہ کے بعد کے مغربی اَدب پر ناقدانہ نظر رکھنے، مشرق و مغرب کی ہر للکار سے آنکھیں چار کر کے اسے اپنی مابعد الطبیعی اقدار کی روشنی میں پرکھنے، زندگی کے گہرے پیچیدہ اور تقدیری مسائل سے نبردآزما ہو کر اُنھیں پاکستان کی ثقافتی روح میں سموتے ہوئے اُردو زبان و اَدب کو ایک جمال آفریں تجربہ بنانے کا خواب دیکھنے والے منفرد نقاد اور ادیب کے طور پر اُردو کا کوئی دوسرا نقاد آج نصف صدی کے بعد بھی محمد حسن عسکری کے سائے کے قریب نہیں پہنچ سکا۔ اُن کی اَدبی زندگی کا آغاز 1939ء میں ہوا۔ ان کی ابتدائی شہرت ایک افسانہ نگار کی تھی مگر اپنے پہلے افسانوی مجموعہ "جزیرے" 1943ء کے آخر میں اُنھوں نے جو اختتامیہ لکھا تھا وہ آج بھی نہ صرف فکشن بلکہ زندگی، اَدب، ثقافت اور مشرق و مغرب کے تہذیبی امتیاز کے بارے ان کے پختہ تنقیدی شعور کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ عسکری کی چالیس سالہ ادبی زندگی میں ان پر بہت سے لیبل چسپاں کیے گئے تھے۔ کبھی اُنھیں تاثراتی نقاد کہا گیا اور کبھی اَدب برائے اَدب کا نقیب مانا گیا لیکن وہ زندگی بھر اپنی تمام تر جہتوں اور ہمہ گیر روایتی تہذیبی اقدار کی کمک کے ساتھ جدید شعورِ حیات و تصورات سے نبرد آزما رہے۔ وہ ایسے نقاد تھے جنھوں نے اپنے زمانے کے ہر اس چیلنج پر نگاہ رکھی جو مغربی نشاۃ ثانیہ کے بعد روایتی تہذیبی اقدار اور مابعد الطبیعیات کے لئے خطرہ ثابت ہوا ہے۔ عسکری کو پڑھنا زندگی بھر کی ریاضت ہے۔ اُن کا انتقال 18 جنوری 1978ء کو کراچی میں ہوا۔

تصانیف: قیامت ہم رکاب آئے نہ آئی۔ جزیرے۔ انسان اور آدمی۔ ستارہ اور بادبان۔ جھلکیاں۔ وقت کی راگنی۔ جدیدیت اور مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ۔ میرا بہترین افسانہ۔

نمونہ کلام: "اب تک تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی آئی تھی مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہونچی تو اسے اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔"

تحریر: طاہرہ حسین

قتیل شفائی
1919ء تا 2001ء

قتیل شفائی مشہور و معروف اُردو شاعر تھے۔ اُن کا پیدائشی نام اورنگزیب خان تھا۔ آپ 24 دسمبر 1919ء کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے 1938ء میں قتیل شفائی کا قلمی نام اختیار کیا۔ آپ کو والد کے انتقال کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ آپ نے کاروبار بھی کیا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد قتیل شفائی نے لاہور میں سکونت اختیار کی، یہاں پر فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور بہت سی فلموں کے گیت لکھے اور اُنھوں نے مجموعی طور پر 201 فلموں میں نو سو سے زائد گیت تحریر کیے۔ قتیل شفائی کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور آدم جی اَدبی انعام جیسے اعزازات ملے۔ قتیل شفائی نہایت مقبول اور ہر دل عزیز شاعر ہیں۔ ان کے لہجے کی سادگی اور سچائی عام فہم زبان کا استعمال اور عوام الناس کے جذبات اور محسوسات کی خوبصورت ترجمانی ہی ان کی مقبولیت کا راز ہے یوں تو اُنھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کا اصل میدان غزل ہے ان کی شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور بھی موجود ہے اور اُنھیں صف اول کے ترقی پسند شعرا میں اہم مقام حاصل ہے۔ فلمی نغمہ نگاری میں بھی ایک معتبر مقام حاصل کیا ان کا کلام پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ قتیل شفائی نے جس گہری نگاہ سے اپنے گرد و پیش کا مطالعہ کیا معروضی حالات سے جو نتائج اخذ کیے اور جس فنی مہارت سے زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس کے حوالے سے قتیل شفائی اپنے دور کے ایک بڑے شاعر بن کر ابھرے۔ 11 جولائی 2001ء کو قتیل شفائی لاہور میں وفات پا گئے اور علامہ اقبال ٹاؤن کے کریم بلاک کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

تصانیف: ہریالی۔ گجر۔ جلترنگ۔ روزن۔ جھومر۔ مطربہ۔ چھتنار۔ گفتگو۔ پیراہن۔ آموختہ۔ ابابیل۔ برگد۔ گھنگرو۔ سمندر میں سیڑھی۔ پھوار۔ صنم۔ پریم۔ انتخاب (منتخب مجموعہ)۔ رنگ خوشبو روشنی (کلیات تین جلدیں)

نمونہ کلام: دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی — جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا
بانٹ رہا تھا جب خدا سارے جہاں کی نعمتیں — اپنے خدا سے مانگ لی میں نے تیری وفا صنم

تحریر: اقرا

حکیم محمد سعید
1920ء تا 1998ء

حکیم محمد سعید 9 جنوری 1920ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مایہ ناز حکیم اور اسلامی مفکر تھے جنھوں نے مذہب اور طب و حکمت پر دو سو سے زائد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ ہمدرد پاکستان اور ہمدرد یونیورسٹی ان کے قائم کردہ اہم ادارے ہیں۔ آپ نے کئی ملکوں کے سفر کیے اور کئی سفر نامے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ اسلام، دین و اخلاق، سیرت، اسلامی ریاست و قانون پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ 1948ء سے 1998ء تک ناظم ہمدرد لیبارٹریز رہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر بھی رہے۔ 1993ء تا 1994ء وہ گورنر سندھ بھی رہے۔ اُنھیں نشانِ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ وہ بچوں اور ان کے اَدب سے بہت شغف رکھتے تھے۔ وہ پاکستان کے بڑے شہروں میں ہفتہ وار مریضوں کو مفت دیکھا کرتے تھے۔ اُنھوں نے ہمدرد کا غیر منافع بخش ادارہ بھی قائم کیا جس کی تمام تر آمدنی تحقیق اور دیگر فلاحی خدمات پر خرچ ہوتی ہے۔ آپ کو 17 اکتوبر 1998ء کو کراچی میں قتل کر دیا گیا۔

تصانیف: اخلاقیات نبوی۔ تذکار محمد۔ تربیت خودی کا ایک لائحہ عمل۔ تصور ریاست اسلامی۔ خودی تعلیمات نبوی درود۔ قرآن مقصد و منہاج۔ نورستان۔ خودی، مفکرین اسلام۔ نظریہ و فلسفہ تعلیم اسلام۔ شاہرہ زندگی۔ عرفانستان۔ فکرستان۔ سب سے بڑے انسان۔ بچوں کے حکیم محمد سعید۔ حکیم عبدالحمید۔ مجھے یہ شخصیت کیوں پسند ہے۔ تجربات طبیب۔ طب اور سائنس۔ تعلیم صحت۔ کتاب الابدان۔ نور کے پھول۔ حلال اور حرام اسلام میں۔ سنہرے اصول۔ نونہالوں کے خطوط۔ تلاش امن۔ داستان لندن۔ فکرِ جوان۔ تین شہروں کا مسافر۔ بالیدگی فکر۔ تاریخ پاکستان اور قائد اعظم۔ روح افزا۔ ہمدرد نونہال۔ حکیم محمد سعید کے طبی مشورے۔ مقالات شام ہمدرد۔ کوریا کہانی۔ ایک مسافر چار ملک۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ سعید پارے۔ ماہ و روز۔ آخری لمحے۔

نمونہ کلام: ''پھانسی کی سزا پانے والے مجرموں کی کوٹھڑی میں بہادر اکیلا اور اداس بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا سا رسالہ تھا۔ بظاہر وہ رسالہ پڑھ رہا تھا لیکن اصل میں وہ صرف تصویروں کو گھور رہا تھا۔''

تحریر: منیزہ خان

عین الحق فریدکوٹی
1920ء تا 1995ء
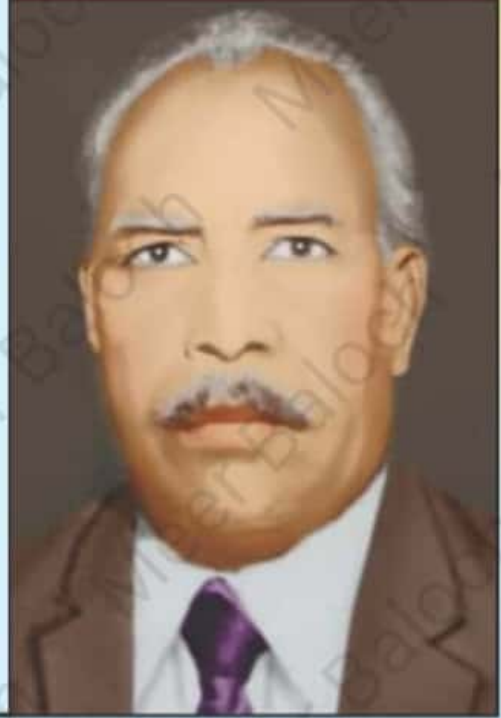
عین الحق فریدکوٹی 24 اپریل 1920ء کو بہ مقام فرید کوٹ، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام فضل الٰہی تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فوج میں بھرتی ہوگئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور 1974ء میں پاک آرمی سے بہ طور صوبیدار میجر ریٹائر ہوئے۔ اُنھیں اُردو اور پنجابی کے حوالے سے اہم ترین اور نظریہ ساز ماہرین لسانیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُن کی سب سے مشہور کتاب "اُردو زبان کی قدیم تاریخ" ہے جو اُن کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے اُردو کے ڈانڈے قدیم دراوڑی زبان سے ملائے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اُردو زبان کا تعلق پنجابی کے توسط سے دراوڑی زبانوں سے جا ملتا ہے کیوں کہ دراوڑی زبانوں کے بہت سے الفاظ پنجابی میں موجود ہیں اور یہیں سے یہ اُردو زبان میں بھی در آئے ہیں۔ اُردو زبان کی پیدائش کے بارے میں ان کا یہ نظریہ بہت اہم تسلیم کیا جاتا ہے اور مستنصر حسین تارڑ سمیت متعدد پنجابی مصنفین جو اپنی اُردو تحریروں میں پنجابی الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ آپ سے مشورہ کرتے تھے۔ عین الحق فریدکوٹی کو اُن کی اس تحقیقی کتاب پر 1972ء میں داؤد اَدبی انعام بھی عطا کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے پنجابی لسانیات اور پنجابی اَدب پر بھی گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ عین الحق فریدکوٹی 17 اکتوبر 1995ء کو لاہور میں وفات پاگئے اور قبرستان سوڈھے وال میں سپرد خاک کیے گئے۔

تصانیف: اُردو زبان کی قدیم تاریخ۔ پنجابی اکھان۔ ہیر چراغ اعوان۔ Pre Aryan History of Pakistani Languages

نمونہ کلام: "ان حالات میں جب کہ اُردو پنجابی 'را' پنجابی 'دا' اور 'ڈا' لہندا 'نڈا' اور پوٹھوہاری میں 'نا' کی اضافی علامتوں کا سنسکرت سے کوئی رشتہ نہ جوڑا جا سکے اور اس کے برعکس برصغیر کی آریاؤں سے قبل کی مروجہ زبانوں میں یہی علامتیں مستقل طور پر اور تواتر سے مستعمل ہوں تو پھر ان کی اصل کی تلاش کے لیے محض قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلات پر تکیہ کرنا کہاں تک روا ہے۔" (اُردو زبان کی قدیم تاریخ)

تحریر: رخسانہ طلعت

عبادت بریلوی
1920ء تا 1998ء

عبادت بریلوی 14 اگست 1920ء کو بریلی (اُتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام عبادت یار خان تھا۔ 1942ء میں اُنھوں نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے ایم اے اور 1946ء میں اسی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل ہوئی تو اُنھیں اینگلو عربک کالج دِلی میں ملازمت مل گئی۔ مولوی عبدالحق کے مشورے سے پاکستان آئے اور اورینٹل کالج لاہور سے ملازمت کا آغاز کیا جہاں گیارہ سال گزارنے کے بعد لندن سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز چلے گئے اور چھ سال قیام کیا۔ اس دوران اُردو، فارسی اور عربی مقالے اور نادر نسخے تلاش کر کے ان کی طباعت کی۔ 1996ء میں وطن واپس آئے تو جامعہ پنجاب کے پروفیسر اور 1970ء میں اورینٹل کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ اُنھوں نے اپنی چالیس سالہ ملازمت کے دوران 125 کتابیں تحریر کیں۔ سبک دوشی کے بعد مدت ملازمت میں توسیع ہوئی، تو دو سال کے لیے حکومت نے اُنھیں انقرہ، ترکی بھیج دیا جہاں وہ تین سال تک رہے۔ عبادت بریلوی اُردو کے صفِ اول کے نقاد مانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ محقق اور سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی 19 دسمبر 1998ء کو لاہور میں وفات پاگئے اور سمن آباد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

تصانیف: اُردو تنقید کا ارتقا۔ تنقیدی زاویے۔ تنقید اور اصول تنقید۔ اُردو تنقید نگاری۔ غزل اور مطالعہ غزل۔ غالب کا فن۔ غالب اور مطالعہ غالب۔ تنقیدی تجربے۔ جدید اُردو تنقید۔ جدید اُردو اَدب۔ جدید شاعری۔ اقبال کی اُردو نثر اور شاعری۔ شاعری کی تنقید۔ مراثی جرات۔ روایت کی اہمیت۔ خطوط عبدالحق بہ نام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ گلزار دانش۔ آوارگان عشق۔ جلوہ ہائے صد رنگ۔ بلا کشان محبت۔ غزالان رعنا۔ شجر ہائے سایہ دار۔ یاران دیرینہ۔ ارض پاک سے دیار فرنگ تک۔ ترکی میں دو سال۔ دیار حبیب میں چند روز۔ لندن کی ڈائری۔ یاد عہد رفتہ۔

نمونہ کلام: "اَدبی نثر میں اس انفرادیت کا اظہار کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کیوں کہ اَدبی نثر تخلیق کرنے والے اس کے ذریعے اپنے ایسے تجربات پیش کرتے ہیں جن کی نوعیت تخلیقی ہوتی ہے۔"

تحریر: مریم سیف

شفیق الرحمٰن
1920ء تا 2000ء

شفیق الرحمٰن 9 نومبر 1920ء کو کلانور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اُنھوں نے اپنے آبائی گاؤں کے سکول سے حاصل کی۔ ایم بی بی ایس لندن سے کیا۔ آزادی کے بعد پاکستان آرمی کی طرف سے ایڈنبرا اور لندن کی یونی ورسٹیوں میں اعلا تعلیم کے حصول کے لیے گئے۔ آپ لڑکپن سے ہی سیر و سیاحت کے شوقین تھے۔ کرکٹ، باکسنگ اور تیراکی میں جنوں کی حد تک دلچسپی تھی۔ فوج میں ملازمت کے دوران آپ دوسری جنگ عظیم کے محاذوں پر گئے اور کئی ممالک کی سیر کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ بحری فوج میں منتقل کر دیے گئے آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد راولپنڈی میں زندگی گزاری آپ نے تحقیق کار کے طور پر بھی اپنی زندگی میں کام کیا۔ شفیق الرحمٰن افسانہ نگار اور مزاح نگار ہیں۔ شفیق الرحمٰن کارٹون، مصوری اور فوٹوگرافی سے بھی وابستہ رہے۔ اکادمی اُدبیاتِ پاکستان کے چیئرپرسن بھی مقرر ہوئے، بیرون ملک سفر بھی کیے۔ شفیق الرحمٰن کے فن اور شخصیت پر یوسف کے تحقیقی کام پر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، ہندستان نے ایم فل کی سند تفویض کی۔ شفیق الرحمٰن اُردو ادب میں رومانوی افسانوں اور مزاحیہ مضامین کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے تاہم ان کو بنیادی طور پر ایک مزاح نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ آپ نے طنز و مزاح کے حوالے سے کتاب حماقتیں کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ اس میں نو مضامین لکھے ہیں جو اعلا پائے کے ہیں آپ کا کام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے جس کی وجہ سے آپ اُردو کے اہم مزاح نگاروں میں ایک مقام رکھتے ہیں آپ نے کم افسانے لکھے لیکن خوب لکھے۔ آپ کے افسانے میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن 19 مارچ 2000ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

تصانیف: کرنیں۔ شگوفے۔ لہریں۔ مدوجزر۔ پرواز۔ پچھتاوے۔ حماقتیں۔ مزید حماقتیں۔ دجلہ۔ جنگ اور غذا۔ نئے شگوفے (افسانے)۔

نمونہ کلام: ''تمنا وہ لڑکی تھی جسے جنوبی ایران میں، میں نے دیکھا تھا لیکن جب شیطان نے اسے شمالی ہندستان میں دیکھا تو فوراً عاشق ہو گئے۔'' (شگوفے)

تحریر: کومل لیاقت

ساحر لدھیانوی
1921ء تا 1980ء

ساحر لدھیانوی 8 مارچ 1921ء کو لدھیانہ (پنجاب) کے ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدین نے قرآن شریف دیکھ کر عبدالحئی نام رکھا۔ اُن کے دادا فتح محمد لدھیانہ کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کے والد کا نام فضل محمد تھا۔ ساحر کی والدہ سردار بیگم کشمیری النسل تھیں۔ ساحر کے والد میں وہ تمام کمیاں اور خامیاں تھیں جو جاگیردرانہ طبقہ کے لوگوں کی عادتوں میں شامل ہوتی ہیں۔ اُن کی والدہ نے اُن سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم خالصہ سکول سے حاصل کی ساحر اپنی ماں کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے رہے اُردو اور فارسی کی تعلیم اُنھوں نے مولانا فیاض ہریانوی سے حاصل کی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنھیں شعر و اَدب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ اُنھیں سیاست اور معاشیات سے بھی کافی دل چسپی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں ملکی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے بی۔ اے نہ کر سکے۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر لاہور سے بمبئی چلے گئے اور فلمی گانے اور مکالمے لکھنے لگے۔ اُن کی ترقی پسند سوچ تھی۔ اُنھوں نے فلمی گیت میں اپنا نام کمایا۔ اُنھوں نے فلمی دنیا میں اپنا الگ مقام حاصل کیا۔ اُن کی طرح کسی اور کو شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ اُن کی شاعری عوامی ہوتی تھی لیکن اَدبی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں تاثیر پیدا کی جاتی تھی جس کی بہ دولت وہ اپنے عہد کے معروف ترین شعرا میں الگ مقام رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسندانہ خیالات کے مالک تھے۔ اُنھوں نے اہم ترین فلم سازوں کے ساتھ کام کیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے کئی بی گریڈ موسیقاروں کے ساتھ بھی کام کیا جن کے ساتھ اُنھوں نے کئی لافانی نغمے تخلیق کیے۔ اُن کے فلمی نغمے آج بھی شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی 25 اکتوبر 1980ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: دھرتی کے آنسو۔ آؤ کہ خواب بنیں۔ تلخیاں۔ بچے من کے سچے۔ گاتا جائے بنجارا۔ مائکا افسکی۔ تنہائیاں۔ کلیاتِ ساحر۔ اَدب ساز۔ سویرا۔ فن اور شخصیت

نمونہ کلام: کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا ــــ بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

تحریر: فاطمہ ریاض

این میری شمل
1922ء تا 2003ء

این میری شمل 7 اپریل 1922ء کو جرمنی کے شہر ایرفرٹ (Erfurt) میں پیدا ہوئیں۔ وہ بہت ذہین تھیں۔ صرف انیس برس کی عمر میں بون یونی ورسٹی، جرمنی سے ''مملوک مصر میں خلیفہ اور قاضی کا رتبہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کا شمار اُردو کے نام ور مستشرقین میں کیا جاتا ہے۔ شمل کو نہ صرف اُردو بل کہ پنجابی، سندھی اور ترکی سمیت کئی مشرقی زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ اقبال کے تراجم اور ان پر تنقیدی مضامین، اسلامی خطاطی، اسلام کی صوفیانہ جہتیں، اُردو ادب کی تاریخ (اقبال تک) ان کے اہم ترین اَدبی کام ہیں۔ وہ اسلام اور صوفی ازم کے مطالعات کے حوالے سے اتھارٹی تسلیم کی جاتی ہیں۔ وہ بون، ہارورڈ اور انقرہ کی یونی ورسٹیوں سے بہ طور معلّمہ بھی وابستہ رہیں۔ ان کی اَدبی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں متعدد بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا جن میں پاکستان سے عالمی صدارتی اقبالیات ایوارڈ، ہلال امتیاز اور ستارہ امتیاز کے علاوہ پیس پرائز اور دی جرمن بک ٹریڈ کا اعزاز شامل ہیں۔ لاہور کی ایک سڑک کا نام بھی ان سے منسوب ہے۔ این میری شمل اسلامی تصوف سے بہت متاثر تھیں اور اسی کا عکس ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے ایرانیات، سندھیات، شرقیات، اسلام، صوفی ازم اور اقبالیات پر پچاس سے زائد کتابیں لکھیں۔ این میری شمل کا انتقال 26 جنوری 2003ء کو بون، جرمنی میں ہوا۔

تصانیف: My Soul is a Woman, Rumi's World, Muhammad is His Messenger. Mohammad IqbalPoet and Philosopher, Islamic Literatures of India, Islamic Calligraphy, Classical Urdu Literature: From the Beginning to Iqbal, Pain and Grace, A Dance of Sparks.

نمونہ کلام: ''عطار نے کہا ہے کہ اُنھوں نے قبل ازیں بغداد میں یہی انا الحق کا نعرہ لگا دیا تھا بالکل اسی طرح غالب نے دعویٰ کیا کہ اُنھیں دار سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' (ترجمہ از ''رقص شرر'')

تحریر: میمونہ سحر

وزیر آغا
1922ء تا 2010ء

وزیر آغا 18 مئی 1922ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم۔ اے اور پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اَدبی صحافت کا آغاز ''اَدبی دنیا'' لاہور کے جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا پھر سہ ماہی رسالہ ''اوراق'' شائع کیا جو 2003ء تک شائع ہوتا رہا۔ وزیر آغا کے دس شعری، انشائیہ کے چھ اور تنقیدی مضامین کے پندرہ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ برصغیر کی متعدد یونی ورسٹیوں میں وزیر آغا پر تحقیقی مقالات اور چودہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے اُردو انشائیہ کے فروغ اور اس کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ شاعری میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کا انتہائی گراں قدر حصہ ہے۔ ان کی دو طویل نظمیں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' اُردو کی شاہ کار جدید نظمیں ہیں۔ وزیر آغا نے ''مسرت کی تلاش'' سے اپنا علمی و تنقیدی سفر شروع کیا۔ طنز و مزاح اور حقیقی مسرت کے فرق کی جستجو میں وہ تخلیقی اسرار اور خود کو جاننے کی لذت سے آشنا ہوئے۔ اُنھوں نے مغربی علوم کا مشرقی اَدب پر اطلاق کیا اور امتزاجی تنقید کا اصول رائج کیا۔ اُنھوں نے 8 ستمبر 2010ء کو وفات پائی۔

تصانیف: اُردو اَدب میں طنز و مزاح۔ تخلیقی عمل۔ اُردو شاعری کا مزاج۔ تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں۔ مجید امجد کی داستان محبت۔ غالب کا ذوق تماشا۔ نظم جدید کی کروٹیں۔ تنقید اور احتساب۔ نئے مقالات۔ نئے تناظر۔ معنی اور تناظر۔ تنقید اور مجلسی تنقید۔ دائرے اور لکیریں۔ تنقید اور جدید اُردو تنقید۔ انشائیے کے خدوخال۔ ساختیات اور سائنس۔ دستک اس دروازے پر۔ امتزاجی تنقید اور سائنس۔ فکری تناظر۔ شام کی منڈیر سے۔ شام اور سائے۔ دن کا زرد پہاڑ۔ نروان۔ آدھی صدی کے بعد۔ خیال پارے۔ چوری سے یاری تک۔ دوسرا کنارہ۔ شام دوستاں آباد۔ چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات)

نمونہ کلام: دن ڈھل چکا اور پرندہ سفر میں تھا ‌ ‌ سارا لہو بدن کا رواں مشت پر تھا

''اگر یہ کہا جائے کہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اُردو زبان کے طنزیہ و مزاحیہ اَدب نے نسبتاً قلیل عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ تو غالباً یہ کوئی مبالغہ آمیز دعویٰ نہ ہوگا۔''

تحریر: حبیب سلطان

شوکت صدیقی
1923ء تا 2006ء

شوکت صدیقی 20 مارچ 1923ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد 1950ء میں کراچی آ گئے۔ کراچی میں 1952ء میں ثریا بیگم سے شادی ہوئی۔ ناولوں اور متعدد کہانیوں کے مجموعوں کے علاوہ وہ اُردو کے ممتاز صحافی بھی تسلیم کیے جاتے ہیں اور متعدد نامور صحافی ان سے صحافت سیکھنے کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ علمی زندگی کا آغاز 1940ء میں ماہنامہ ''ترکش'' سے کیا۔ وہ کئی ہفت روزہ اور روز نامہ اخبارات سے وابستہ رہے۔ وہ روز نامہ مساوات، کراچی کے بانی ایڈیٹر اور روز نامہ ''مساوات'' لاہور کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ ''خدا کی بستی'' کو تین مرتبہ قومی ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا جب کہ ''جانگلوس'' کے ٹی وی پروڈکشن کے حقوق بھی ایک نجی ٹی وی چینل خرید رہا تھا۔ ان کے ناول ''چار دیواری'' کو لکھنؤ کی الف لیلیٰ کہا جاتا ہے۔ اُن کی وجہ شہرت ان کا ناول ''خدا کی بستی'' ہے۔ جس کے 46 ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں اور یہ اُردو کا واحد ناول ہے جس کا 42 دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی کہانی، جہاں ایک تہذیب ختم اور دوسری دنیا جنم لے رہی تھی۔ لیکن یہاں کے لوگ پرانی یادوں اور عظمتوں کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ آپ نے آدم جی اَدبی ایوارڈ، تمغا برائے حسن کارکردگی، کمال فن ایوارڈ، ستارہ امتیاز، خواجہ غلام فرید اَدبی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ شوکت صدیقی کے افسانے اور ناول جرائم کی دنیا کے حقیقی واقعات اور کرداروں پر مبنی ہیں جو تلخ حقیقت نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے متعدد ڈرامے، کالم، ناول اور افسانے لکھے۔ کراچی میں علالت کی وجہ سے آپ 16 دسمبر 2006ء کو وفات پا گئے اور کراچی میں ہی دفن ہوئے۔

تصانیف: تیسرا آدمی۔ اندھیرا اور اندھیرا۔ راتوں کا شہر۔ کیمیا گر۔ کمیں گاہ۔ خدا کی بستی۔ جانگلوس۔ چار دیواری

نمونہ کلام: ''سب گہری نیند سو رہے تھے اس نے دروازے کو آہستہ سے ہلایا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوشا اُلٹے قدموں راجہ کے پاس واپس آ گیا۔ راجہ نے پوچھا سب ٹھیک ٹھاک ہے؟ نوشہ نے جواب دیا دروازہ تو بند ہے اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی''۔ (خدا کی بستی)

تحریر: صدف سلیم

محمد طفیل
1923ء تا 1986ء

محمد طفیل 14 اگست 1923ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتے رہے۔ مڈل کا وظیفہ کا امتحان اعلا پوزیشن سے پاس کیا جب وہ دسویں جماعت میں پہنچے تو والد کی علالت سے مجبور ہو کر تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور گھر کی کفالت کا بار اٹھا لیا۔ تاج الدین زریں رقم سے خوش نویسی کی تربیت حاصل کی اور ''ادارہ فروغ اُردو'' کی داغ بیل ڈالی اور ناشر کتب بن گئے۔ اُنھوں نے ایک رسالہ ''نقوش'' جاری کیا۔ اُن کی ادارت میں نقوش کے غزل نمبر، افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، خطوط نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، اَدب عالیہ نمبر، منٹو نمبر، میر نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، انیس نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، لاہور نمبر، اَدبی معرکے نمبر، عصری اَدب نمبر اور سب سے بڑھ کر رسول نمبر شایع ہوئے۔ اس جریدے کے اولین مدیر احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور تھے۔ نقوش چار ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور مارچ 1948ء تا اپریل تک کا ہے جس میں احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی زیر ادارت صرف ابتدائی دس شمارے شایع ہوئے۔ دوسرا دور مئی 1950ء تا مارچ 1951ء تک کا ہے جس میں سید وقار عظیم نے ''نقوش'' کی کایا پلٹ دی۔ تیسرا دور اپریل 1951ء تا ستمبر 1986ء تک کا ہے جس میں رسالے کے مالک محمد طفیل نے خود ادارت کی، یہ اہم ترین دور ہے۔ چوتھا دور دسمبر 1986ء سے تا حال کا ہے جس میں جاوید طفیل نے ادارت سنبھالی ہے۔ محمد طفیل کو اُردو میں خاکہ نگاری کے حوالے سے ممتاز مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُنھیں بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے ''محمد نقوش'' کا خطاب دیا تھا جب کہ حکومت پاکستان نے اُنھیں ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا تھا۔ محمد طفیل 5 جولائی 1986ء کو اسلام آباد میں وفات پا گئے۔

تصانیف: جناب۔ صاحب۔ آپ۔ محترم۔ مکرم۔ مخدومی۔ محبی۔ معظم۔ ناچیز۔ نقوش

نمونہ کلام: ''مرزا صاحب موڈ کے آدمی ہیں مگر موڈ ہمیشہ مائل بہ شائستگی ہی ہوتا ہے وہ مواقع کم آتے ہیں کہ جسے ''مردہ بولے تے کفن ای پھاڑے'' کہتے ہیں مگر بات یہ بھی نہیں کہ صرف درگزر کے پیغمبر ہوں کھری بات کہتے ہیں اور دھڑلے سے کہتے ہیں۔'' (محبی)

تحریر: عالیہ سعید

مشتاق احمد یوسفی
1923ء تا 2018ء
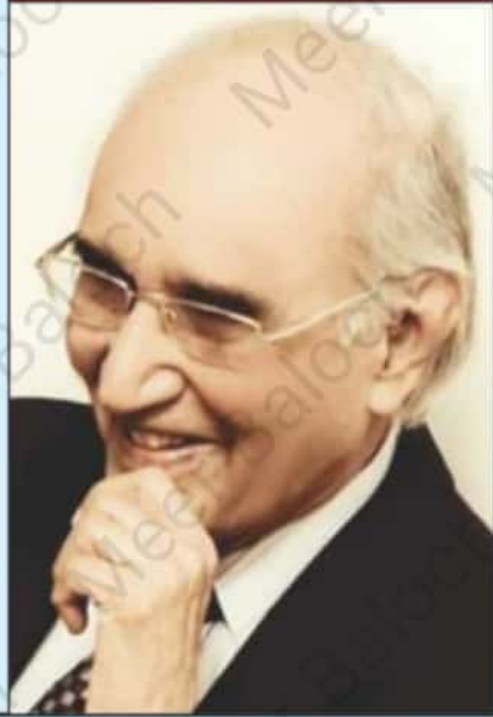
مشتاق احمد یوسفی 4 ستمبر 1923ء کو ہندستان کی ریاست ٹونک کے شہر جے پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد عبدالکریم خان یوسفی جے پور بلدیہ کے صدر نشین تھے اور بعد میں جے پور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہوئے۔ مشتاق احمد یوسفی نے راجپوتانہ میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور آگرہ یونی ورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان کراچی میں منتقل ہو گیا۔ مختلف بینکوں میں اعلا افسر اور پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ اُنھوں نے مزاح نگاری کو بہ طور مصنف اپنایا۔ 1999ء میں حکومت کی جانب سے اُنھیں ستارہ امتیاز ملا۔ پھر 2002ء میں پاکستان کا سب سے بڑا تعلیمی اعزاز نشان امتیاز سے نوازا گیا۔ اُنھیں آدم جی انعام بھی ملا۔ یوسفی کی وجہ شہرت ان کی خالص مزاح نگاری ہے جس سے سوتے سنجیدگی سے پھوٹتے ہیں۔ سنجیدہ مزاح میں پطرس بخاری کے بعد دوسرا بڑا نام مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔ ان کی مزاح نگاری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں واقعات اور کرداروں کے عکس کو حسب منشا وہ کبھی بہت چھوٹا اور کبھی بہت بڑا کر کے پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں وہ تصویر ہمیں مضحکہ خیز ہی نظر آتی ہے اور یہی ان کا مقصد ہے۔ ان کا مشاق قلم اور تیکھی ذہانت پرانی چیزوں میں وہ تازگی پیدا کر دیتی ہے کہ پڑھنے والا ایک خوش گوار حیرت اور انجانے انبساط کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ مزاح نگاری میں جو اسلوب اپناتے ہیں وہ صرف اُنھی کا خاصا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی خاص بات یہ ہے کہ اُنھوں نے دوسروں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی نہیں بخشا اور اپنی ذات پر بھی طنز و مزاح کے تیر چلائے۔ اُردو ادب میں ان کو اعلا مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے 20 جون 2018ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: چراغ تلے۔ خاکم بدہن۔ زرگزشت۔ آب گم۔ شام شعر یاراں۔

نمونہ کلام: ”مرزا کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب ایک ایسا شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دوگنا مزا دیتا ہے“۔
”ہوا اگر سانس لینے کے لیے منہ کھولے تو گمان ہوتا ہے کہ مجھے کوس رہی ہوگی“۔

تحریر: مریم صدیق

گیان چند جین
1923ء تا 2007ء

گیان چند جین 19 ستمبر 1923ء کو سیوہارا میں پیدا ہوئے۔ مراد آباد سے میٹرک اور انٹر کرنے کے بعد الہ آباد یونی ورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ ”اردو داستانیں“ کے موضوع پر ”ڈی۔فل“ کی ڈگری لی۔ آگرہ یونی ورسٹی سے سوشیالوجی میں بھی ایم۔اے کیا 1954ء میں آگرہ یونی ورسٹی میں ”ڈی۔لٹ“ کی ڈگری حاصل کی۔ حمیدیہ کالج بھوپال میں اُردو کے لیکچرر رہے اور اسی کالج میں پروفیسر بھی ہوئے۔ جموں کشمیر یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہوئے، وہاں گیارہ سال ملازمت کے بعد الہ آباد یونی ورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبہ اُردو ہو گئے۔ حیدر آباد کی سینٹرل یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ 1954ء میں گیان چند کی پہلی کتاب ”اُردو کی نثری داستانیں“ شائع ہوئی۔ ڈاکٹر گیان چند اُردو کی قدیم نثری داستانوں کی تحقیق میں مقام فضیلت رکھتے ہیں۔ 1981ء میں ”ذکر و فکر“ کے نام سے مضامین اور تبصرے شامل ہیں اسی کتاب پر اُنھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔ اُن کا اصل میدان تحقیق ہے تنقید سے ان کی دل چسپی ضمنی ہے اسی وجہ سے ان کا تنقید میں کوئی اسلوب نہیں بن پایا۔ گیان چند تحقیق کے میدان میں مفروضات پر یقین نہیں رکھتے بل کہ کوشش کر کے نقل کی اصل تک جب تک نہیں پہنچتے کسی بیان کو اپنے محاسبے میں نہیں ڈالتے بل کہ راوی کے کھاتے میں ہی ڈال دیتے ہیں۔ گیان چند 19 اگست 2007ء کو کیلی فورنیا میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: عام لسانیات۔ اَدبی اصناف۔ ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو اَدب۔ غالب شناس مالک رام۔ حقائق۔ کچے بول۔ کھوج۔ لسانی مطالعے۔ مقدمے اور تبصرے۔ پرکھ اور پہچان۔ اوپندر ناتھ اشک۔ رموز غالب۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن۔ تفسیر غالب۔ تحقیق کا فن۔ تجزیے۔ اُردو اَدب کی تاریخیں۔ تحریریں۔ اُردو کا اپنا عروض۔ اُردو کی نثری داستانیں۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ذکر و فکر۔

نمونہ کلام: ”جہاں تک اُردو کی اَدبی تحقیق کا تعلق ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جن مصنفین، جن ادوار، جن علاقوں، جن کتابوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں کم معلوم ہے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔“ (تحقیق کا فن)

تحریر: سویرا فاطمہ

انتظار حسین
1923ء تا 2016ء
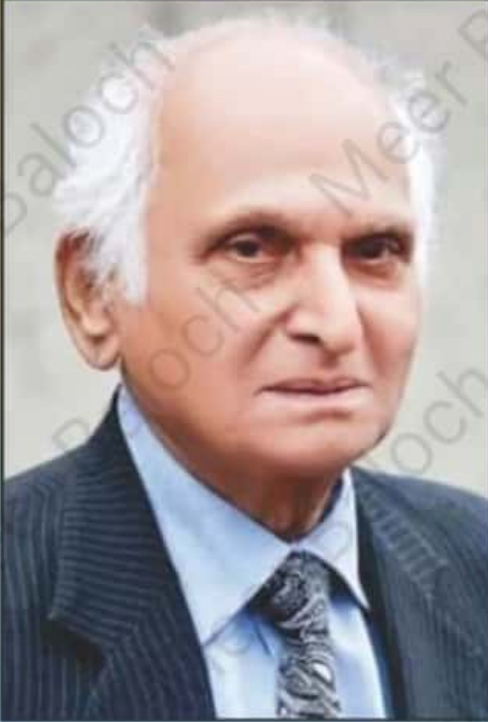
انتظار حسین 7 دسمبر 1923ء کو ڈبائی ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اُن کے والد چاہتے تھے کہ وہ ایک مذہبی آدمی بنیں لیکن ان کی بڑی بہن کے اصرار کے بعد ان کو سکول میں داخل کرایا گیا۔ 1942ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1944ء میں بی اے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے جہاں جامعہ پنجاب سے ایم اے اُردو کیا اور بعد میں صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گلی کوچے'' 1953ء میں شایع ہوا۔ روزنامہ مشرق میں وہ ''لاہور نامہ'' کے نام سے ایک کالم لکھا کرتے تھے جسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں اُنھوں نے اپنی الگ پہچان بنائی۔ ماضی پرستی، ماضی پر نوحہ خوانی اور روایت میں پناہ کی تلاش ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ وہ علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نئے انداز میں پیش کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ہجرت کا اثر بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ باطنی صورت حال اور اسلوبیاتی تنوع ان کی پہچان ہے۔ اُن کی تحریر میں ایسی کشش ہے جو قدیم عمارت میں چاندنی رات کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے اُنھیں ستارۂ امتیاز اور حکومتِ فرانس نے ستمبر 2014ء میں ''آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز'' سے نوازا گیا۔ وہ پاکستان کے پہلے ادیب تھے جنھیں ''مین بکر پرائز'' کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے اُنھیں پاکستان کے سب سے بڑے اعزاز ''کمالِ فن اَدب انعام'' سے بھی نوازا۔ وہ بہ یک وقت ایک ناول نگار، افسانہ نگار، کالم نگار اور نقاد تھے۔ اُن کا انتقال 2 فروری 2016ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: آگے سمندر ہے۔ بستی۔ چاند گہن۔ دن۔ آخری آدمی۔ خالی پنجرہ۔ خیمے سے دور۔ شہرِ افسوس۔ کچھوے۔ کنکری۔ گلی کوچے۔ چراغوں کا دھواں۔ دلی تھا جس کا نام۔ جل گرجے۔ نظریے سے آگے۔

نمونہ کلام: جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔ یہ حکایت سننے کے بعد میں نے سوال کیا: ایسا کب ہوتا ہے کہ سب دانش مند بن جائیں اور کوئی دانش مند نہ رہے؟ فرمایا: جب عالم اپنا علم چھپائے۔'' (آخری آدمی)

تحریر: محمد نوید

خواجہ معین الدین
1924ء تا 1971ء

خواجہ معین الدین 23 مارچ 1924ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ریڈیو دکن سے وابستہ رہے اور ڈرامہ نگاری کا آغاز اسی دور میں کر دیا تھا۔ ان کے اس دور کے ڈراموں میں سے سرکاری دکان اور پرانے محل بہت پسند کیے گئے۔ 1948ء میں وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے، کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے اور فنِ ڈرامہ نگاری کو جاری رکھا۔ اُن کے ڈراموں نے اپنی مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور زبان و بیان کی بنا پر بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اُن ڈراموں میں مرزا غالب بندر روڈ پر، لال قلعے سے لالو کھیت تک اور تعلیمِ بالغاں نے بطورِ خاص بہت شہرت حاصل کی۔ خواجہ معین الدین نے کئی سال تک ڈرامے لکھنے کے ساتھ ساتھ سٹیج پر پیش کش کے لیے ہدایات بھی دیں۔ تعلیمِ بالغاں نے تو سٹیج سے ٹی وی تک کا سفر بھی طے کیا اور اپنے موضوع، اسلوب اور مکالمات کے باعث بے حد سراہا گیا۔ خواجہ معین الدین کے ڈرامے طنز کے نشتر اور مزاح کی حلاوت کا خوبصورت مرقع ہیں جن کے موضوعات قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے متعلق ہیں اور مکالموں کا اختصار، چبھن اور بے ساختہ پن ان کا خاصہ ہے۔ تعلیمِ بالغاں میں بطورِ خاص طنز و مزاح کے نشتر استعمال کرتے ہوئے معاشرے کی بہت سی برائیوں اور گمراہیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں لکھے اور پیش کیے گئے خواجہ معین الدین کے ڈرامے بے مثال کامیابی اور بے پناہ مقبولیت کی بنا پر سرِ فہرست ہیں۔ اُنھیں فنی خدمات کے اعتراف میں 14 اگست 1966ء کو صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ خواجہ معین الدین کا انتقال 9 نومبر 1971ء کو محض 47 سال کی عمر میں کراچی میں ہوا۔

تصانیف: زوالِ حیدر آباد۔ مرزا غالب بندر روڈ پر۔ نیا نشان۔ لال قلعے سے لالو کھیت تک۔ تعلیمِ بالغاں۔ جیل کو کہیں سسرال۔ جلسہ عام۔ ساون کا اندھا۔ سرکاری دکان۔ پرانے محل۔

نمونہ کلام: ''آج شاگرد مدرسے میں بیٹھ کر بیڑی پیتے ہیں۔ چپڑاسی افسروں سے ماچس مانگتے ہیں۔ لیڈر قوم کو دھوکا دیتے ہیں اور لائق شاگرد پوچھتے ہیں تنظیم کا گلا کس نے غایب کیا۔'' (تعلیمِ بالغاں)

تحریر: آسیہ رانی

رضیہ بٹ
1924ء تا 2012ء

رضیہ بٹ 19 مئی 1924ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئیں۔ اُنھوں نے مڈل میں ٹاپ کیا، اس کے بعد ایف اے کیا۔ اور لیڈی گریگری کے اصرار پر مزید تعلیم کیلئے لاہور چلی گئیں۔ سال سوم میں ان کی شادی ہوگئی اور اس کے بعد انبالہ چلی گئیں۔ رضیہ بٹ نے ناول، افسانے، بچّی کہانیاں، ڈرامے اور ناولٹ لکھے۔ اُن کے کئی ناولوں "صاعقہ، انیلا، نائلہ اور شبو" پر فلمیں بن چکی ہیں۔ رضیہ بٹ نے تحریک پاکستان کے لیے کئی جلوس اور ڈرامے کیے اور فنڈ ز جمع کیے۔ اُنھوں نے ڈراما بنایا جس سے سوا تین ہزار روپے کی خطیر رقم جمع ہوئی جو اس وقت اُنھوں نے پشاور میں قائداعظم کے سپرد کی۔ رضیہ بٹ نے اس کے علاوہ رفاہی ادارہ "کاوش کلب" شروع کیا جس کے تحت غریب بچیوں کی شادیاں اور غریبوں کا علاج کرواتیں، اس کے علاوہ مفت سلائی کڑھائی کا سکول کھولا، ایک پرائمری سکول میں بچوں کا خرچ دیا جاتا، قرضہ سکیم کے تحت قرض دیا جاتا، زلزلہ متاثرین کو فنڈ ز بھی دیے۔ رضیہ بٹ کا پہلا ناول "ناہید" تھا جو اُنھوں نے شادی کے چار سال بعد لکھا۔ جس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ ناشرین اُن کے پاس دوڑے چلے آئے۔ ناولوں کے گھریلو موضوعات کی وجہ سے اُن کو اُردو کی جین آسٹن بھی کہا جاتا ہے۔ غرض رضیہ بٹ نے علمی، اَدبی، رفاہی، سیاسی دنیا کے ہر میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہ 14 اکتوبر 2012ء کو لاہور میں انتقال کر گئیں۔

تصانیف: ناہید۔ صاعقہ۔ بانو۔ نائلہ۔ ناجیہ۔ اماں۔ انیتا۔ باجی۔ بندگی۔ بندھن۔ بینا۔ بیٹی۔ بسمہ۔ ڈارلنگ۔ ڈھل گئی رات۔ دل اور پتھر۔ دکھ سکھ اپنے۔ گل بانو۔ فاصلے۔ آئیڈیل۔ اک لڑکی۔ خاندان۔ لغزش۔ میں کون ہوں۔ ممی۔ مریم۔ مینا۔ محبت اک سچائی۔ مجرم کون۔ مسرتوں کا شہر۔ نورین۔ نورینہ۔ قربان جاؤں۔ رابی۔ ربطہ۔ روپ۔ سانولی۔ سارہ۔ شبو اور وحشی۔ شاداں۔ ٹوٹے بندھن۔ زرتاب۔ زری۔ وحشی۔

نمونہ کلام: "اس دن میں مونا اور جینی کا کمرہ سیٹ کر رہی تھی۔ اُن کے بیڈ ڈلوائے۔ الماریاں درست کیں۔ اُن کی کتابیں شیلف میں رکھیں پڑھنے کے لیے میز دار کرسیاں ڈلوا کر ٹیبل لیمپ سیٹ کروایا۔"

تحریر: ردا نادر

ادا جعفری
1924ء تا 2015ء

ادا جعفری کی پیدائش 22 اگست 1924ء کو بدایوں میں ہوئی۔ آپ کا خاندانی نام عزیز جہاں ہے۔ آپ کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ادا جعفری نے تیرہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ وہ ادا بدایونی کے نام سے شعر کہتی تھیں۔ اس وقت اَدبی رسالوں میں ان کا کلام شایع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ادا جعفری عموماً اختر شیرانی اور اثر لکھنوی سے اصلاح لیتی تھیں۔ اُن کے شعری مجموعہ "شہر درد" کو آدم جی اَدبی انعام ملا۔ شاعری کے متعدد مجموعوں کے علاوہ "جو رہی سو بے خبر رہی" کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی۔ 1991ء میں حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔ ادا جعفری کے شعری سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے عروج کے وقت ہوا اس وقت دوسری جنگ عظیم کی بھونچالی فضا اور پاک و ہند کی تحریک آزادی کا پُر آشوب ماحول تھا۔ 1950ء تک زندگی کے شب کدے میں ادا جعفری کو جس نور کی تلاش تھی وہ اسے مل گیا ہے اور اس نور نے ان کی بساط جسم و جان پر بہت خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ ادا جعفری نے جاپانی صنف سخن ہائیکو پر بھی طبع آزمائی کی ہے ان کی ہائیکو کا مجموعہ "ساز سخن بہانہ ہے" شایع ہو چکا ہے اس میں بھی ادا جعفری نے کائنات اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا ہے اور کامیابی سے اُردو ہائیکو کہی ہے۔ ان کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اُنھیں کی رہنمائی و پیش قدمی نے آنے والی خود کو حوصلہ دیا ہے اور نئی منزلوں کا پتہ بتایا ہے۔ ادا جعفری اُردو کی تانیثی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادا جعفری وہ شاعرہ ہیں جن کا شمار باعتبار طویل مشق سخن اور ریاضت فن کے صف اول کی معتبر شاعرات میں ہوتا ہے۔ ادا جعفری مختصر علالت کے بعد 12 مارچ 2015ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں۔

تصانیف: میں ساز ڈھونڈتی رہی۔ شہر درد۔ حرف شناسائی۔ غزالاں تم تو واقف ہو۔ ساز سخن بہانہ ہے۔ موسم موسم (کلیات)۔ جو رہی سو بے خبری رہی (خود نوشت سوانح حیات)۔

نمونہ کلام:

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا — یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے — آئے تو سہی بر سرِ الزام تو آئے

تحریر: بسم اللہ حبیب

ممتاز شیریں
1924ء تا 1973ء

ممتاز شیریں 12 ستمبر 1924ء کو ہندو پور میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے نانا ٹیپو قاسم خان نے ان کو تعلیم و تربیت کی خاطر اپنے پاس میسور بلا لیا۔ ممتاز شیریں کے نانا اور نانی نے اپنی اس ہونہار نواسی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ وہ خود بھی تعلیم یافتہ تھے اور گھر میں علمی و ادبی ماحول بھی میسر تھا۔ اُنھوں نے تیرہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ 1941ء میں ممتاز شیریں نے مہارانی کالج بنگلور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ممتاز شیریں کی شادی صمد شاہین سے ہوئی۔ اُنھوں نے 1942ء میں تخلیق اَدب میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' اَدبی مجلہ ساقی دہلی میں 1944ء میں شائع ہوا تو اَدبی حلقوں میں اسے زبردست پذیرائی ملی۔ اُردو اَدب میں حریت فکر کی روایت کو پروان چڑھانے میں ممتاز شیریں کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ''ظلمت نیم روز'' ہو یا ''منٹو، نوری نہ ناری'' ہر جگہ اسلوبیاتی تنوع کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب اور محمود ہاشمی کے اسلوب کو وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ ممتاز شیریں کو انگریزی، اُردو، عربی، فارسی اور پاکستان کی متعدد علاقائی زبانوں کے اَدب پر دسترس حاصل تھی۔ 1954ء میں ہالینڈ کے دار الحکومت ہیگ میں ایک بین الاقوامی اَدبی کانفرنس میں ممتاز شیریں کو پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ حکومت پاکستان کی مشیر برائے وفاقی وزارت تعلیم بھی رہیں۔ ممتاز شیریں 11 مارچ 1973ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئیں۔

تصانیف: اپنی نگریا۔ حدیث دیگراں۔ میگھ ملہار۔ ظلمت نیم روز (فسادات کے افسانے) ترتیب: ڈاکٹر آصف فرخی۔ معیار۔ منٹو، نوری نہ ناری۔ نیا دور (اَدبی جریدہ)۔ درشہوار (جان اسٹین بیک ناول دی پرل کا ترجمہ)۔ پاپ کی زندگی (امریکی افسانوں کا مجموعہ)

نمونہ کلام: ''یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا نہیں تو میں خوب روؤں گی۔''

''اچھا بی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی وہیں آ کر جان و دل سے تمہاری خدمت کروں گی۔'' (اپنی نگریا)

تحریر: عائشہ سعید

جاوید اقبال
1924ء تا 2015ء

فرزندِ اقبال ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال 5 اکتوبر 1924ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا نام قمر الاسلام تجویز کیا گیا لیکن علامہ اقبال کو یہ نام پسند نہ آیا اور جاوید اقبال نام رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم سیکرڈ ہارٹ مشنری سکول سے حاصل کی۔ انگریزی اَدب اور فلسفہ میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انگلستان سے ''برصغیر میں مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقا'' کے عنوان پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بار ایٹ لا کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1954ء میں وطن واپس آئے۔ 1964ء میں ناصرہ بیگم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں چودہ سال تک تدریس سے وابستہ رہے۔ ہائی کورٹ کے جج اور بعد میں چیف جسٹس بھی رہے۔ سلجوقی یونی ورسٹی (ترکی) نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔ موسیقی، مصوری اور اَدب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اَدبی زندگی کا آغاز کالج کے رسالے ''راوی'' سے کیا جس میں ان کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ تخلیقی اظہار کے لیے ڈراما نویسی کی صنف کو اپنایا اور منفرد انداز میں ڈرامے پیش کیے۔ آپ کے ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہے۔ ''اَدب لطیف''، ''سویرا'' اور ''امروز'' میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ خطبات اقبال کی آسان تفہیم کا کام انجام دیا، اس کے علاوہ فکرِ اقبال کی تشریحات کے ذریعے نوجوان نسل کو افکارِ اقبال سے آشنائی بخشی جو کہ آپ کی اہم خدمت ہے۔ آپ نے افسانے، ڈرامے تحریر کیے۔ افسانوں میں خون ریزی اور فسادات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، اس سلسلے میں ان کے افسانے ''غلبہ'' اور ''بحران'' اہم ہیں۔ آپ سرطان کے مرض میں مبتلا تھے جس کے باعث 3 اکتوبر 2015ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: زندہ رود۔ اپنا گریباں چاک۔ جہانِ جاوید۔ افکارِ اقبال۔ شذرات فکر اقبال۔ ملفوظات مظہری خطبات اقبال۔

نمونہ کلام: ''ان کی مثال نہ مل سکے گی، خود پانچ آدمی برچھے سے ہلاک کیے۔ اس نے مغرورانہ انداز میں بتایا کہ اس رات ایک سو چالیس افراد قتل کیے گئے''۔ (بحران)

تحریر: رابعہ ارشاد

رشید حسن خاں
1925ء تا 2006ء

رشید حسن خاں 25 دسمبر 1925ء کو شاہ جہاں پور، اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک ممتاز علمی و اَدبی گھرانے سے تھا۔ مذہبی اور ابتدائی تعلیم مدرسہ بحرالعلوم شاہ جہاں پور سے حاصل کی لیکن وہ درس نظامی مکمل نہ کر سکے۔ عملی زندگی کا آغاز دکان پر منشی گیری سے کیا۔ مدرسہ اور سکول میں تدریس بھی کی۔ 1944ء میں اَدبی زندگی کا آغاز کیا۔ رشید حسن خاں اُردو کے معروف ماہر لسانیات، محقق اور مدون ہیں لیکن ان کا اہم ترین میدان تدوین ہے۔ 1959ء میں اُنھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت شروع کی جہاں اُنھوں نے اُردو کے چار مشہور ترین کلاسیکی متون کو جدید اصولوں کے مطابق مدون کر کے شائع کیا ہے جو تدوین کے لیے ایک مثال ہے۔ اُن میں "باغ و بہار" از میر امن، "فسانۂ عجائب" از مرزا رجب علی بیگ سرور، "مثنوی سحرالبیان" از میر حسن اور "مثنوی گلزار نسیم" از دیا شنکر نسیم شامل ہیں۔ اسی بنا پر ڈاکٹر گیان چند جین نے اُنھیں "خدائے تدوین" کا خطاب دیا ہے۔ ان کی تنقید کا معیار کڑا اور کھرا تھا جس میں وہ کسی طرح کی لاگ لپٹ یا رعایت کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ اُن کی بے لاگ تنقید کی وجہ سے علی گڑھ یونی ورسٹی کو اپنی شائع کردہ تاریخ اُردو اَدب کو بازار سے اٹھا کر اس سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ ان کا شمار اہم ترین ماہرین قواعد میں ہوتا ہے۔ دورِ جدید میں اُردو لکھنے کے لیے رشید حسن خاں کا بتایا ہوا طریق عبارت و املا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ رشید حسن خاں کا انتقال 26 فروری 2006ء کو شاہ جہاں پور میں ہوا۔

تصانیف: اُردو املا۔ کلاسیکی اَدب کی فرہنگ۔ مصطلحات ٹھگی۔ زبان اور قواعد۔ تفہیم۔ انشائے غالب۔ املائے غالب۔ اَدبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ انشا اور تلفظ۔ عبارت کیسے لکھیں۔ تدوین، تحقیق، روایت۔ تلاش و تعبیر۔

نمونہ کلام: "یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ اُردو میں ہم آواز حرف موجود ہیں۔ ہم آواز حرفوں سے مراد ایسے حرف ہیں جن کی شکلیں تو الگ الگ ہیں، مگر آواز ایک جیسی ہے۔ مثال کے طور پر ان لفظوں کو دیکھیے: نظر، غضب، غزل، رذیل۔" (عبارت کیسے لکھیں؟)

تحریر: عامر نعمان

جمیل الدین عالی
1925ء تا 2015ء
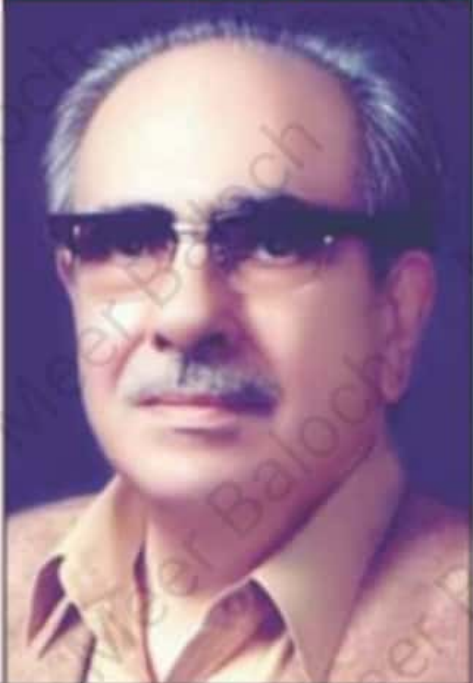
جمیل الدین 20 جنوری 1925ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام جمیل الدین احمد خان تھا اور عالی ان کا تخلص تھا۔ جمیل الدین عالی کا تعلق علمی اور اَدبی خاندان سے تھا اور ان کے والد امیر الدین خان مرزا غالب کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جب کہ والدہ میر درد کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جمیل الدین عالی کا آبائی وطن لوہارو تھا۔ پرائمری تک تعلیم گھر پر حاصل کی۔ میٹرک اینگلو عربک ہائی سکول دریا گنج دہلی سے پاس کیا۔ انٹر اینگلو عربک کالج سے اور بی اے اعلا نمبروں سے پاس کیا اور سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا۔ ایل ایل بی بھی کیا۔ جمیل الدین پاکستان بننے کے فوراً بعد پاکستان آ گئے۔ جمیل الدین عالی نے کئی حکومتی محکموں میں بطور افسر اور بیورو کریٹ خدمات انجام دیں اور اعلا عہدوں پر متمکن رہے۔ جب کہ صدر ایوب خان کے عہد میں پاکستان رائٹرز گلڈ انھی کی کاوشوں سے وجود میں آئی جس کی ترقی اور فروغ کے لیے وہ ہمہ تن کوشاں رہے۔ جمیل الدین عالی بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے شاگرد رہے اور ابن انشا سے لے کر قدرت اللہ شہاب تک کے رفیق کار رہے۔ جمیل الدین عالی کی خدمات پر انھیں ستارۂ امتیاز، آدم جی اَدبی ایوارڈ اور کمال فن ایوارڈ بھی دیا گیا۔ جمیل الدین عالی کا اسلوب سادہ اور رواں ہے لیکن کہیں کہیں ان کے اسلوب میں رنگینی اور پرکاری پائی جاتی ہے۔ جمیل الدین عالی کا انداز تحریر اس قدر سادہ اور دل کو چھو جانے والا ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اُن کے قومی اور ملی نغمے تو جوانوں کے خون کو گرماتے ہیں۔ اُنھوں نے دوہے کی صنف کو اُردو اَدب میں احیا کیا۔ وہ 23 نومبر 2015ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: آئس لینڈ۔ تماشا مرے آگے۔ دنیا میرے آگے۔ کارگاہِ وطن۔ بارگاہِ وطن۔ وفا کر چلے۔ صدا کر چلے۔ دعا کر چلے۔ دوہے۔ اے مرے دشت سخن۔ انسان۔ جیوے جیوے پاکستان۔ حرف چند۔ لاحاصل۔

نمونہ کلام:

تیرے خیال کے دیوار و در بناتے ہیں
ہم اپنے گھر میں بھی تیرا ہی گھر بناتے ہیں

بکھیرتے رہو صحرا میں بیج الفت کے
کہ بیج ہی تو ابھر کر شجر بناتے ہیں

تحریر: نفسا رحمان

وحید قریشی
۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۹ء
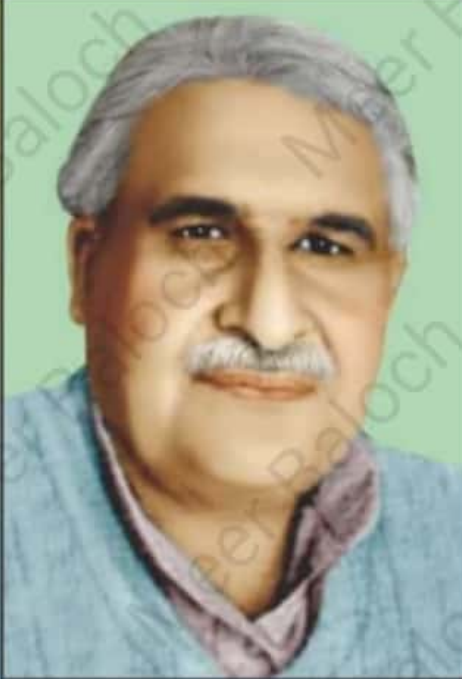
ڈاکٹر وحید قریشی 14 فروری 1925ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ساہیوال، گوجرانوالہ اور لاہور کے مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ فارسی اور تاریخ میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کلاسیکی فارسی نثر میں پی ایچ ڈی اور میر حسن اور ان کی شاعری کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1963ء میں پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ 1983ء میں مقتدرہ قومی زبان میں ملازمت کی۔ اس کے علاوہ اقبال اکادمی، بزمِ اقبال اور مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی سے بھی وابستہ رہے۔ وحید قریشی فن کو معاشرتی اور تاریخی ماحول سے علاحدہ نہیں کرتے تحقیق کو کسی اور زاویے سے پرکھنے کے بجائے اسے مختلف پیمانوں سے جانچتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ تنقید کو ادبی عمل تصور کرتے تھے۔ اُنھوں نے اَدب کو پرستار کی حیثیت سے دیکھا۔ ستمبر 2003ء سے اپنی وفات تک وہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور میں "پروفیسر ایمریطس" کے عہدے سے سرفراز رہے۔ حکومت پاکستان نے ڈاکٹر وحید قریشی کو خدمات کے اعتراف میں 14 اگست 1993ء کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ گفت گو کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی گفت گو کے دوران جملہ چست کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ 17 اکتوبر 2009ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: تعلیم کے بنیادی مسائل۔ باغ و بہار ایک تجزیہ۔ دفتری اُردو۔ اقبال اور پاکستانی قومیت۔ فلسفہ اور اَدبی تنقید۔ تدوین مقدمہ شعر و شاعری۔ شبلی کی حیات معاشقہ۔ اساسیاتِ اقبال۔ میر حسن اور ان کا زمانہ۔ تنقیدی مطالعے۔ یار نامہ۔ افسانوی اَدب۔ نذرِ غالب۔ اُردو نثر کے میلانات۔ پیش دستیاں۔ میر جملہ لاہوری۔

نمونہ کلام: "جو کلام عاشقانہ سراپا سوز و گداز نظر آتا ہے، دل مذاق منزل لطافت آشنا تڑپ جاتا ہے، بالخصوص کلامِ تازہ کے دیکھنے سے حلاوت بے اندازہ ملتی ہے اور جراحت کہن دل بسمل ادا بندی، سخن گفتار نو سے لطف بے قراری تازہ پاتا ہے۔" (نذرِ غالب)

تحریر: ندا عبدالستار

اشفاق احمد
۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۴ء

اشفاق احمد خان 22 اگست 1925ء کو فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے فیروز پور سے ہی بی۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کیا، اٹلی کی روم یونی ورسٹی اور گرینوبلے یونی ورسٹی فرانس سے براڈ کاسٹر کی خصوصی تربیت بھی حاصل کی۔ اُنھوں نے دیال سنگھ کالج، لاہور میں دو سال تک اُردو کے لیکچرر کے طور پر کام کیا اور بعد میں روم یونی ورسٹی میں اُردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے دو سال ہفت روزہ "لیل و نہار" کی ادارت بھی کی۔ مرکزی اُردو بورڈ (اُردو سائنس بورڈ) کے ڈائریکٹر مقرر اور وفاقی وزارت تعلیم کے مشیر بھی رہے۔ اشفاق احمد ان نامور ادیبوں میں شامل ہیں جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اَدبی افق پر نمایاں ہوئے۔ اُردو میں کہانی لکھنے کے فن پر اشفاق احمد کو جو عبور حاصل ہوا وہ کم لوگوں کے حصے میں آیا۔ اُنھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور پر ایک ہفتہ وار فیچر پروگرام "تلقین شاہ" کے نام سے کرنا شروع کیا جو طنز و مزاح کے باعث مقبول عام ہوا۔ کچھ عرصے تک وہ پاکستان ریڈیو ٹیلی وژن پر "زاویہ" کے نام سے پروگرام کرتے رہے۔ اُنھیں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔ اشفاق احمد 7 ستمبر 2004ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

تصانیف: ایک ہی بولی۔ آسودگی۔ بندگلی۔ ڈھنڈورا۔ اور ڈرامے۔ بندۂ زمانہ (تلقین شاہ)۔ دھینگا مشتی۔ گڈریا (اجلے پھول)۔ گلدان۔ حیرت کدہ۔ حسرت تعمیر۔ جنگ بجنگ۔ کھیل تماشا۔ کھٹیا وٹیا۔ من چلے کا سودا۔ مہمان سرائے۔ ننگے پاؤں۔ پڑاؤ۔ سفر در سفر۔ سفر مینا۔ شہر آرزو۔ شاہلا کوٹ۔ شوارا شواری۔ طلسم ہوش افزا۔ وداع جنگ۔ زاویہ۔ زاویہ 2۔ زاویہ 3۔ توتا کہانی۔ اچے برج لہور دے۔ صبحانے افسانے۔ ایک محبت سو افسانے۔ ایک محبت سو ڈرامے۔ پھلکاری۔ قلکار۔ گرما گرم۔ مہمان بہار۔ ہفت زبانی لغت۔ بابا صاحبا۔ آشیانے۔ تالی تھلے۔ دھوپ اور سائے (فلم)۔

نمونہ کلام: "اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔" (گڈریا)

تحریر: محمودہ

جوگندر پال

1925ء تا 2016ء

جوگندر پال 5 ستمبر 1925ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد لعل چند سیٹھی، دکان داری کرتے تھے۔ گنڈا سنگھ ہائی سکول سے 1941ء میں میٹرک اور مرے کالج سیالکوٹ سے 1945ء میں بی اے تھرڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ اسی کالج کے میگزین میں ان کی کہانی ''تعبیر'' شائع ہوئی۔ اُنھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ وہ کل وقتی ادیب تھے۔ اُن کی مادری زبان پنجابی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت چلے گئے۔ وہ درس وتدریس کے پیشے سے جڑے رہے۔ وہ مہاراشٹر کے پوسٹ گریجوایٹ کالج کے پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے علاوہ اُنھیں شاعری اور تنقید سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ اُنھوں نے تخلیقی اظہار کے لیے اُردو زبان کا انتخاب کیا۔ اُن کا نظریہ تھا کہ اُردو ایک زبان نہیں بل کہ ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کا حصہ رہے۔ اُن کی افسانہ نگاری بھارت میں ہی نہیں بل کہ پاکستان میں بھی شہرت رکھتی ہے۔ اُن کو اُن کے فکشن نے عالمی سطح پر وہ مقبولیت بخشی کہ اُنھیں اُردو فکشن کے ایک درخشاں باب کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اُن کی کہانیوں کا کئی دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ اُنھیں ''بے ارادہ'' اور ''نادید'' پر میر تقی میر ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ اُنھیں ہندی اُردو ادب ایوارڈ، غالب ایوارڈ، ایوارڈ برائے اُردو نثر، مودی غالب ایوارڈ، ادیب انٹرنیشنل ساحر ایوارڈ اور قطر کا ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ اُن کا انتقال 22 اپریل 2016ء کو ہوا۔

تصانیف: دھرتی کا کال۔ میں کیوں سوچوں۔ رسائی۔ مٹی کا ادراک۔ لیکن۔ بے محاورہ۔ بے ارادہ کھلا۔ کھودو بابا کا مقبرہ۔ بستیاں۔ سلوٹیں۔ کتھا نگر۔ پرندے۔ نہیں رحمن بابو۔ اک بوند لہو کی۔ نادید۔ خواب رو۔ پار پرے۔ بیانات۔ آمدورفت۔ رابطہ۔ بے اصطلاح۔

نمونہ کلام: ''میں اپنی مرحوم انگلش ماں کی واحد اولاد ہوں اور میں نے اپنے مرحوم ہندستانی باپ کو کبھی نہیں دیکھا کیوں کہ میری ماں قانونی طور پر اس سے الگ ہوگئی اور میرے نصف باپ سے شادی کرنے کے لیے وطن لوٹ آئی اور ان کی شادی کے ساڑھے سات ماہ بعد میرا جنم ہوا۔'' (آمدورفت)

تحریر: آمنہ رشید

ناصر کاظمی

1925ء تا 1972ء

ناصر کاظمی کا اصل نام ناصر رضا کاظمی تھا اور ناصر تخلص استعمال کرتے تھے۔ وہ 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد محمد سلطان کاظمی سرکاری ملازم تھے جن کے پیشہ وارنہ تبادلوں کی وجہ سے ان کا بچپن کئی شہروں میں گزرا۔ انبالہ اور اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے وقت ناصر کاظمی پاکستان آگئے اور لاہور شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ جلد ہی اُنھیں یکے بعد دیگرے والدین کے چل بسنے کا غم بھی جھیلنا پڑا۔ اَدبی رسالہ ''اوراق نو'' اور ''ہمایوں'' کی ادارت سے وابستہ رہے اور محکمہ دیہات سدھار سے بھی منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ زندگی کے باقی سال ریڈیو پاکستان سے جڑے رہے۔ شاعری کی ابتدا نظم سے کی لیکن بعد میں وہ غزل کی طرف آگئے۔ جس وقت ناصر کاظمی نے شاعری کا آغاز کیا اس وقت تک اُردو غزل ایک طویل سفر طے کر چکی تھی۔ عشق ومحبت کے دائرے سے نکل کر اب غزل میں ہر طرح کے مضامین بیان کیے جا رہے تھے۔ 1935ء کی ترقی پسند تحریک اور قیام پاکستان کے درمیانی وقفے میں غزل کے مقابلے میں اور نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اور غزل قدرے دب گئی۔ مگر قیام پاکستان کے بعد غزل نے دوبارہ اپنا مقام حاصل کر لیا۔ ناصر کاظمی نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں ترانے بھی لکھے۔ ناصر کاظمی نے ہجرت کے تجربات، ماضی کی یادوں، اپنے جذبہ واحساس اور اپنی سوچ کی دھیمی لہروں کو تغزل کی اعلا خصوصیات اور مانوس مگر بالکل نئے مہذب طرز بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اُردو غزل میں ایک نفیس، نئے، بلند، مضبوط اور روشن مینار کا اضافہ ہوگیا۔ ناصر کاظمی چوں کہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لہٰذا غم روزگار اور عشقیہ مضامین کا اظہار ان کے ہاں ایک قدرتی بات ہے۔ 2 مارچ 1972ء کو ناصر کاظمی کا لاہور میں انتقال ہوا۔

تصانیف: برگ نے۔ دیوان۔ پہلی بارش۔ نشاط خواب۔ نیا سفر۔ شہر غریب۔ سر کی چھایا۔

نمونہ کلام:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر — اداسی بال کھولے سو رہی ہے

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا — جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

تحریر: ہیبت خان

فرمان فتح پوری
1926ء تا 2013ء

فرمان فتح پوری کا اصل نام سید دلدار علی تھا۔ وہ فتح پور ہنسوا کے ایک معزز علمی گھرانے میں 26 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فتح پور میں درسِ نظامیہ کے تحت حاصل کی اور میٹرک کا امتحان 1946ء میں اور 1950ء میں آگرہ یونی ورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور چند ماہ کے بعد برٹش حکومت کی جانب سے بہ حیثیت فارسی مترجم مسقط چلے گئے لیکن چند ماہ بعد ہی واپس بھارت آگئے اور پاکستان کے لیے ہجرت کی۔ پاکستان آکر سینٹرل گورنمنٹ کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اُردو کالج کراچی میں ادیب فاضل اور منشی فاضل کی کلاسوں میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پاکستان آکر اُنھوں نے 1950ء میں ایک انجمن ''انجمن تعلیمات ملیہ'' کی بنیاد ڈالی اور ایک سکول قایم کیا اور خود بھی اس میں پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے 1958ء میں کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو اُدبیات کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور شعبہ اُردو جامعہ کراچی سے منسلک ہوگئے جب کہ 1964ء میں پی ایچ ڈی اور 1972ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اُردو لغت بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔ وہ 3 اگست 2013ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: تدریس اُردو۔ اُردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا۔ تحقیق و تنقید۔ غالب شاعر امروز و فردا۔ اُردو کی منظوم داستانیں۔ تاویل و تعبیر۔ دریائے عشق اور بحرالمحبت۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ۔ اُردو شعرا کی تذکرہ نگاری۔ نیا اور پرانا اَدب۔ زبان اور اُردو زبان۔ ہندی اُردو تنازع۔ اقبال سب کے لیے۔ اُردو کی نعتیہ شاعری۔ عورت اور فنونِ لطیفہ۔ قمر زمانی بیگم۔ میر انیس حیات اور شاعری۔ اُردو املا اور رسم الخط۔ ارمغان گوکل پرشاد۔

نمونہ کلام: ''ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندستانی یعنی اُردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خان کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آ گیا ہے کہ اُردو تو اُردو تنہا ''ہندستانی'' کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔'' (ہندی اُردو تنازع)

تحریر: مہک اختر

حمایت علی شاعر
1926ء تا 2019ء

حمایت علی شاعر نے 14 جولائی 1926ء کو اورنگ آباد میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام میر حمایت علی اور تخلص ''شاعر'' ہے۔ وہ حیدر آباد دکن ریڈیو میں ملازم تھے، 1950ء میں کراچی ہجرت کر آئے تو ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوگئے۔ ریڈیو میں مختلف ذمہ داریوں کے بعد اُنھوں نے فلمی دنیا میں بہ طور گیت کار قدم رکھا۔ اَدبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا لیکن بعد میں شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ اُن کے تحقیقی کارناموں میں اُردو غزل کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کی غزل کے اسلوب و روایات کے ساتھ شعرا کے انداز پر بھی تفصیلی روشنی ڈالنا شامل ہے۔ اُنھوں نے جدید اُردو شاعری میں ''ثلاثی'' کی صنف کو ایجاد کیا۔ اُنھوں نے نعت اور ملی نغموں میں بھی قلم آزمائی کی۔ سندھ یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ شاعری کے علاوہ وہ صحافت، ادارت، تدریس، فلم سازی، ہدایت کاری اور نغمہ نگاری بھی کی۔ اُنھوں نے حیدر آباد سندھ میں دو اخباروں ''جناح'' اور ''منزل'' اور ماہ نامہ ''آدمیت'' میں بھی ملازمت کی اور ''ارژنگ'' کے نام سے ایک ثقافتی ادارہ بھی قایم کیا۔ ''سازِ نو'' اور ''شعور'' کے بھی مدیر رہے۔ اُنھوں نے دو فلمیں ''نوری'' اور ''گڑیا'' بھی بنائیں۔ اُنھیں فلم ''آنچل'' اور ''دامن'' کی نغمہ نگاری پر ''نگار ایوارڈ'' دیے گئے۔ اُنھیں حکومت پاکستان کی جانب سے 2002ء میں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی دیا گیا۔ وہ تحمل اور تجسس کے احساس کے شاعر تھے۔ اُن کا انتقال 16 جولائی 2019ء کو ٹورنٹو (کینیڈا) میں ہوا۔

تصانیف: آگ میں پھول۔ شکست آرزو۔ مٹی کا قرض۔ تشنگی کا سفر۔ حرف حرف روشنی۔ دو دو چراغ محفل (مختلف شعرا کا کلام)۔ عقیدت کا سفر۔ آئینہ در آئینہ۔ ہارون کی آواز۔ تجھ کو معلوم نہیں۔ کھلتے کنول سے لوگ۔ محبتوں کے سفیر۔ پاکستان میں اُردو ڈراما (پی ایچ ڈی کا مقالہ)۔ فاصلے۔ شکست کی آواز۔ گھن گھرج۔ سرگم۔ شیخ ایاز۔ اُردو نعتیہ شاعری کے 700 سال۔ برزخ۔ ایوری ورڈ الکلو۔ شخص و عکس۔

نمونہ کلام:

تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی — کس طرح انتقام لیا اپنے آپ سے

اپنے کسی عمل پہ ندامت نہیں مجھے — تھا نیک دل بہت جو گنہ گار مجھ میں تھا

تحریر: ابدال رضا

جیلانی کامران
۱۹۲۶ء تا ۲۰۰۳ء

جیلانی کامران 24 اگست 1926ء کو پونچھ، ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے اور 1957ء میں ایڈنبرگ یونی ورسٹی سے ایم اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ جیلانی کامران 1957ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بہ طور انگریزی استاد وابستہ ہوئے۔ اور مختلف کالجوں میں تدریسی اور انتظامی خدمات سرانجام دیں۔ 1979ء سے 1989ء تک ایف سی کالج لاہور میں شعبہ انگریزی کے صدر اور پھر 1999ء میں پروفیسر ایمریطس مقرر ہوئے۔ 1960ء کی دہائی میں نئی شاعری کی تحریک میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں ایک نام جیلانی کامران کا ہے جنھوں نے عربی شاعری اور انگریزی کی رومانوی شاعری کے امتزاج سے اُردو میں ایک نئی طرح کی نظم لکھی۔ انھوں نے انگریزی اور اُردو میں 28 کتابیں تحریر کیں۔ ''نقش کف پا'' اور بعد میں نظموں کے دوسرے مجموعے ''استانزے'' میں جیلانی کامران کی شاعری کا بنیادی استعارہ عشق ہے۔ جس کے موضوعات میں جدت ہے اور لہجہ دعائیہ ہے۔ ''استانزے'' میں جیلانی کامران نے پرانی شعری زبان کی بندش ترک کر کے روزمرہ بول چال کی زبان میں خیال اور جذبہ کی پیچیدگی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے 1986ء میں تمغۂ امتیاز اور 2000ء میں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ جیلانی کامران 22 فروری 2003ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

تصانیف: استانزے۔ نقش کف پا۔ چھوٹی بڑی نظمیں۔ اور نظمیں۔ دستاویز۔ جیلانی کامران کی نظمیں۔ تنقید کا نیا پس منظر۔ نئی نظم کے تقاضے۔ غالب کی تہذیبی شخصیت۔ نظریہ پاکستان کا ادبی وفکری مطالعہ۔ لاہور کی گواہی۔ قائداعظم اور آزادی کی تحریک۔ ہمارا ادبی وفکری سفر۔ مغرب کے تنقیدی نظریے۔ انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار۔ قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان۔ زندہ رہنما قائداعظم۔

نمونہ کلام:

ترے درختوں کی ٹہنیوں پر بہار اترے — تری گزرگاہیں نیک راہوں کی منزلیں ہوں
مرا زمانہ نئے نئے موسموں کی خوشبو — ترے شب و روز کی مہک ہو

تحریر: صائمہ نذیر

مختار مسعود
۱۹۲۶ء تا ۲۰۱۷ء

مختار مسعود 15 دسمبر 1926ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ عطا اللہ، علامہ محمد اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ یوں مختار مسعود اُردو، اقبال، اسلام اور پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے بھی علی گڑھ یونی ورسٹی سے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کر آئے اور پاکستان میں 1949ء میں ہونے والے امتحانات میں شرکت کی اور سول سروس میں مختلف عہدوں پر خدمات سرانجام دیتے رہے، اس کے علاوہ کئی اداروں کے سربراہ اور وفاقی سیکرٹری بھی رہے۔ وہ مینار پاکستان کی تعمیری کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ جس زمانے میں لاہور میں مینار پاکستان زیر تعمیر تھا، اس وقت اسے ''یادگار پاکستان'' کہا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں مختار مسعود لاہور کے کمشنر بن گئے اور اس کا نام ''مینار پاکستان'' کروا دیا کیوں کہ یادگار تو مرنے والوں کی ہوتی ہے جب کہ پاکستان تو ایک زندہ حقیقت ہے۔ مذکورہ موضوع کی حامل ان کی تصنیف ''آواز دوست'' ہے جس میں انھوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مختار مسعود کا اسلوب منفرد اور جداگانہ اہمیت کا حامل ہے جس میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی تحریر میں فارسی اور اُردو سے گہرا لگاؤ نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کی تراکیب، نپی تلی نثر اور تاریخ و ادب کے بے مثال حوالے ان کی تحریر کو باقی ادبا سے ممتاز مقام دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اُن کا مدلل تجزیہ اور بے خوف اور دوٹوک انداز ان کی تحریر میں دلبری کے ساتھ ساتھ دلیری کے نقوش ظاہر کرتا ہے۔ انھیں 2003ء میں ''ستارہ امتیاز'' سے بھی نوازا گیا۔ مختار مسعود 15 اپریل 2017ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

تصانیف: آواز دوست۔ سفر نصیب۔ لوح ایام۔ حرف شوق۔

نمونہ کلام: ''اس برعظیم میں عالم گیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا، وہ مینار قرارداد پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں لیکن ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت، جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہے، تین صدیوں پر محیط ہے۔'' (آواز دوست)

تحریر: شبانہ پاشا

قراۃ العین حیدر
1927ء تا 2007ء

قراۃ العین حیدر کی ولادت 20 جنوری 1927ء کو علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اور ان کی والدہ نذر سجاد حیدر دونوں معروف ادیب تھے۔ اُن کی ابتدائی زندگی کے چند سال جزیرہ پورٹ بلیئر میں گزرے۔ ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے انگریزی اَدب میں ایم۔اے کیا۔ صرف گیارہ سال کی عمر میں بچوں کے لیے پہلی کہانی ''بی چوہا'' لکھی جو ''پھول'' میں شائع ہوئی۔ 1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو قراۃ العین حیدر پاکستان چلی آئیں۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے لندن میں بی بی سی ریڈیو پر بھی کام کیا اور کچھ دستاویزی فلمیں بھی بنائیں۔ 1959ء میں ان کا مشہور ناول ''آگ کا دریا'' چھپا اور اس کی مخالفت ہوئی تو دل برداشتہ ہو کر ہندستان واپس چلی گئیں۔ اسی زمانے میں ہندستان میں انگریزی رسالوں ''امپرنٹ'' اور ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی ادارت سے وابستہ رہیں۔ قراۃ العین حیدر اُردو کی ممتاز ترین ناول نگار ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' 1949ء میں چھپا تھا۔ قراۃ العین حیدر کے بھی ناول اور کہانیوں میں تقسیم ہند کا درد صاف دکھائی دیتا ہے۔ ''آخرِ شب کے ہم سفر'' کے لیے اُنھیں بھارت کے سب سے باوقار اَدبی اعزاز گیان پیٹھ انعام سے بھی نوازا گیا جب کہ بھارتی حکومت نے اُنھیں پدم شری اور پدم بھوشن جیسے اعزاز بھی دیے۔ اُردو ترقی پسند افسانہ نگاروں میں قراۃ العین حیدر کا نام بھی شامل ہے۔ اُنھیں اُردو ادب کی ورجینا وولف کہا جاتا ہے۔ 21 اگست 2007ء کو وفات پائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔

تصانیف: آگ کا دریا۔ آخرِ شب کے ہم سفر۔ میرے بھی صنم خانے۔ چاندنی بیگم۔ کارِ جہاں دراز ہے۔ سفینۂ غمِ دل۔ روشنی کی رفتار۔ پت جھڑ کی آواز۔ گردشِ رنگِ چمن۔ شیشے کا گھر۔

نمونہ کلام: ''لڑکیاں سوانگ بھرنے کی بے حد شوقین ہوتی ہیں بچپن وہ پلنگ کھڑے کر کے ان کے پلنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر کھیلتی ہیں۔ گھروندا سجا کر تصور کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے۔ گڑیاں گڈے ان کے لیے جاندار انسان ہیں'' (آگ کا دریا)

تحریر: صائمہ نورین

منیر نیازی
1927ء تا 2006ء

منیر نیازی 9 اپریل 1927ء کو ضلع ہوشیار پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ جنگِ عظیم کے دوران ہندوستانی بحریہ میں ملازم بھرتی ہو گئے لیکن بہت جلد ہی آپ نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور واپس آ گئے۔ برصغیر کی آزادی کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور آ گئے۔ پھر آپ نے شاعری کو بہ طور پیشہ اختیار کیا۔ آپ کی ابتدائی شاعری قیام ساہیوال کے ایام کی یادگار ہے۔ آپ نے ساہی وال میں ''سات رنگ'' کے نام سے ایک اَدبی رسالہ بھی جاری کروایا۔ لاہور منتقلی کے بعد آپ نے شاعری کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کے لیے گیت بھی لکھے۔ منیر نیازی اُردو غزل اور نظم دونوں کے کامیاب شاعر ہیں۔ ان دونوں اصناف میں ان کے ہاں فکر و فن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ بہ طور نظم گو اُنھیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ آپ نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ منیر نیازی کی شاعری میں خوب صورت مناظر اور پراسرار رومانیت کے سائے ہر طرف سرسراتے محسوس ہوتے ہیں ان میں شام جنگل موت ہوا، چاند، ویران اور اجڑے ہوئے شہروں، سفر، اساطیری فضا اور روایات وغیرہ شامل ہیں۔ منیر نیازی نے اپنی شاعری میں معاشرتی رویوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ اُن کے ہاں ہیئت کے تجربات میں چینی شاعری کی طرح کا اختصار ہے۔ منیر نیازی 26 دسمبر 2006ء کو 79 برس کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

تصانیف: تیز ہوا اور تنہا پھول۔ سفید دن کی ہوا۔ دشمنوں کے درمیان شام۔ پہلی بات ہی آخری تھی۔ آغاز زمستاں میں دوبارہ۔ جنگل میں دھنک۔ ایک دعا جو میں بھول گیا تھا۔ چھ رنگین دروازے۔ ساعت سیار۔ ماہ منیر۔ غزلیات منیر نیازی۔ اس بے وفا کا شہر۔ محبت اب نہیں ہو گی۔ چار چپ چیزاں۔ سفر دی رات۔ رستہ دسن والے تارے۔ قصہ دو بھراواں دا۔ نیا گرا اے واپسی۔ قصہ کلّے آدمی دے سفر دا۔ سفر نامہ چین۔ ناروے کی سیر۔ ایک اور دریا (کلیات)۔

نمونہ کلام:

دشمنی رسمِ جہاں ہے دوستی حرفِ غلط — آدمی تنہا کھڑا ہے دشمنوں کے درمیاں

منیر اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے — کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

تحریر: اقصیٰ لطیف

الطاف فاطمہ
1927ء تا 2018ء

الطاف فاطمہ 10 جون 1927ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے دادا مولانا فضل حق خیر آبادی 1857ء کی جنگ آزادی کے نام ور مجاہد تھے۔ آپ کے والد کا نام فضل امین تھا جنھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کیا تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر سے ہی کیا اور ساتھ ہی سکول کی تعلیم کا آغاز بھی ہوگیا۔ 1947ء میں اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان آئیں اور تعلیمی سلسلہ بحال کیا۔ 1954ء میں آپ نے ایم اے اُردو اورینٹل کالج سے کیا اور وہیں سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور میں اُردو کی استاد مقرر ہوئیں اور صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ الطاف فاطمہ کا شمار اُردو کی نام ور ناول نگار، افسانہ نگار، مترجم اور معلم خواتین میں ہوتا ہے۔ الطاف فاطمہ، ناول نگار، افسانہ نویس، نشاط فاطمہ کی بہن تھیں۔ آپ کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ جو اُنھوں نے اپنی زندگی کی گردوپیش سے لیے۔ محبت کا انجام آپ نے زیادہ تر الم ناک دکھایا اور ان کے ہاں محبت کا روایتی و داستانوی تصور بھی ملتا ہے۔ اُنھوں نے ناول نگاری کا آغاز "نشانِ محفل" سے کیا۔ یہ پاکستان کے قیام سے پہلے اور بعد کے چند سالوں کا احاطہ کرتا ہے۔ الطاف فاطمہ 29 نومبر 2018ء کو لاہور میں انتقال کر گئیں۔

تصانیف: جاپانی افسانہ نگار خواتین (ترجمہ)۔ سچ کہانیاں: بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور ہندی افسانے (تراجم افسانے)۔ اُردو میں فنِ سوانح نگاری اور اس کا ارتقا۔ روزمرہ اُدب۔ بڑے آدمی اور ان کے نظریات (ترجمہ)۔ چلتا مسافر (ناول)۔ دستک نہ دو۔ نغمے کا قتل (ترجمہ)۔ خواب گر۔ نشانِ محفل۔ تارِ عنکبوت۔ جب دیواریں گریہ کرتی ہیں۔

نمونہ کلام: "نیچے سے سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے اور وہ کچے پکے بیر جیبوں میں بھرے دھم سے نیچے کود پڑی۔ بیری کے نیچے سرخ اور زرد کھٹ مٹھے بیروں کا بچھونا سا بچھا ہوا تھا۔ بندو، شبراتی، مدھو اور جمعدار کا لڑکا چنا سب مل کر بیر چن چن کر جیبوں میں بھر رہے تھے۔" (دستک نہ دو)

تحریر: اقرا اسلم

ابنِ انشا
1927ء تا 1978ء

ابنِ انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا اور تخلص انشا استعمال کرتے تھے۔ ابنِ انشا نے 15 جون 1927ء کو جالندھر (مشرقی پنجاب) میں آنکھ کھولی۔ لدھیانہ میں تعلیم حاصل کی اور 1946ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوگئے۔ 1947ء میں تقسیمِ ہند کے بعد ابنِ انشا پہلے لاہور اور بعد میں کراچی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہوگئے۔ 1953ء میں کراچی یونی ورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کیا۔ وہ 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے اس کے علاوہ وہ ٹوکیو بک ڈویلپمنٹ پروگرام کے وائس چیئرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگرام ٹوکیو کی مرکزی مجلسِ ادارت کے رکن بھی تھے۔ روزنامہ جنگ کراچی اور روزنامہ امروز لاہور میں کالم بھی لکھتے تھے۔ یونیسکو کی طرف سے انھیں مشیر بھی مقرر کیا گیا۔ وہ شاعر، مزاح نگار، کالم نگار، مترجم اور سفرنامہ نگار کے طور پر سامنے آئے۔ علمی و ادبی خدمات کے اعزاز میں انھیں 1978ء کو صدارتی تمغا برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ ابنِ انشا منفرد لہجے اور اسلوب کے مالک شاعر تھے۔ اُنھوں نے گیت، نظمیں اور غزلیں لکھیں جن کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ابنِ انشا ایک فطری مزاح نگار تھے۔ ابنِ انشا کو یونیسکو کی طرف سے مشیر مقرر کیا گیا تو ایشیائی و مغربی ممالک کے دورے کر کے شان دار سفرنامے لکھے۔ ابنِ انشا نے چینی، روسی، انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے فن پاروں کا اُردو ترجمہ کیا۔ مختلف اخبارات میں طنزیہ و فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ اُنھوں نے 11 جنوری 1978ء کو لندن میں وفات پائی۔

تصانیف: چاند نگر۔ اس بستی کے اک کوچے میں۔ دلِ وحشی۔ بلو کا بستہ۔ آپ سے کیا پردہ۔ خمارِ گندم۔ اُردو کی آخری کتاب۔ آوارہ گرد کی ڈائری۔ دنیا گول ہے۔ ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے۔ نگری نگری پھرا مسافر۔ خط انشا جی کے۔ باتیں انشا جی کی۔ اندھا کنواں۔ چینی نظمیں۔ سحر ہونے تک۔ سانس کی پھانس۔ لاکھوں کا شہر۔ کارنامے جناب تیس مار خان کے۔

نمونہ کلام:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا   کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا   وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

تحریر: ابدال رضا

ساغر صدیقی
1928ء تا 1974ء

ساغر صدیقی کا پیدائشی نام محمد اختر تھا۔ وہ 1928ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ افلاس کے باعث تعلیم کا حصول محال تھا۔ محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن کے پاس جانے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھی سے پڑھا۔ پھر امرت سر آگئے اور ایک دوکان دار کے ہاں لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرنے لگے۔ ان کی شاعری کا آغاز چودہ سال کی عمر میں ہوا۔ ساغر کی اصل شہرت 1944ء میں ہوئی جب امرت سر میں ایک مشاعرہ ہوا اور وہاں ایک صاحب نے ساغر صدیقی کا ذکر کیا اور اُنھیں مشاعرے میں شعر پڑھنے کا موقع دلوایا ساغر کی آواز میں سوز تھا اور اُنھوں نے ترنم سے شعر پڑھے۔ اُنھوں نے صحیح معنوں میں مشاعرہ لوٹ لیا اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں ان کی مانگ بڑھ گئی۔ 1947ء میں پاکستان بنا تو وہ امرت سر سے لاہور آگئے۔ ان کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا، فلم بنانے والوں نے اُنھیں گیتوں کی فرمائش کی اور حیرت ناک کامیابی ہوئی اس زمانے کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا تھے۔ 1947ء سے 1952ء تک ساغر کی زندگی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گئے بل کہ بعض جریدے تو ان ہی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ پھر اُنھیں نشے کی لت لگ گئی جس وجہ سے ان کی حالت اتنی بری ہو گئی کہ لوگ اُنھیں افیون اور چرس دے کر شعر اور غزلیں لکھوا کر لے جاتے۔ ساغر نے غزل، نظم، قطع، رباعی ہر صنفِ سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کے چھ مجموعے ان کی زندگی میں لاہور سے چھپے۔ جنوری 1974ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کا علاج بھی چرس اور مارفیا سے کیا فالج سے تو نجات مل گئی مگر دایاں ہاتھ بے کار ہو گیا۔ اُن کا انتقال 19 جولائی 1974ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: غم بہار۔ زہر آرزو۔ لوح جنوں۔ سبز گنبد۔ شب آگئی۔ مقتل گل۔ محبت مستقل غم ہے۔ دیوان ساغر صدیقی۔

نمونہ کلام:

آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں	لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں
جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی	اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

تحریر: افضہ جبیں

حبیب جالب
1928ء تا 1993ء

حبیب جالب 24 مارچ 1928ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ اینگلو عربک ہائی سکول دہلی سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ آزادی کے بعد کراچی آگئے اور مزید تعلیم حاصل کی، کچھ عرصہ سندھ ہاری تحریک میں کام کیا۔ یہیں ان میں طبقاتی شعور پیدا ہوا اور اُنھوں نے معاشرتی ناانصافیوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ روزنامہ جنگ اور لائل پور ٹیکسٹائل مل سے روزگار کے سلسلے میں منسلک ہوئے۔ پہلا مجموعہ کلام "برگ آوارہ" کے نام سے 1957ء میں شائع کیا، مختلف شہروں سے ہجرت کرتے ہوئے بالآخر لاہور میں مستقل آباد ہو گئے۔ اُن کی آمدنی کا ذریعہ مشاعرے تھے یا پھر فلمی گیت۔ مفلوک الحالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ جیل میں اُنھوں نے "سرِ مقتل" کے عنوان سے کچھ اشعار لکھے جو حکومت نے ضبط کر لیے۔ جالب نے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں اپنی شاعری میں مارشل لا کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ اُنھیں مشہور پاکستانی فلم زرقا میں 'رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے' لکھنے پر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اُنھوں نے کئی فلموں کے لیے گیت لکھے جن میں ہم ایک ہیں' موت کا نشہ' ناگ منی' دو راستے' زخمی' بھروسا اور چند اور فلمیں بھی شامل ہیں۔ اُن کو نگار فلمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 2006ء سے ان کے نام سے حبیب جالب امن ایوارڈ کا اجرا کیا گیا۔ ابتدا میں جگر مراد آبادی سے متاثر تھے اور روایتی غزلیں کہتے تھے۔ حبیب جالب کی سیاسی اور انقلابی شاعری آج بھی عام آدمی کو ظلم کے خلاف بے باک آواز اٹھانے کا سبق دیتی ہے۔ حبیب جالب کی پوری زندگی فقیری میں گزری۔ وہ 12 مارچ 1993ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

تصانیف: صراطِ مستقیم۔ ذکر بہتے خوں کا۔ گنبدِ بے در۔ کلیات حبیب جالب۔ اس شہر خرابی میں۔ گوشے میں قفس کے۔ حرفِ حق۔ حرفِ سرِ دار۔ ایجاد ستم۔

نمونہ کلام:

وہی حالات ہیں فقیروں کے	دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا	جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

تحریر: مصباح یونس

ابنِ صفی
1928ء تا 1980ء

ابنِ صفی نے 26 جولائی 1928ء کو الٰہ آباد کے گاؤں نارا میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ تعلیم نارا اور الٰہ آباد سے حاصل کی۔ عباس حسینی کے ماہ نامہ ''نکہت'' میں شعبہ شاعری کے نگران مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ مختلف قلمی ناموں سے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھنے لگے جن میں ''طغرل فرغان'' اور ''سنکی سولجر'' جیسے اچھوتے نام شامل تھے۔ وہ ''اسرار ناروی'' کے نام سے شاعری بھی کرتے رہے۔ اُنھوں نے اسلامیہ سکول اور یادگارِ حسینی سکول میں تدریسی فرائض بھی سرانجام دیے۔ وہ 1952ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور کراچی کے علاقے لالوکھیت میں رہائش اختیار کی۔ 1955ء میں ابنِ صفی نے ''خوفناک عمارت'' نام سے ''عمران سیریز'' کا پہلا ناول لکھا جس نے اُنھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ 1957ء میں اُنھوں نے ''اسرار پبلی کیشنز'' کا ادارہ قایم کیا جس کے تحت ''جاسوسی دنیا'' کا پہلا ناول ''ٹھنڈی آگ'' شایع ہوا۔ وہ اُردو کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار ہیں۔ اُن کے ناولوں میں ''جاسوسی دنیا''، ''فریدی حمید سیریز'' اور ''عمران سیریز'' شامل ہیں۔ 253 ناولوں میں سے صرف 8 ناولوں کا مرکزی خیال مستعار لیا گیا ہے جب کہ باقی 245 ناول مکمل طور پر ان کے اپنے ہیں۔ اُن کا انتقال 26 جولائی 1980ء کو کراچی میں ہوا۔

تصانیف: دلیر مجرم۔ بھیانک آدمی۔ ٹھنڈی آگ۔ جونک کی واپسی۔ زہریلا سیارہ۔ سہ رنگا شعلہ۔ مہکتے محافظ۔ خطرناک لاشیں۔ صحرائی دیوانہ۔ ہیروں کا فریب۔ جہنم کی رقاصہ۔ سایے کا قتل۔ دہشت گرد۔ نیلم کی واپسی۔ تجوری کا راز۔ عورت فروش کا قتل۔ خوف ناک عمارت۔ چٹانوں میں فائر۔ نیلے پرندے۔ سانپوں کے شکاری۔ پتھر کا خون۔ دھوئیں کی تحریر۔ قبر اور خنجر۔ رائی کا پربت۔ دوسری آنکھ۔ بلا کو اینڈ کو۔ منحوس کیکڑا۔ ادھورا آدمی۔ شوگر بینک۔ شعلوں کا ناچ۔ پوائنٹ نمبر بارہ۔ ایڈلاوا۔ برف کے بھوت۔

نمونہ کلام: ''بیٹھے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُنھوں نے بے صبری سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شازیہ کی آواز آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میں ایک اور آواز سنائی دی۔ شازیہ کو کوئی ریسیور رکھ دینے کو کہہ رہا تھا۔'' (زہریلا سیارہ)

تحریر: ابدال رضا

سجاد باقر رضوی
1928ء تا 1993ء

سجاد باقر رضوی نے 14 اکتوبر 1928ء کو اعظم گڑھ میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام سید اولادِ باقر تھا۔ یوپی بورڈ سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ پرائیویٹ امیدوار کے طور پر کیا۔ اکتوبر 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اُنھوں نے سندھ مسلم لا کالج سے ایل ایل بی کیا کراچی یونی ورسٹی سے بی اے آنرز اور ایم اے انگریزی اور اُردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے جہاں اسلامیہ کالج سول لائنز اور اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب سے منسلک ہو گئے۔ سجاد باقر رضوی بہ یک وقت شاعر، محقق، نقاد، مترجم اور ماہرِ تعلیم تھے۔ اُن کی کتاب ''مغربی تنقید کے اصول'' کو اُردو کے تنقیدی اَدب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے نا صرف تنقید اور شاعری میں قلم آزمائی کی بل کہ انگریزی کتب کے اُردو تراجم بھی کیے۔ اُن کا نام سربرآوردہ اور رجحان ساز نقادوں میں سے ایک ہے۔ اُنھوں نے تنقید کو پڑھنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ فن پاروں کو پرکھنے کے لیے اُصول و ضوابط قایم کیے۔ وہ سہل پسندی کو تنقیدی مشاہدات کے میدان میں قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ وہ خاص طور پر اَدبی تنقید نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی اُردو شاعری 1857ء تک'' بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اُنھوں نے 13 اگست 1993ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: مغربی تنقید کے اصول۔ تہذیب و تخلیق۔ وضاحتیں۔ معروضات۔ باتیں۔ علامہ اقبال اور عرضِ حال۔ تیشۂ لفظ۔ جوئے معنی۔ داستانِ مغلیہ۔ جدید ناول نگار (امریکہ میں)۔ اُفتادگانِ خاک۔ ہلال۔ بدلتی دنیا کے تقاضے۔ جدید دنیا میں روایتی اسلام۔ غالب: ذاتی تاثرات کے آئینے میں (مرتب) قائداعظم محمد علی جناح معمارِ پاکستان۔ مرقعِ اَدب۔

نمونہ کلام: تم نے باقرؔ دل کا دروازہ کھلا رکھا تھا کیوں — جس کو آنا تھا وہ آخر دردبن کر آ گیا

''دانتے کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ مادری زبان کو اس کی اعلاترین سطح پر استعمال کرے گا۔ بہ الفاظ دیگر اس کی زبان تہذیب کی زبان ہوگی جسے اس زبان کے مہذب ترین بولنے والے استعمال کرتے ہوں۔''

تحریر: ابدال رضا

بیگم اختر ریاض الدین
پیدائش:1928ء

بیگم اختر ریاض الدین 15 اکتوبر 1928ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ 1949ء میں لاہور سے بی۔اے کیا۔ بیگم اختر ریاض الدین کا اصل شعبہ درس و تدریس تھا، اس کے ساتھ ساتھ اُردو میں لکھنا جاری رکھا۔ آپ ایک سی۔ ایس۔ پی آفیسر ریاض الدین کی بیوی ہیں جو مولانا صلاح الدین کے رشتہ میں بھتیجے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین نے انگریزی میں ایم اے کیا اور پھر تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ مدت پڑھاتی رہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اُردو مضامین لکھنے کا شوق بھی اُنھوں نے برابر جاری رکھا۔ ان کے انگریزی مضامین پاکستان ٹائمز میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ سفرنامے ملک کے بلند پایہ جراید میں چھپتے رہتے ہیں۔ اُن کے خاوند کو سرکاری فرائض کے سلسلے میں مختلف ممالک کے سفر پر جانا پڑا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے بھی اپنے شوہر کے ساتھ ان علاقوں کی سیر کی اور اَدبی شوق کی وجہ سے ان ممالک کے سفرنامے بھی تخلیق کیے اور ان میں یورپ، ایشیا اور امریکہ کے ممالک کے متعلق اپنے دو سفرنامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" لکھے، جو بہت مشہور ہوئے۔ ان کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے ان ممالک کی سیر کر رہے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین کی تحریر کی ایک خصوصیت ان کی منظر نگاری ہے۔ اُنھوں نے ترقی پذیر ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کی حالات کی جو منظر کشی کی، اس میں ذرہ بھر بھی شک کی گنجایش نہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین کی محنت کاوشوں اور قابلیت کی بنا پر اُنھیں ان کی تصنیف "دھنک پر قدم" پر آدم جی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اُن کا شمار ان سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھیں فطرت کے حسن کو کاغذ پر اتارنا آتا ہے۔

تصانیف: سات سمندر پار۔ دھنک پر قدم۔

نمونہ کلام: "میری بیٹی اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی اور لنچ قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔ رات کو بھی کچھ نہیں پکایا۔ جالے، چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔ یہ جو میاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔" (دھنک پر قدم)

تحریر: زیب النسا

بانو قدسیہ
1928ء تا 2017ء

بانو قدسیہ 28 نومبر 1928ء کو فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ جب وہ ساڑھے تین برس کی تھیں، ان کے والد بدرالزماں کا انتقال ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئیں، اس سے پہلے وہ مشرقی بھارت کے صوبہ ہماچل پردیش دھرم شالا میں زیرِ تعلیم رہیں۔ بانو قدسیہ اپنے کالج کے میگزین اور دوسرے رسائل کے لیے بھی لکھتی رہیں۔ اُنھوں نے کنیئرڈ کالج برائے خواتین لاہور سے ریاضیات اور اقتصادیات میں گریجوایشن کیا۔ 1951ء میں مشہور ناول و ڈرامہ نویس اشفاق احمد سے شادی کر لی۔ بانو قدسیہ کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے "ستارۂ امتیاز"، "ہلالِ امتیاز"، "کمالِ فن ایوارڈ"، اور "اعزازِ حیات" سے بھی نوازا گیا۔ وہ اُردو اور پنجابی زبان کی مشہور و معروف ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس تھیں جو اپنے ناول "راجہ گدھ" کی وجہ سے مشہور ہوئیں جس میں رزق حرام کے انسانی جسم اور نفسیات پر ہونے والے اثرات کو بنیاد بنایا گیا ہے، یہ ناول اَدبی حلقوں میں تا دیر زیرِ بحث رہا۔ قارئین نے اسے اس قدر سراہا کہ بانو قدسیہ کے دیگر ناول اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ اُنھوں نے اُردو اور پنجابی زبانوں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بہت سے ڈرامے بھی لکھے، ان کے ایک ڈرامے "آدھی بات" کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ بانو قدسیہ کا انتقال 4 فروری 2017ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: شہرِ بے مثال۔ راجہ گدھ۔ حاصل گھاٹ۔ ایک دن۔ پُروا۔ موم کی گلیاں۔ نا قابلِ ذکر۔ آتش زیرِ پا۔ سامان وجود۔ دست بستہ۔ کچھ اور نہیں۔ امر بیل۔ دوسرا دروازہ۔ بازگشت۔ توجہ کی طالب۔ حوا کے نام۔ آسے پاسے۔ سدھراں۔ فٹ پاتھ کی گھاس۔ پیا نام کا دیا۔ تماثیل۔ سورج مکھی۔ لگن اپنی اپنی۔ دوسرا قدم۔ آدھی بات۔ مرد ابریشم۔

نمونہ کلام: "پہلے پہل آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی، وہ فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا لیکن ایک دن ابلیس نے موقع پا کر اس میں جھانکا، اس لمحے انسان کے اندر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی۔" (راجہ گدھ)

تحریر: مریم صدیق

انور سدید
1928ء تا 2016ء

ڈاکٹر انور سدید 4 دسمبر 1928ء کو ضلع سرگودھا کے قصبہ مہانی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان میں حاصل کی۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ آپ نے تحریک پاکستان کی سرگرمیوں میں بھی شرکت کی۔ عملی زندگی کی ابتدا محکمہ آبپاشی میں لوئر گریڈ کلرک سے کی۔1948ء میں محکمہ آب پاشی میں سب انجینئر ہوئے اور ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ پھر صحافت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ انور سدید نے ''اُردو اَدب کی تحریکیں'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی نے اُنھیں بہترین کالم نگار کا اے پی این ایس ایوارڈ عطا کیا۔2009ء میں اَدبی خدمات پر صدرِ پاکستان نے تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ ڈاکٹر انور سدید کا کام کئی جہتوں پر محیط ہے: ان میں اُردو اَدب کی تاریخ، انشائیہ، تحقیق اور تنقید، طنز و مزاح، خاکہ نگاری، سفرنامہ نگاری، شاعری، کالم نگاری و تبصرہ نویسی اور ترجمہ نگاری شامل ہیں۔ وہ ایک صاحبِ اسلوب اور رجحان ساز ادیب تھے۔ انور سدید نے ''نوائے وقت'' سنڈے میگزین میں کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ وہ 20 مارچ 2016ء کو وفات پا گئے۔

تصانیف: فکر و خیال۔ اختلافات۔ کھردرے مضامین۔ اُردو افسانے کی کروٹیں۔ موضوعات۔ برسبیل تنقید۔ شمع اُردو کا سفر۔ نئے اَدبی جائزے۔ میر انیس کی اقلیم سخن۔ محترم چہرے۔ اُردو اَدب کی تحریکیں۔ اُردو اَدب کی مختصر تاریخ۔ پاکستان میں اَدبی رسائل کی تاریخ۔ اُردو اَدب میں سفرنامہ۔ اُردو اَدب میں انشائیہ۔ اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش۔ غالب کے نئے خطوط۔ دلاور فگاریاں۔ قلم کے لوگ۔ ادیبانِ رفتہ۔ آسمان میں پتنگیں۔ دلی دور نہیں۔ اُردو افسانہ عہد بہ عہد۔ وزیر آغا ایک مطالعہ۔

نمونۂ کلام: ''نیرنگ جہاں نے ناصر کاظمی کو میر تقی میر کی سی واردات سے متعارف کرایا اور اُنھوں نے ایسی شعری کیفیت پیدا کی جس میں شاعر کسک تو محسوس کرتا ہے لیکن آنسو کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا۔''

تحریر: آصف ارشاد

خدیجہ مستور
1928ء تا 1982ء

خدیجہ مستور 11 دسمبر 1928ء کو بریلی میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد ڈاکٹر تہور احمد خاں سرکاری ملازم تھے ملازمت کی وجہ سے مختلف شہروں اور قصبوں میں اُن کا تبادلہ ہوتا رہا جس کی وجہ سے وہ صحیح معنوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دے سکے۔ خدیجہ کی والدہ انور جہاں ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ان کے مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی بچوں میں بھی اَدبی رجحانات پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں خدیجہ کے والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے ان کے خاندان کو بے حد مشکلات پیش آئیں۔ خدیجہ صفائی پسند تھیں۔ کسی کی برائی کرنے کی عادت نہیں تھی جو بھی بات ہوتی سیدھے منہ پر کہہ دیتی تھیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت پرسکون تھی۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہنے کے بعد تقسیم ہند کے وقت لاہور منتقل ہوئیں۔ ہجرت کے وقت خدیجہ کا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں تھا۔ اس مشکل وقت میں احمد ندیم قاسمی نے ان کی مدد کی۔1950ء میں خدیجہ کی شادی مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے بھانجے ظہیر بابر سے ہوئی جو صحافت کے پیشے سے منسلک تھے خدیجہ نے شادی کے بعد پرسکون زندگی گزاری دونوں میاں بیوی میں بے حد محبت تھی دونوں ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ خدیجہ مستور کے پانچ افسانوں کے مجموعے سامنے آئے جس میں ''بوچھاڑ'' ''اور'' ''چند روز اور'' ''پر انگنیا'' ''آدم جی انعام'' جب کہ ان کے افسانوں کے آخری مجموعے ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' پر ''ہجرہ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ آپ نے اپنے افسانوں کی وجہ سے اَدبی حلقوں میں شہرت پائی۔ خدیجہ مستور نے 26 جولائی 1982ء کو لندن میں وفات پائی اور ان کی میت لاہور لا کر تدفین کی گئی۔

تصانیف: کھیل۔ بوچھاڑ۔ چند روز اور۔ تھکے ہارے۔ ٹھنڈا میٹھا پانی۔ آنگن۔ زمین۔

نمونۂ کلام: ''بڑے چچا اپنے صاف ستھرے بستر پر پاؤں پھیلائے سکون سے لیٹے تھے اور اسرار ان کے پاس سکون سے لیٹے تھے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے باتیں کرنے میں مصروف تھا سامنے پیپل کا درخت تھا جس میں سے چاندنی کی روشنی آرہی تھی۔'' (آنگن)

تحریر: ماہم رضا

جمیل جالبی
1929ء تا 2019ء

جمیل جالبی 12 جون 1929ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم سہارن پور میں ہوئی جہاں سے اُنھوں نے میٹرک پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے ایف اے اور بی اے پاس کیا اور سندھ یونی ورسٹی سے اُنھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور بعد میں ڈی لٹ سے نوازے گئے۔ بہادر یار جنگ سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے اس کے بعد مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور انکم ٹیکس کے کے محکمے سے وابستہ رہے۔ بعد میں وزارت تعلیم سے منسلک ہوئے اور پھر کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ جمیل جالبی اَدبی طور پر بے حد فعال رہے ہیں۔ وہ بہ یک وقت تنقید اور تحقیق کے میدان کے شہ سوار ہیں۔ اُن کی ''تاریخ اَدب اُردو'' جو ہنوز نامکمل ہے وہ بے حد وقیع سمجھی جاتی ہے۔ پہلی بار قدیم سے لے کر اٹھارویں صدی تک کا معروضی جائزہ لیا ہے اور یہ معروضی جائزہ تحقیق پر مبنی ہے۔ تاریخ نویس ہر نئی تاریخ کی تدوین و ترتیب میں موصوف کی تاریخ سے اکتساب کرنے پر مجبور ہیں۔ اُردو اَدب میں جمیل جالبی کا یہ کام نہ صرف گراں قدر سمجھا جاتا ہے بل کہ اس کی اہمیت تاریخی ہے۔ جمیل جالبی کی حیثیت جیسے ایک محقق، ایک مورخ کی ہے ویسی نقاد کی نہیں ہے۔ ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' بھی قابل مطالعہ رہی ہے۔ جمیل جالبی کی حیثیت ایک محقق کے طور پر زیادہ ہے۔ 18 اپریل 2019ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔

تصانیف: تاریخ اَدب اُردو۔ تنقید اور تجربے۔ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ مثنوی (کدم راؤ پدم راؤ)۔ نئی تنقید۔ حیرت ناک کہانیاں۔ تنقید و تجربہ۔ اَدب کلچر اور مسائل۔ محمد تقی میر۔ معاصر اَدب۔ قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل۔ دیوان حسن شوقی۔ دیوان نصرتی۔ قدیم اُردو کی لغت۔ میرا جی ایک مطالعہ۔ ن۔ م راشد ایک مطالعہ۔ خوجی۔ قلندر بخش جرات تہذیب کا نمایندہ شاعر۔ جانورستان۔

نمونہ کلام: ''مجھے یقین ہے کہ دیہاتی زندگی میں انسانی روح کے پھلنے پھولنے اور زندہ رہنے کے لیے چند بنیادی شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ہر شخص دیہات کی زندگی یا دیہاتی مشقت میں پھل پھول نہیں سکتا۔'' (ارسطو سے ایلیٹ تک)

تحریر: افشاں اکرم

دلاور فگار
1929ء تا 1998ء

دلاور فگار 8 جولائی 1929ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد نے ان کا نام دلاور حسین تجویز کیا۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں ہی حاصل کی، اس کے بعد اعلا تعلیم کے لیے آگرہ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ 1969ء میں پاکستان آ گئے۔ اُنھوں نے غزل گوئی سے اپنی اَدبی زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں اُنھوں نے دلاور حسین شباب کے قلمی نام سے لکھا لیکن بعد میں اُنھوں نے اپنے لیے دلاور فگار نام زیادہ اچھا سمجھا۔ غزل گوئی سے آپ جلد اکتا گئے۔ یہ اکتاہٹ آپ کو جلد ہی طنز و مزاح کی طرف لے آئی اور پھر ساری عمر طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں ہی لکھتے رہے۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز اُنھوں نے بھارت میں درس و تدریس سے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنا لیا اور یہاں وہ عبداللہ ہارون کالج میں کچھ عرصے تک بہ حیثیت لیکچرار پڑھاتے رہے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''حادثات'' 1954ء میں شایع ہوا جسے اَدبی حلقے میں خوب پذیرائی ملی۔ شعر گوئی کا آغاز 14 برس کی عمر میں ہی کر دیا تھا۔ اُنھیں مولوی جام نوائی بدایونی اور مولانا جامی بدایونی نامی اساتذہ کی رہنمائی ملی تھی۔ اُن کا دوسرا مجموعہ جو مزاحیہ گیتوں، نظموں اور رباعیوں پر مشتمل تھا وہ 1963ء میں ''ستم ظریفاں'' کے نام سے شایع ہوا۔ اُنھوں نے ملازمت کے دوران بھی شاعری کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی دوران ان کی ایک نظم ''شاعر اعظم'' منظر عام پر آئی جو کہ ان کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی اور یہی نظم ان کی شہرت کا سب سے پہلا نمونہ ہے۔ اُن کی وجہ شہرت اُردو اَدب میں مزاح نگاری ہے۔ اُنھوں نے شان دار مزاح کے متعدد نمونے پیش کیے۔ دلاور فگار نے 25 جنوری 1998ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: حادثے۔ ستم ظریفاں۔ شامتِ اعمال۔ آداب عرض۔ عصر نو۔ انگلیاں فگار اپنی۔ مطلع عرض ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ خوشبو کا سفر۔ آئینہ راغب۔ چراغ خنداں۔ خوب تر کہاں۔ آبشار نو۔ فی سبیل اللہ۔ صلہ شہید کیا ہے؟۔ کہا سنا معاف کرنا۔

نمونہ کلام: نہ مرا مکاں ہی بدل گیا نہ ترا پتہ کوئی اور ہے — مری راہ پھر بھی ہے مختلف ترا راستہ کوئی اور ہے

تحریر: انجم ستار

ہاجرہ مسرور
1930ء تا 2012ء

ہاجرہ مسرور 17 جنوری 1930ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم کی ابتدا بڑی بہنوں عائشہ درانی اور خدیجہ مستور کے ساتھ ہوئی۔ والد کی بے وقت موت سے ان کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ رک گیا اس کی وجہ سے کوئی ڈگری نہ لے سکیں لیکن ان کے گھر کے ماحول نے انھیں حصول علم کی طرف مائل رکھا۔ ہاجرہ مسرور نے احمد ندیم قاسمی اور محمد طفیل کے تعاون سے ''نقوش'' کا پہلا نمبر نکالا پھر وہ کراچی میں کئی سال رہائش پذیر رہیں وہیں ان کی شادی ہوئی۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز بارہ سال کی عمر میں کیا اور اپنا پہلا مختصر افسانہ ''لاوارث لاش'' لکھا اُنھوں نے اپنے افسانے اہم ترین ادبی رسالے میں چھپوانے کے لیے کڑی محنت کی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چرکے'' منظر عام پر آیا دوسرا مجموعہ ''ہائے اللہ'' کے نام سے شایع ہوا پھر دوسرے دور میں ''چوری چھپے''، ''اندھیرے اُجالے'' اور ''تیسری منزل'' شایع ہوا اور بعد میں اسی دور میں چوتھا مجموعہ ''چاند کے دوسری طرف'' بھی چھپا۔ ہاجرہ مسرور ترقی پسندوں سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں اُن کی آواز میں جہاں عام لوگوں سے ہمدردی کی فضا ہے وہاں استحصال کے خلاف بغاوت کی لے بھی نمایاں ہے لہٰذا اُن کے افسانے عوام دوستی اور انسانی دوستی کی مثالیں پیش کرتے ہیں ان کے افسانوی مجموعے ''ہائے اللہ'' اور ''اندھیرے اجالے'' اس امر کے گواہ ہیں۔ اُن کے افسانوں کا کلیات ''سب افسانے میرے'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ہاجرہ کو مجلس فروغ اُردو دوحہ (قطر) کی جانب سے عالمی اُردو ایوارڈ دیا گیا۔ ان کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بہ طور بہترین مصنفہ سے نوازا گیا۔ ان کو فلمی دنیا کے ''نگار ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ آپ نے 15 ستمبر 2012ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تصانیف: چرکے۔ ہائے اللہ۔ چوری چھپے۔ اندھیرے اجالے۔ تیسری منزل۔ چاند کے دوسری طرف۔ وہ لوگ۔ سب افسانے میرے۔

نمونہ کلام: ''وہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے اپنی دھنسی ہوئی سفید سفید آنکھیں ادھر ادھر گھما گھما کر منھی کو دیکھنا چاہتیں اور جب وہ نظر نہ آتی تو اپنا پوپلا منہ پھاڑ کر چلا اٹھتیں ''ہائے اللہ! جانے کہاں مر گئی۔'' (ہائے اللہ)

تحریر: عاشیہ ندیم

مصطفیٰ زیدی
1930ء تا 1970ء

سید مصطفیٰ حسین زیدی 10 اکتوبر 1930ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک الہ آباد سے پڑھے۔ 1951ء میں پاکستان آ گئے اور اگلے ہی سال گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا، کچھ عرصہ اسلامیہ کالج پشاور اور کراچی یونی ورسٹی میں لیکچرر رہے۔ 1954ء میں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر سرکاری آفیسر ہو گئے اور مختلف عہدوں پر کام کیا۔ 1969ء میں سیکرٹری بنیادی جمہوریت تھے۔ جب یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا تو کئی دیگر سینئر افسروں کے ساتھ کام کیا۔ 1970ء میں وہ ملازمت سے نکال دیے گئے۔ پہلے تیغ الہ آبادی تخلص تھا اور اسی نام سے ان کا مجموعہ ''روشنی'' شایع ہوا۔ مصطفیٰ زیدی نے شاعری شروع کی تو وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ جوش اور فراق گورکھپوری کے مداح ہونے کے ساتھ ساتھ بعض دیگر ترقی پسند شعرا کے دوست اور ہم نشیں تھے اس لیے چند سال ان کے ہاں ترقی پسند شاعری کے عام موضوعات کو نظم کرنے کا رجحان غالب رہا۔ چناں چہ طبقاتی کشمکش، غلامی کے خلاف جدوجہد اور انقلاب لانے کا جذبہ ان کی ابتدائی شاعری میں چھلکتا ہے۔ اُنھوں نے اصناف اور بحور کے تجربات بھی کیے اور مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مختلف کلاسیکی مسمط ہیئتوں اور انگریزی سٹینزا سے بھی اُنھیں لگاؤ تھا۔ ہیئتوں کے امتزاج سے نئی ہیئتیں بنانا بھی اُنھیں مرغوب ہے۔ ڈرامائی اور مکالماتی نظموں اور آزاد نظم کی ہیئت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے ہاں بحروں کا تنوع بھی متاثر کن ہے اور ایک نظم میں حسب ضرورت کئی بحریں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ کلاسیکی اسلوب پر قادر ہونے کے باوجود اچھوت لفظوں کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں۔ اُن کی وفات 12 اکتوبر 1970ء کو کراچی میں ہوئی۔

تصانیف: زنجیریں۔ روشنی۔ قبائے ساز۔ کوہ ندا۔ کلیات مصطفیٰ زیدی۔ موج مری صدف صدف۔ شہر آذر۔ گریباں۔

نمونہ کلام:

انھی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ　　میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

جس دن سے اپنا طرز فقیرانہ چھٹ گیا　　شاہی تو مل گئی دل شاہانہ چھٹ گیا

تحریر: فاطمہ یعقوب

احمد فراز
1931ء تا 2008ء

احمد فراز 12 جنوری 1931 کو کوہاٹ کے ایک سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام سید احمد شاہ تھا۔ اُن کے والد شاعر تھے اور "برق کوہائی" کہلاتے تھے۔ پہلے نام احمد شاہ کوہائی ہوتا تھا جو بعد میں فیض کے مشورے سے احمد فراز ہو گیا اور اسی سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے پشاور کے ایڈورڈ کالج سے ایم اے فارسی اور ایم اے اُردو کیا۔ آپ نے زمانہ تعلیم سے ہی شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ فراز ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض سے بے حد متاثر تھے لیکن آپ نے جلد ہی شاعری میں اپنا مخصوص رنگ تلاش کر لیا۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے سکرپٹ رائٹر کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا لیکن بعد میں آپ پشاور یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1974ء میں جب حکومت پاکستان نے اکادمی اُدبیات کے نام سے ملک کا اعلاترین اَدبی ادارہ قایم کیا تو فراز اس کے پہلے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ فوجی آمریت کے دور میں اُنھیں جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ وہ چیئرمین اکادمی اَدبیات پاکستان، لوک ورثہ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ بھی رہے۔ آپ نے کئی ممالک کے دورے کیے۔ آپ کا کلام علی گڑھ اور پشاور یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ 1966ء میں احمد فراز کو آدم جی ایوارڈ اور 1990ء میں اباسین ایوارڈ دیا گیا۔ 1988ء میں آپ کو بھارت میں فراق گورکھ پوری ایوارڈ اور 1992ء میں ٹاٹا ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پرویز مشرف کے دورِ صدارت میں آپ کو ہلال امتیاز دیا گیا لیکن دو برس کے بعد آپ نے سرکاری پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا۔ اُنھوں نے 25 اگست 2008ء کو وفات پائی۔

تصانیف: تنہا تنہا۔ بے آواز گلی کوچوں میں۔ دردِ آشوب۔ پس اندازِ موسم۔ نایافت۔ شب خون۔ جاناں جاناں۔ بودلک۔ غزل بہانہ کروں۔ سب آوازیں میری ہیں۔ خواب گل پریشاں ہے۔ میرے خواب ریزہ ریزہ۔ نابینا شہر میں آئینہ۔ اے عشق جفا پیشہ۔

نمونہ کلام:

اتنا سناٹا ہے کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

تحریر: اقرا اقبال

گوپی چند نارنگ
پیدائش: 1931ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ 11 فروری 1931ء کو ڈکی، ضلع لورالائی بلوچستان میں پیدا ہوئے اور 1947ء میں پاکستان سے ہجرت کر کے ضلع روہتک ہندستان منتقل ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے فورٹ سنڈے من، ہرنائی، موسیٰ خیل، لیہ، مظفر گڑھ سے حاصل کی۔ ایم اے اُردو 1954ء میں اور پی ایچ ڈی 1958ء میں دلی یونی ورسٹی سے کی۔ 1966ء میں سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس انڈیانا یونی ورسٹی، امریکہ سے مکمل کیا۔ آپ محقق، نقاد، نظریہ ساز دانشور، ماہر لسانیات، میر شناس، غالب شناس، انیس شناس، اقبال شناس، فیض شناس، فراق شناس، ماہر سمعیات و اسلوبیات، قابل قدر استاد، بہترین خطیب، افسانہ نگار اور ایک اعلا منتظم کار ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو نو مختلف زبانوں اُردو، ہندی، فارسی، انگریزی، پنجابی، سرائیکی، پشتو، بلوچی اور سنسکرت پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اُنھیں "سفیرِ اُردو" کا خطاب بھی دیا گیا۔ آپ کو صدر پاکستان کی جانب سے اقبال صدی طلائی تمغہ امتیاز اور ستارۂ امتیاز سمیت سینتالیس ملکی و بیرونی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔

تصانیف: اُردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات۔ ہندستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں۔ اَدبی تنقید اور اسلوبیات۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام۔ فکشن شعریات تشکیل و تنقید۔ غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات۔ ہندستان کے اُردو مصنفین اور شعرا۔ ہندستان کی تحریک آزادی اور اُردو شاعری۔ جدیدیت کے بعد۔ کاغذ آتش زدہ۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ۔ نئی کرن۔ نئی روشنی۔ پڑھو اور بڑھو۔ پرانوں کی کہانیاں۔ قاری اساس تنقید۔ سفر آشنا۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ تپش نامہ تمنا۔ ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت۔ اُردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب۔ اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو۔ اُردو زبان اور لسانیات۔ اسلوبیات میر

نمونہ کلام: "سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد سے قدیم اُردو کا رنگ تبدیل ہونے لگا تو منظوم قصے کہانیوں کا بھی پہلے سا ذوق شوق نہ رہا۔ رفتہ رفتہ ان کی جگہ ناول اور افسانے نے لے لی۔ پھر بھی موجودہ دور میں اتنی مثنویاں لکھی گئیں۔" (ہندستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں)

تحریر: آمنہ رشید

عبداللہ حسین
1931ء تا 2015ء

عبداللہ حسین 14 اگست 1931ء کو راول پنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد خان تھا۔ عبداللہ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ نو برس کی عمر میں عبداللہ حسین کی مذہبی تعلیم شروع کی۔ اُنھوں نے پرائمری کی تعلیم سناتن دھرم سکول میں حاصل کی اور 1946ء میں گجرات کے اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1952ء میں اُنھوں نے زمیندار کالج، گجرات سے بی ایس سی کی۔ عبداللہ حسین جب تعلیمی مراحل میں تھے اور گریجویشن کے لیے کالج میں گئے تھے تو وہاں انگریزی زبان سے ہی زیادہ واسطہ پڑتا تھا چاہے وہ تاریخ ہو، جغرافیہ ہو یا اکنامکس۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ان کو اس زبان پر دسترس حاصل ہو گئی۔ عبداللہ حسین کی شادی ڈاکٹر فرحت آرا سے 1963ء میں ہوئی، جن سے ایک بیٹا علی خان اور ایک بیٹی نور فاطمہ ہیں۔ عبداللہ حسین نے جب اپنے لیے کوئی قلمی نام اختیار کرنا چاہا تو اُنھیں خود اپنا نام محمد خان پسند نہیں آیا صرف اس لیے کہ کرنل محمد خان وہاں پہلے سے وہاں موجود تھے۔ اُنھیں سیمنٹ فیکٹری کے ہم منصب ''طاہر عبداللہ حسین'' کا نام اچھا لگا اور اُنھوں نے ''عبداللہ حسین'' بہ طور قلمی نام اختیار کر لیا۔ اُنھوں نے اپنی اَدبی زندگی کی شروعات کہانی لکھنے سے کی اور باقاعدہ اشاعتی سلسلہ 1962ء میں رسالہ ''سویرا'' لاہور میں شائع ہونے والی کہانی ''ندی'' سے ہوا۔ عبداللہ حسین کو ان کے کلاسیک ناول ''اداس نسلیں'' پر آدم جی اَدبی انعام ملا۔ اکادمی اَدبیات نے آپ کو کمال فن اَدب انعام دیا۔ عبداللہ حسین 84 سال کی عمر میں 4 جولائی 2015ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: اداس نسلیں۔ باگھ۔ نادار لوگ۔ قید۔ رات۔ نشیب۔ فریب۔ ندی۔ سات رنگ۔ واپسی کا سفر۔ The Afghan Girl ۔ Emigre Journeys

نمونہ کلام: ''گاؤں کے وسط میں بڑی سی پکی حویلی تھی جس میں روشن آغا کئی برس تک رہے تھے۔ اس کے گرداگرد پچاس پچاس گز تک جگہ خالی پڑی تھی جہاں کسی وقت میں بڑا خوب صورت باغیچہ ہوگا لیکن اب محض خشک پودے اور ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے کہ حویلی مدت سے خالی پڑی تھی۔'' (اداس نسلیں)

تحریر: نادیہ الیاس

جون ایلیا
1931ء تا 2002ء
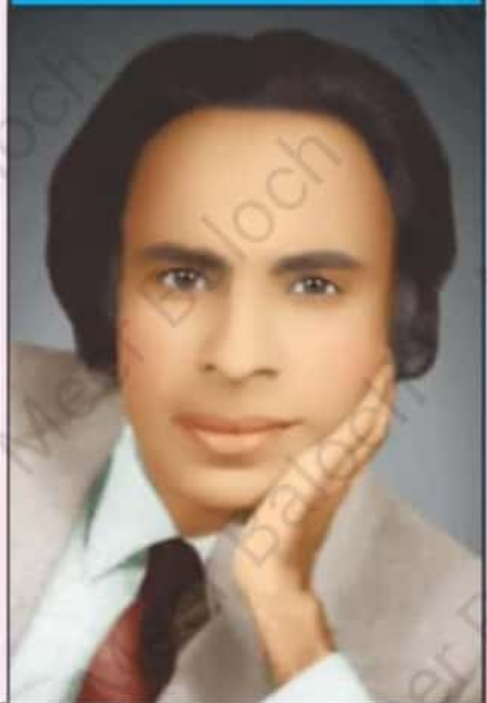
جون ایلیا 14 دسمبر 1931ء کو امروہہ کے ایک علمی اور اَدبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بھائی رئیس امروہوی بھی نمایاں شاعر تھے اور اُنھوں نے جنگ اخبار میں روزانہ قطعہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ جون کے ایک اور بھائی سید محمد تقی تھے جو نامور صحافی گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ جون کے بھانجے صادقین تھے، جو ممتاز مصور اور خطاط ہونے کے ساتھ رباعی کے عمدہ شاعر بھی تھے۔ جون ایلیا کو اقدار شکن، نراجی اور باغی کہا جاتا ہے۔ ان کا حلیہ، طرزِ زندگی، حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی، اور زندگی سے لاابالی رویے سے بھی اس کی غمازی ہوتی تھی لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اس طرزِ زندگی کو اپنے فن کی شکل میں ایسے پیش کیا کہ شخص اور شاعر مل گئے اور اس سخن میں وہ یوں ڈھلے کہ جیسا باغیانہ رویہ اُنھوں نے دنیا سے اپنایا تھا وہ محبوب سے بھی اختیار کر لیا۔ یہ روایتی غزل کے شاعر کا مفعولی، شکست خوردہ لہجہ نہیں ہے۔ یہ وہ عاشق نہیں ہے جو محبوب کے سامنے بچھ بچھ جاتا ہے اور اس کے ایک اشارے پر دل، کلیجہ اور جگر نکال کر سامنے دھر دیتا ہے۔ بل کہ اسے محبوب سے 'دھول دھپا' کرنے کے لیے 'عذرِ مستی' کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ محبوب کے ساتھ ان کا بے باکانہ رویہ بے حد نرالا ہے۔ یہ بے باکی بعض اوقات جارحیت تک میں بدل جاتی ہے۔ جون نے جو بے تکلفانہ اور لاگ لپٹ سے پاک انداز محبوب سے اپنا رکھا تھا، وہ دوسرے موضوعات کو بھی اسی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ جون نے اپنی زندگی بے حد بے پروائی سے گزاری۔ شاید اسی لیے اُنھوں نے مجرمانہ حد تک اپنی شاعری کی نشر و اشاعت سے پہلوتہی کی۔ لیکن اس کے باوجود دنیا ان کی پروا کرنے پر مجبور ہے اس لیے آج اُنھیں رزقِ خاک بنے ہوئے کئی برس گزر گئے لیکن اُردو دنیا ان کی یاد کو اب بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہ 8 نومبر 2002ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: شاید۔ یعنی۔ گمان۔ لیکن۔ گویا۔ فرنود۔

نمونہ کلام:

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

تحریر: صائقہ عطا

تنویر سپرا
1932ء تا 1993ء
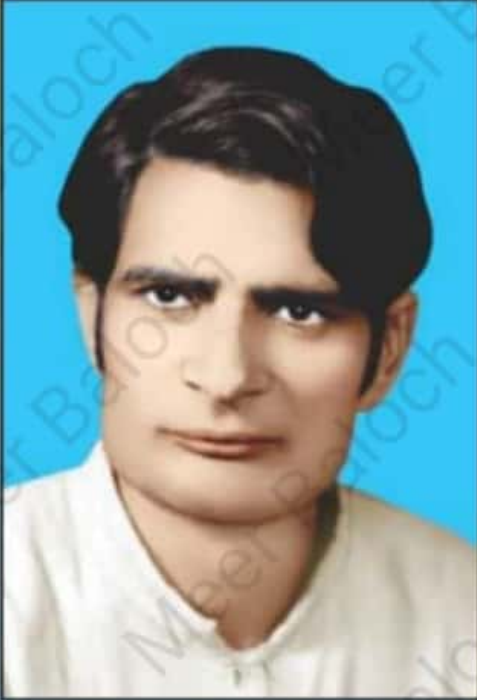
تنویر سپرا 1932ء میں جہلم میں پیدا ہوئے۔ اصل نام محمد حیات تھا۔ وہ ایک مزدور گھرانے میں پیدا ہوئے، غربت اور تنگ دستی کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور لڑکپن ہی میں مزدوری کے لیے کراچی چلے گئے۔ وہاں بحری جہازوں میں رنگ وروغن کا کام کیا، کچھ عرصہ درزیوں کا کام کرتے رہے۔ جہلم واپس آ کر دکان داری کی، لاہور میں کچھ عرصہ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ محنت مزدوری کرتے ہوئے لڑکپن سے جوانی میں داخل ہوئے۔ وہ پاکستان ٹوبیکو کمپنی جہلم میں بھی کام کرتے رہے۔ محنت مشقت کے ساتھ غیر رسمی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور ذاتی مطالعے اور لگن کی بدولت ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ شاعری کا آغاز 1963ء میں کیا۔ ''فنون'' میں چھپنے کے بعد ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ ان کا مجموعہ کلام "لفظ کھردرے" 1980ء میں منظر عام پر آیا۔ 1988ء میں انھیں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی طرف سے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کا عوامی ادبی جمہوری انعام ملا۔ عام طور پر شاعری کو نرم و نازک اور لطیف الفاظ کا حامل سمجھا جاتا ہے لیکن تنویر سپرا نے گل وبلبل، چاند، سورج اور شفق کو استعاراتی زبان استعمال کرنے کے بہ جائے الفاظ کو ہتھوڑے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تنویر سپرا ایک متحرک انقلابی، ترقی پسند، عوام دوست اور مزاحمتی شاعر تھے۔ تنویر سپرا نے شاعری کی روش میں ایک واضح انحراف کیا اور مشینوں، شفٹوں، لوہے، ہتھوڑے، اوور ٹائم، سگریٹ، سیٹھ، نظام زر اور منڈی اور اسی قبیل کے الفاظ و تراکیب استعمال کیے۔ اُن کی شاعری جدید حیات اور نئے مسائل سے عبارت اور محنت کش کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری آج بھی محنت کشوں میں مقبول ہے۔ اُنھوں نے 13 دسمبر 1993ء کو اسلام آباد میں وفات پائی اور جہلم میں مدفون ہیں۔

تصنیف: لفظ کھردرے۔

نمونہ کلام:

اظہار کا دباؤ بڑا ہی شدید تھا	الفاظ روکتے ہی مرے ہونٹ پھٹ گئے
کتنا بعد ہے میرے فن اور پیشے کے مابین	باہر دانش ور کہلاؤں مل میں آئل مین

تحریر: فائزہ

ظفر اقبال
پیدائش: 1932ء
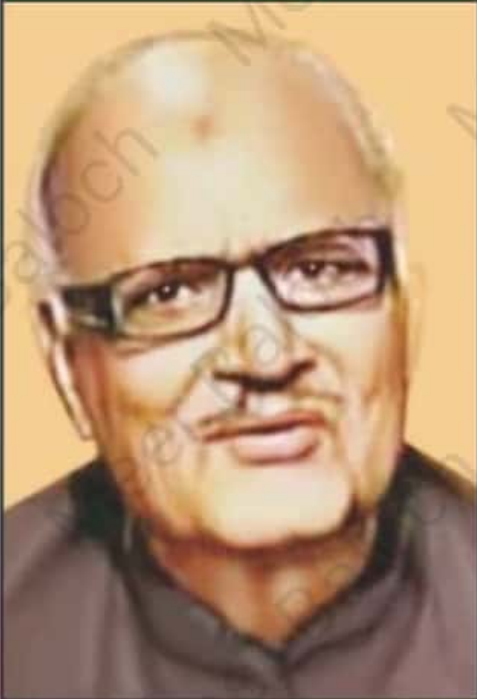
ظفر اقبال 27 ستمبر 1932ء کو بہاول نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضلع اوکاڑہ کے ایک معزز زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم اوکاڑہ میں ہی حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایل ایل بی کا امتحان لا کالج، جامعہ پنجاب سے پاس کیا اور اوکاڑہ میں وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُنھوں نے اوکاڑہ کچہری میں پریکٹس بھی کی اور پریس کلب اوکاڑہ کے صدر بھی رہے۔ ظفر اقبال نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ 1977ء کے انتخابات میں حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ظفر اقبال معاصر جدید اُردو غزل کے اہم ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ ان کے استاد نور احمد انجم قریشی بھی شاعر تھے۔ ظفر اقبال شاعری کے علاوہ کالم بھی لکھتے ہیں۔ شفیق الرحمن کی تحریروں سے ان کے اندر لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اُنھوں نے پہلا کالم سرور سکھیرا کے پرچے ''دھنک'' کے لیے لکھا۔ بہت سے اخبارات میں ''دال دلیا'' کے نام سے شائع ہونے والے ان کے کالم ہیں جن کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور بہت پذیرائی ملی۔ ظفر اقبال 1995ء سے 1997ء تک اُردو سائنس بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔ ظفر اقبال کا پہلا مجموعہ ''آب رواں'' ہے جسے بہت پذیرائی ملی۔ ظفر اقبال ممتاز ترین جدید شاعروں میں معروف رجحان ساز شاعر ہیں۔ حکومت پاکستان نے ظفر اقبال کو ان کی خدمات پر ''صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی'' سے بھی نوازا ہے۔ ظفر جدید اُردو شاعری کا بڑا نام ہیں۔ جدید اُردو شاعری پر جب بھی بات کی جائے گی ظفر اقبال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ غزل کے پیرائے میں فنی اور موضوعاتی سطح پر اپنی الگ پہچان بنائے ہوئے ہیں۔

تصانیف: آب رواں۔ گلافتاب۔ سر عام۔ تساہل۔ اطراف۔ تفاوت۔ رطب و یابس۔ غبار آلود سمتوں کا سراغ۔ نوادر۔ وہم و گمان۔ تجاوز۔ ہرے ہنیرے۔ عیب و ہنر۔ خشت زعفران۔ اب تک (کلیات)۔

نمونہ کلام:

خامشی اچھی نہیں، انکار ہونا چاہیے	اور یہ تماشا اب سر بازار ہونا چاہیے
کچھ اور ابھی ناز اٹھانے ہیں تمھارے	دنیا یہ تمھاری ہے زمانے ہیں تمھارے

تحریر: ماہا راشد

احمد مشتاق
پیدائش: 1933ء

احمد مشتاق نے یکم مارچ 1933ء کو امرت سر میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا۔ وہ چارٹرڈ بینک لاہور سے وابستہ رہے۔ ان کا منفرد نو کلاسیکی آہنگ قابل رشک ہے۔ وہ اپنے قلم سے ماضی کی خوش گوار اور تلخ یادوں کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے تخیل کا دائرہ محدودیت کی دیوار کو پھلانگ کر لامحدودیت کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ میر کی طرح ان کے ہاں عشق اور عاشق مہذب نظر آتے ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ ان کی غزل میں محبت کی معاملات دل چسپ اور خوش گوار ادبی ماحول کو جنم دیتے ہیں۔ احمد مشتاق کی ذات اور شاعری دونوں سے آہستہ روی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک خیال کی تربیت میں کافی وقت لیتے ہیں اور تب جا کر اسے الفاظ کا لباس دیتے ہیں۔ وہ جذبے کی نوعیت کے مطابق الفاظ و تراکیب کو قلم سے نکلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ احمد مشتاق کی موسموں سے رفاقت ہے۔ وہ پھولوں، رنگوں، بہاروں، بادلوں اور پرندوں کی مدد سے اپنے محبوب کی صورت بناتے ہیں لیکن کہیں بھی رنگ کا تناسب بڑھنے نہیں پاتا بلکہ توازن قایم رہتا ہے۔ انھوں نے محبت میں اعتدال کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ وہ پاکستان کے معروف اور جدید شعرا میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں اور اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے اردو تراجم کے ذریعے بھی اردو ادب کے ذخیرے کو وسعت عطا کی۔ وہ مستقل طور پر امریکہ میں سکونت پذیر ہیں لیکن دیس کو بھی دل میں زندہ رکھا ہوا ہے۔

تصانیف: مجموعہ۔ گردمہتاب۔ کلیات۔ نیا کلام۔ آنکھیں پرانی ہو گئیں۔ اوراق خزانی۔ ہجر کی رات کا ستارہ (ناصر کاظمی کے بارے میں)۔ سویرا (رسالہ)۔ اندھے لوگ (ناول "بلائنڈنیس" کا ترجمہ)۔ بنجر میدان (ہوان رولفو کے ناول "پیدرو پارامو" کا ترجمہ)۔ کلیات احمد مشتاق۔

نمونہ کلام:

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے — وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے — نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

تحریر: ابدال رضا

ضیا محی الدین
پیدائش: 1933ء

ضیا محی الدین نے 20 جون 1933ء کو لائل پور (فیصل آباد) میں آنکھ کھولی۔ اُن کے والد خادم محی الدین کا تعلق علمی و تدریسی شعبے اور فلموں سے تھا۔ ضیا محی الدین نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے گریجوایشن کیا اور مزید تعلیم کے لیے آسٹریلیا چلے گئے۔ فن و آرٹ کی جستجو میں اُنھوں نے برطانیہ کا رخ کیا جہاں وہ "رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ" سے منسلک ہوئے۔ یہیں سے اُنھوں نے صداکاری و اداکاری کی تربیت حاصل کی۔ اس دوران وہ کچھ عرصہ پاکستان آ گئے اور ریڈیو پر صداکاری کا جادو جگانے کے ساتھ ساتھ ریڈیو ڈراموں میں اداکاری کی۔ بعد ازاں دوبارہ برطانیہ چلے گئے اور ہدایت کاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ 1960ء میں ای ایم فوسٹر کے ناول "اے پیسج ٹو انڈیا" کو رائل اکیڈمی برطانیہ میں سٹیج پر پیش کیا۔ ضیا محی الدین نے ہالی وڈ فلموں میں بھی یادگار کردار ادا کیے۔ برطانیہ میں اُنھوں نے کئی ڈراموں میں بے مثال کارکردگی سے شائقین کے دل موہ لیے۔ وہ پاکستان میں سٹیج اور فلم کی ترقی کی خاطر 1970ء میں وطن واپس آ گئے۔ پی ٹی وی پر اُنھوں نے "ضیا محی الدین شو" کے نام سے ایک سٹیج پروگرام کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے پاکستانی فلموں میں بھی کام کیا۔ پی ٹی وی سے اُنھوں نے "پائل"، "چچا چھکن"، "ضیا کے ساتھ" اور "جو جانے وہ جیتے" کے نام سے پروگرام کیے۔ ضیا محی الدین کی آواز ہی ان کی اصل شناخت ہے، اُنھیں اُردو کے بہترین تلفظ اور ادائیگی کے حوالے سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اُردو اَدب کے لازوال فن پاروں کو اس انداز و لہجے سے پیش کیا کہ دنیا کو اُردو زبان سے عشق ہو گیا۔ اَدبی تحریروں کی قرات کے فن کو اُنھوں نے نقطۂ کمال عطا کیا۔ وہ اُردو اَدب کے علاوہ انگریزی اَدب کو بھی شان دار طریقے سے پڑھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اُنھیں انگریزی و اُردو زبان کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے فن کی کئی جہتیں متعارف کرائیں۔ وہ اعلا درجے کے مرثیہ خواں بھی ہیں۔ اُنھیں "ہلالِ امتیاز" ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ایک اداکار، پروڈیوسر، ہدایت کار اور نشریاتی مقرر ہیں۔ 2004ء میں اُنھیں کراچی میں "نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس (ناپا)" کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔

تحریر: ابدال رضا

سلیم اختر
1934ء تا 2018ء

ڈاکٹر سلیم اختر نے 11 مارچ 1934ء کو لاہور میں جنم لیا۔ 1951ء میں میٹرک اور 1955ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ''سرٹیفکیٹ ان لائبریری سائنس'' حاصل کر کے پہلے پنجاب یونی ورسٹی اور پھر پنجاب پبلک لائبریری میں تعینات رہے۔ ایم اے اُردو کرنے کے بعد ایمرسن کالج ملتان میں بطور اُردو لیکچرار کیریئر کا آغاز ہوا۔ جی سی یو اور یونی ورسٹی آف ایجوکیشن میں بھی پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی مخصوص شناخت ''نفسیات'' ہے۔ ان کی تنقید، افسانہ نگاری کے بارے میں ایک درجن سے زائد تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید اساطیری اور تاریخی ہے اور اُنھوں نے خاص طور پر ژونگ کے نفسیاتی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تنقید میں نئی راہ نکالی ہے۔ اُن کا سب سے بڑا معرکہ ''اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ'' ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر خود کو ہمیشہ نقاد سمجھتے تھے نہ کہ محقق یا اَدبی مورخ۔ بھارت میں ڈاکٹر جلیل اشرف نے ''اُردو تنقید کے فروغ میں سلیم اختر کا حصہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر کے رانچی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ادب اور لاشعور میں زیادہ تر بنیادی مسائل سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر 30 دسمبر 2018ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: نرگس اور کیکٹس۔ کڑوے بادام۔ آدھی رات کی مخلوق۔ مٹھی بھر سانپ۔ کاٹھ کی عورتیں۔ چالیس منٹ کی عورت۔ ضبط کی دیوار۔ نشان جگر سوختہ۔ شادی جنس اور جذبات۔ ہماری جنسی اور جذباتی زندگی۔ عورت جنس اور جذبات۔ تین بڑے نفسیات دان۔ اک جہاں سب سے الگ۔ عجب سیر کی۔ اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ۔ نظر اور نظریہ۔ کلام نرم و نازک۔ اَدب اور کلچر۔ اَدب اور لاشعور۔ امراؤ جان ادا کا تجزیاتی مطالعہ۔ نفسیاتی تنقید۔ افسانہ حقیقت سے علامت تک۔ شرح ارمغان حجاز۔ نگاہ اور نقطے۔ مغرب میں نفسیاتی تنقید۔ اُردو زبان کیا ہے؟ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ۔ مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر۔

نمونہ کلام: ''نفسیاتی تنقید میں شاعر کی شخصیت کو جو اہمیت دی جاتی ہے وہ اتنی واضح ہے کہ اسے بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' (نفسیاتی تنقید)

تحریر: مقدس بی بی

نثار احمد فاروقی
1934ء تا 2004ء

نثار احمد فاروقی 29 جون 1934ء کو اتر پردیش کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا شجرہ 41 ویں پشت میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق سے جا ملتا تھا۔ اسی طرح 22 ویں پشت سے حضرت بابا فرید گنج شکر سے بھی جا ملتا ہے۔ فاروقی نے اپنے نانا اور ماموں سے عربی، فارسی، اُردو اور اسلامی تعلیمات گھر پر ہی سیکھیں۔ وہ پھر حیدر آباد دکن گئے، پھر علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ چند مہینے جامعہ علی گڑھ میں اُردو کی تعلیم بھی حاصل کی۔ عربی میں ایم اے کیا پی ایچ ڈی کی۔ جامعہ دہلی میں جدید عربی کی تدریس کے لیے فائز کیے گئے۔ پھر عربی شعبہ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ان کو فارسی اور عربی زبان کی خدمات کے لیے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ پنجابی، انگریزی، ہندی، اُردو زبانوں میں بھی ماہر مانے جاتے ہیں۔ 1983ء میں جناب ذیل سنگھ صدر ہند کے ہاتھوں سند سے بھی نوازے گئے۔ نثار احمد فاروقی قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے تعاون اور اشتراک سے امروہہ میں، خطاطی پروگرام کے دو مراکز برائے مرد و خواتین الگ الگ قایم کیے اور ساتھ ساتھ ایک کمپیوٹر سینٹر بھی قایم کر کے اُردو روایات کو بحال رکھا۔ اُنھیں عالمی فروغ اُردو اَدب ایوارڈ، اُردو اکادمی دہلی ایوارڈ برائے تحقیق، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، قاضی عبدالودود ایوارڈ برائے تحقیق، نقوش ایوارڈ برائے تحقیق، میکش اکبر آبادی ایوارڈ اور افتخار میر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نثار احمد فاروقی کا انتقال 28 نومبر 2004ء کو نئی دہلی میں ہوا اور تدفین امروہہ میں ہوئی۔

تصانیف: تذکرہ حضرت خواجہ نظام الدین۔ تلاش غالب۔ تلاش میر۔ چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت۔ دراسات۔ دید و دریافت۔ صوفیائے کرام اور قومی یکجہتی۔ قرآن کریم کا اسلوب اور اعجاز۔ مقالات فاروقی۔ میر تقی میر۔ نقد ملفوظات۔ نوادر غالب۔

نمونہ کلام: ''آزاد اور فرحت اللہ بیگ میں خاکہ نگار ہونے کے اعتبار سے بہت سی خصوصیات مشترک ہیں مثلاً یہ کہ دونوں دہلی کی بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔ دونوں قدامت کی خوبیوں کے پرستار ہیں۔ دونوں کی تحریروں میں نکتہ آفرینی اور لطیف مزاج کا چٹخارا ہے۔'' (دید و دریافت)

تحریر: زنیرہ گلناز

شکیب جلالی

1934ء تا 1966ء

شکیب جلالی یکم اکتوبر 1934ء کو علی گڑھ کے ایک قصبے سیدانہ جلال میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ شکیب کے والد پولیس میں ملازم تھے، پہلے وہ قصبہ جلالی میں رہے اور بعد میں بدایوں آ گئے۔ وہ نو سال کے تھے جب ان کی والدہ نے ٹرین کی پٹڑی پر خودکشی کر لی جس سے شکیب کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کے والد بھی وفات پا گئے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ 1950ء میں پاکستان آ گئے۔ شکیب چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ والد کی وفات کے بعد راول پنڈی آ گئے۔ اخبارات کی ملازمت سے وابستہ رہے اور مختلف اَدبی ماہ ناموں کے مدیر بھی رہے۔ اُنھوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اُن کی شاعری آتش کدے کی بو محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب راول پنڈی سے لاہور آئے تو اُنھوں نے ایک رسالہ "جاوید" نکالا جو زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ سرکاری رسالے "مغربی پاکستان" سے بھی وابستہ رہے۔ ملازمت کے دوران جوہر آباد اور بھکر میں تعینات رہے۔ راول پنڈی میں اُنھوں نے اَدبی رسالہ "گونج" نکالا جس میں اُن کی مدد ماجد الباقری نے کی۔ شکیب چھوٹی عمر میں ہی غمِ روزگار کا شکار ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے بچپن سے ہی اَدیبانہ مزاج پایا۔ شکیب جلالی جدید اُردو غزل کے چند نام ور شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کی ڈوبتی سانسوں کو تازگی عطا کی۔ اُن کے چند ہم عصر شاعر ان کی مقبولیت اور شہرت سے حسد کرنے لگے اور دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ شکیب کی یہ آرزو تھی کہ ان کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شایع ہو لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اُن کی شاعری اپنے دور میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ شکیب تنقید اور خاکے لکھنا بھی جانتے تھے۔ نفسیاتی اور خارجی زندگی کے مسائل کے سبب اُنھوں نے 12 نومبر 1966ء کو سرگودھا میں ریل گاڑی کے سامنے کود کر خودکشی کر لی۔

تصانیف: روشنی اے روشنی۔ کلیات شکیب جلالی۔

نمونہ کلام:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں	آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح	دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

تحریر: اقرا اقبال

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

پیدایش: 1935ء

شمس الرحمٰن فاروقی 15 جنوری 1935ء کو پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ اور گورکھپور سے حاصل کی۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے انگریزی کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ اس پر آپ کو دو گولڈ میڈلز سے نوازا گیا۔ آپ اُردو، انگریزی، فارسی اور ہندی زبانیں جانتے ہیں۔ ستیش چند کالج بلیا اور شبلی کالج اعظم گڑھ میں بہ طور انگریزی لیکچرار پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد انڈین پوسٹل سروس کی ملازمت اختیار کی اور حکومت ہند کے پوسٹل سروسز بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ اُنھیں یوپی اُردو اکیڈمی ایوارڈ لکھنؤ برائے شاعری، آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ایوارڈ برائے خدمات ترقی اُردو، اتر پردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ برائے تنقید، دہلی اُردو اکیڈمی برائے تنقید، بھارتی فنکار سوسائٹی لکھنؤ، اعزاز میر، ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی ایوارڈ برائے اُردو اَدب اور یوپی اُردو اکیڈمی ایوارڈ لکھنؤ برائے شاعری سے نوازا گیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی رسالہ "شب خون" کے بانی اور مرتب ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اُردو اَدب کے مشہور نقاد اور محقق ہیں جنھوں نے تنقید نگاری سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اُنھوں نے ایک ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" بھی لکھا جسے عوام و خواص نے بہت سراہا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تنقید، شاعری، فکشن، لغت نگاری، داستان، عروض، ترجمہ یعنی اَدب کے ہر میدان میں تاریخی اہمیت کے کارنامے انجام دیے ہیں۔

تصانیف: گنج سوختہ۔ سبز اندر سبز۔ چار سمت کا دریا۔ لفظ و معنی۔ فاروقی کے تبصرے۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔ افسانے کی حمایت میں۔ عروض آہنگ اور بیان۔ تنقیدی افکار۔ اثبات و نفی۔ تفہیم غالب۔ انداز گفتگو کیا ہے۔ شعر شور انگیز۔ تعبیر کی تشریح۔ اُردو غزل کے اہم موڑ۔ کئی چاند تھے سرِ آسماں۔ آسمان محراب۔ سوار اور دوسرے افسانے۔

نمونہ کلام: "زبان کی مجبوریوں کے باعث راوی صرف دو طرح کے ہو سکتے ہیں، حاضر اور غائب۔ حاضر راوی والا افسانہ وہ ہے جس میں افسانہ بیان کرنے والا واحد حاضر (میں) یا جمع حاضر (ہم) کی شکل میں ہمارے سامنے آئے۔ غائب راوی والا افسانہ وہ ہے جس میں افسانہ محض بیان کر دیا جائے، اس کا راوی ہمارے سامنے نہ ہو بل کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص ہے۔" (افسانے کی حمایت میں)

تحریر: تبسم مجید

ڈاکٹر انور سجاد
1935ء تا 2019ء

سید محمد سجاد انور علی بخاری معروف بہ انور سجاد 27 مئی 1935ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں سے ایم بی بی ایس پاس کیا۔ ڈی ٹی ایم اینڈ ایچ کا امتحان انگلینڈ سے پاس کیا۔ ان کا پیشہ ڈاکٹری رہا لیکن افسانہ نگاری میں کافی نام کمایا۔ ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے اور ان میں بہ طور اداکار حصہ بھی لیا۔ اداکاروں اور فن کاروں کے حقوق و مفادات کے لیے آرٹسٹ ایکیوٹی کی بنیاد رکھی۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ برلن میں ڈرامے اور موسیقی کے میلے میں پاکستانی وفد میں رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہ لاہور آرٹس کونسل کے چیئرمین بھی منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ کراچی میں بھی قیام کیا۔ انور سجاد کی شخصیت پہلودار ہے۔ سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ جدید افسانے کا ایک معتبر نام ہیں۔ وہ اپنی شخصیت اور روح عصر کے اظہار کے لئے تمام شعبوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت کے تمام پہلو ان کی افسانہ نگاری میں کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوئے ہیں۔ انور سجاد کے افسانے روایتی اسلوب کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ مغربی اَدبیات سے متاثر ہوئے اور جدیدیت کے زیر اثر علامتی اور استعاراتی اسلوب اپنا لیا۔ انور سجاد نے اپنے عہد کے ہر قسم کے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور جنسی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ انور سجاد کو 1989ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ اُن کا انتقال 84 سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد 6 جون 2019ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: رگِ سنگ۔ استعارے۔ آج۔ پہلی کہانی۔ چوراہا۔ زرد کونپل۔ خوشیوں کا باغ۔ نگار خانہ۔ صبا اور سمندر۔ جنم روپ۔ نیلی نوٹ بک۔ رسی کی زنجیر۔ رات کا پچھلا پہر۔ رات کے مسافر۔ تلاش و جستجو۔ سورج کو ذرا دیکھ۔ مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد۔

نمونہ کلام: ''اس نے اپنی گردن کو اپنے ہاتھوں سے دبایا'' یونہی تم بہت ضدی ہو۔ سونا حاصل کرنے کی خواہش بظاہر تو عام ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے بڑھ کر عجیب خواہش اور کوئی نہیں۔'' اس نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی اپنی چادر اٹھالی۔'' (سونے کی تلاش)

تحریر: فریحہ شہزادی

صدیق سالک
1935ء تا 1988ء

محمد صدیق سالک 6 ستمبر 1935ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ تین سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد اُنھوں نے بہت مشکل سے تعلیم حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈی بی ہائی سکول میں عارضی طور پر معلم کی ملازمت کی اور اس سے حاصل ہونے والی آمدن سے 1955ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور وہاں سے انگریزی میں بی اے آنرز کیا۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں ایک ہفت روزہ ''پاک جمہوریت'' میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1964ء میں بہ طور کپتان فوج میں شامل ہوئے۔ 1970ء میں میجر کے عہدے پر ترقی پا کر ڈھاکہ چلے گئے پھر سانحہ مشرقی پاکستان ہوا۔ دو سال تک ہندستان کی قید میں رہے۔ اسیری کے ان سالوں میں اُنھوں نے ''ہمہ یاراں دوزخ'' کتاب لکھی۔ 1973ء میں رہائی کے بعد واپس آئے۔ 1977ء میں لیفٹیننٹ کرنل بنے۔ 1985ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے ڈائریکٹر بنے اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ معروف مزاح نگار کرنل محمد خان کے ساتھ لمبے عرصے تک انٹر سروسز پبلک ریلیشنز میں کام کیا۔ اپنے گاؤں سے بے حد محبت کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے گاؤں میں طالبات کے ہائی سکول کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اُن کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ اُن کے بیٹے سرمد سالک صحافت سے وابستہ ہیں۔ اُن کی دو بیٹیوں صحیفہ سالک اور صائمہ سالک نے ایم اے انگریزی کیا جب کہ چھوٹی بیٹی آئینہ سالک نے نفسیات میں ایم فل کیا۔ صدیق سالک ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ آگے بڑھنے کے لیے وسائل کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ 17 اگست 1988ء کو وہ سانحہ بہاولپور کے فضائی حادثے میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

تصانیف: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔ پریشر ککر۔ ہمہ یاراں دوزخ۔ سیلوٹ۔ تادمِ تحریر۔ ایمرجنسی۔

نمونہ کلام: ''میں جب بھلے وقتوں میں مشرقی پاکستان پہنچا تو وہاں کے حسنِ سادہ نے دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی متاثر کیا۔ وہاں سرمئی شام کو لان میں بیٹھتا تو ہولے ہولے چلنے والی بادِ نسیم ایک ہمدرد جلیس کی طرح سرگوشیاں کرتی۔'' (ہمہ یاراں دوزخ)

تحریر: وجیہہ سرور

مظہر محمود شیرانی
1935ء تا 2020ء
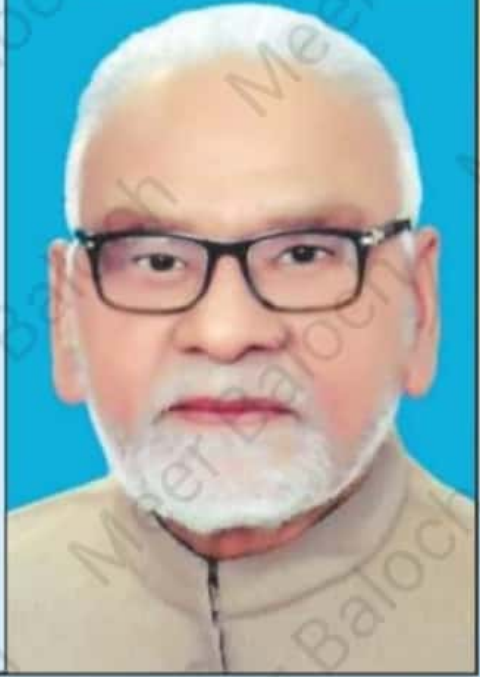
مظہر محمود شیرانی 19 اکتوبر 1935ء کو شیرانی آباد، ریاست جودھ پور میں پیدا ہوئے۔ اُردو کے مشہور اور معروف محقق حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور نامور شاعر اختر شیرانی کے بیٹے تھے۔ اُنھوں نے میٹرک شیخو پورہ، ایف۔ اے اور بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے تاریخ اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ 1960ء میں محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے اور مظفر گڑھ، شیخو پورہ اور لاہور میں پڑھاتے رہے۔ زیادہ عرصہ گورنمنٹ کالج شیخو پورہ میں تعینات رہے۔ 2003ء سے گورنمنٹ کالج لاہور سے بحیثیت ریسرچ سپر وائزر وابستہ ہوئے۔ 1987ء میں مظہر محمود نے ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر نگرانی اپنے دادا حافظ محمود شیرانی کی علمی اور اُدبی خدمات پر مقالہ لکھ کر اُردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کا یہ مقالہ ایک تحقیقی شاہ کار ہے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے دادا کے مقالات کو تلاش کر کے دس جلدوں میں مرتب کیا جسے مجلس ترقی اَدب لاہور نے شائع کیا۔ مظہر محمود شیرانی کو خاکہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ 2006ء میں ''بے نشانوں کا نشان'' کے عنوان سے ان کے خاکوں کی پہلی اور 2011ء میں'' کہاں سے لاؤں اُنھیں'' کے نام سے دوسری کتاب شائع ہوئی۔ اُن کے مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز اُدبی اور صحافتی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اُن کی مرتبہ کتب اس کے علاوہ جب کہ تحقیقی مقالات کی تعداد پچاس سے زائد ہیں۔ 2018ء میں اُنھیں عالمی مجلس فروغ اُردو، دوحہ، قطر کی جانب سے لائیو اچیومنٹ ایوارڈ ملا۔ وہ 12 جون 2020ء کو شیخو پورہ میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: کہاں گئے وہ لوگ۔ کہاں سے لاؤں اُنھیں۔ جانے کہاں بکھر گئے۔ بے نشانوں کا نشان۔ حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی واَدبی خدمات۔ مقالات حافظ محمود شیرانی۔

نمونہ کلام: ''مولانا نے بعض غزلوں کی بابت استاد ذوق کا یہ دعوا نقل کیا ہے کہ وہ نئے اوزان میں کہی گئی ہیں۔ اس معاملے میں اُنھیں سخت سہو ہوا ہے جس کا سبب مولانا کی عروضی معلومات کی خامی ہے۔''

تحریر: سعیدہ رشید

انور مسعود
پیدائش: 1935ء

انور مسعود 8 نومبر 1935ء کو پنجاب کے شہر گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے بعد آپ کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا۔ انور مسعود نے اپنی ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی لیکن بعد میں ان کا خاندان دوبارہ گجرات منتقل ہو گیا۔ اُنھوں نے دوبارہ گجرات کے پبلک سکول میں داخلہ لیا اور اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس کے بعد اُنھوں نے زمیندار کالج گجرات سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے کرنے کے بعد وہ واپس لاہور آ گئے۔ اور اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں اُنھوں نے فارسی میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور گولڈ میڈلسٹ رہے۔ ماسٹرز کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے بطور استاد اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس کے بعد مختلف کالجوں میں فارسی زبان و اَدب پڑھاتے رہے۔ انور مسعود نے مختلف زبانوں میں شاعری کی لیکن ان کی پنجابی شاعری کو زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری میں ہمیں معاشرتی زندگی اور پنجاب کی تہذیب نظر آتی ہے۔ اُن کی شاعری میں ہمیں سہل ممتنع اور شفافیت کا عنصر ملتا ہے۔ اُن کی شاعری عام لوگوں کے لیے ہے۔ کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی شاعری کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ انور مسعود اُردو اور پنجابی کے مایہ ناز ادیب ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف اُردو میں لکھا بلکہ پنجابی اور فارسی زبان میں بھی شاعری کی۔ لیکن ان کی شہرت کی وجہ ان کی پنجابی شاعری بنی۔ وہ معروف شاعر ہونے کے ساتھ مختلف زبانوں میں لکھ اور پڑھ بھی سکتے ہیں۔ پنجابی شاعری کے حوالے سے اُنھیں پاکستان کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تصانیف: اناركلی دیاں شاناں۔ دیوار گریہ۔ آج کی بات۔ شاخِ تبسم۔ جمعہ بازار۔ روز بروز۔ جہلم دے پل تے۔ بات سے بات۔ میلا اکھیاں دا۔ ہُن کی کریے۔ غنچہ پھر لگا کھلنے۔ اِک دریچہ۔ میلی میلی دھوپ۔ قطعہ کلامی۔ درپیش۔

نمونہ کلام:
اب جہاں اور کسی چیز کی جا رکھی ہے   دل میں اک تیری تمنا جو بسا رکھی ہے
اگلے دن کو کچھ ایسے ہوں گے   چھلکے پھلوں سے مہنگے ہوں گے

تحریر: [illegible]

رضا علی عابدی
پیدائش:1935ء
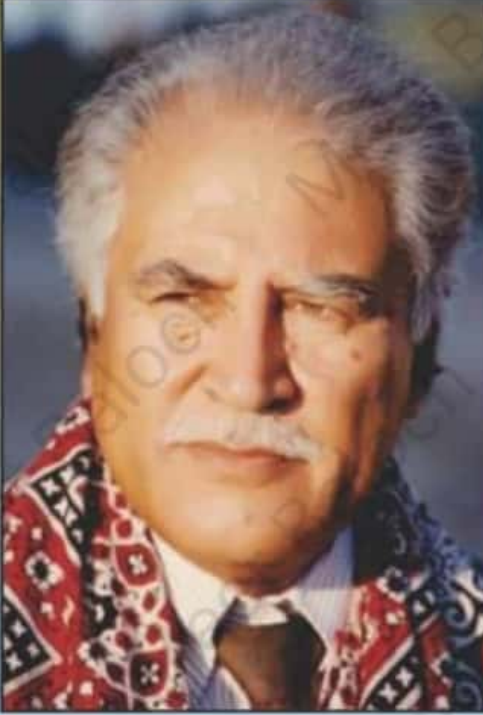
رضا علی عابدی 30 نومبر 1935ء کو روڑکی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یوپی سے حاصل کی، ان کے والد کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ 1950ء میں پاکستان آ گئے۔ تیرہ برس کی عمر میں اُنھوں نے اخبارات و جرائد کا باقاعدگی سے مطالعہ شروع کیا۔ اُنھوں نے بیس برس کی عمر میں پہلی مرتبہ انگریزی خبر کا ترجمہ کیا۔ اُنھوں نے 1965ء کی جنگ کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کو اخبار میں رپورٹ بھی کیا۔ اس وقت وہ عملی طور پر روزنامہ حریت کے ساتھ منسلک تھے۔ اس کے بعد انگلستان مزید تعلیم کے حصول کے لیے سکالرشپ پر چلے گئے۔ 1972ء میں بی بی سی سے منسلک ہوئے اور 1996ء تک کئی شان دار اور مقبول دستاویزی پروگرام کیے۔ رضا علی عابدی نے اب تک 30 سے زاید کتابیں لکھی ہیں جن میں 16 بڑوں اور 14 بچوں کے لیے ہیں۔ اُن کو اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی طرف سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ رضا علی عابدی پختہ فکر اور باشعور مصنف اور حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ یہ حساسیت ان کی تصانیف میں جابجا نظر آتی ہے۔ سفرنامہ لکھنے والوں کی معتبر روایت میں رضا علی عابدی کا نام بہت نمایاں ہے۔ آپ نے خوب صورت سفرنامے لکھے ان میں سے ہر سفرنامہ اس جگہ کی تاریخ، تہذیب رسم و رواج اور اخلاقیات کا باکمال اور بھرپور ترجمان ہے۔

تصانیف: جرنیلی سڑک۔ شیر دریا۔ جہازی بھائی۔ ریل کہانی۔ کتب خانہ۔ پہلا سفر۔ تیس سال بعد۔ بچوں کی کہانیاں۔ پہلا تارا۔ پہلی کرن۔ چمپکا۔ میری امی۔ پیاری امی۔ قاضی جی کا اچار۔ پہلی گنتی۔ بندر کی الف بے۔ چوری چوری چپکے چپکے۔ کمال کا آدمی۔ نٹ کھٹ لڑکا۔ اُردو کا حال۔ اپنی آواز۔ جان صاحب۔ حضرت علی کی تقریریں۔ جانے پہچانے۔ ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم۔ نغمہ گر۔ پہلا سفر۔ ریڈیو کے دن۔ اخبار کی راتیں۔ کتابیں اپنے آبا کی۔ تیس سال بعد۔ پرائے ٹھگ۔

نمونہ کلام: ”یہ سارا سفر طے کر کے میں کلکتہ پہنچا تو پشاور کی طرح وہ پتھر ڈھونڈنے چلا جو اس سڑک کا آخری پتھر رہا ہوگا۔ کسی نے بتایا کہ جی ٹی روڈ کا سرا کلکتے کے بوٹینیکل گارڈن کے صدر دروازے کے سامنے ہے۔“

تحریر: اسما بتول

مشفق خواجہ
1935ء تا 2005ء

مشفق خواجہ 19 دسمبر 1935ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام خواجہ عبدالحئی تھا۔ خواجہ صاحب کشمیری النسل تھے چھ سات نسلوں پہلے ان کے آبا و اجداد کشمیر سے لاہور آئے تھے اور یہیں اُنھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ صاحب کا گھرانہ علمی تھا خواجہ صاحب کی شادی 1964ء میں آمنہ صدیقی سے ہوئی۔ مشفق خواجہ کی ولادت لاہور میں ہوئی بچپن میں کراچی آ گئے علم و ادب کی روایت مشفق خواجہ کو ورثے میں ملی تھی۔ مشفق خواجہ کے تحقیقی مزاج کو مخطوطہ شناسی سے عبارت کیا جا سکتا ہے گم شدہ ادبی نوادرات کی تلاش ان کی ذہنی عبادت ہے۔ یہ دونوں عمل اُنھوں نے تذکرہ ”خوش معرکہ زیبا“ اور ”جائزہ مخطوطات اُردو“ اور ”غالب اور صفیر بلگرامی“ کی ترتیب و تدوین میں کامیابی سے آزمائے ہیں۔ خامہ بگوش ان کا قلمی نام تھا۔ وہ بہترین محقق تھے اور ساتھ ہی طنز نگار، کالم نویس اور نقاد بھی تھے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان سے وابستگی 1957ء تا 1973ء تک رہی۔ 1961ء تک اُنھیں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے نیز بہ حیثیت مدیر سہ ماہی ”اُردو“، مدیر ماہنامہ ”قومی زبان“، مدیر ”قاموس الکتب“، نگران شعبہ تحقیق و مطبوعات کی خدمات بھی انجام دیں۔ انہیں جدید تدوین نگاروں میں انتہائی اہم مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اخبارات و رسائل جن میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے کالم لکھے جن میں روزنامہ ”جسارت“ کراچی، ہفت روزہ ”زندگی“، روزنامہ ”صداقت“ اور ہفت روزہ ”تکبیر“ کراچی شامل ہیں۔ اُنھیں حکومت پاکستان نے 1994ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ وہ 21 فروری 2005ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔

تصانیف: پرانے شاعر نیا کلام۔ تحقیق نامہ۔ مرزا یگانہ: شخصیت اور فن۔ خامہ بگوش کے قلم سے۔ سخن در سخن۔ سخن ہائے ناگفتنی۔ سخن ہائے گسترانہ۔ خوش معرکہ زیبا۔ جائزہ مخطوطات اُردو۔ غالب اور صفیر بلگرامی۔ اقبال از مولوی احمد دین (مرتب)۔ خوناب۔ کلیات یگانہ۔

نمونہ کلام:
نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

تحریر: آمنہ عباس

افتخار جالب
1936ء تا 2003ء

افتخار جالب کا اصل نام افتخار احمد تھا۔ وہ 1936ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ افتخار جالب گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالے راوی کے مدیر بھی رہے ہیں۔ وہ ایک ٹریڈ یونین کے سرگرم رکن بھی رہے ہیں۔ ستر کی دہائی کے آخر میں بینکوں میں ہڑتال کرانے پر اُنھیں کچھ عرصے کے لیے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور بعد میں عدالت کے حکم سے نوکری پر بحال ہوئے۔ ساٹھ کی دہائی میں شاعری (نظم) اور اُردو زبان میں لسانی تشکیلات کی تحریک کے بانی شاعر اور نقاد تھے۔ اُنھوں نے ''نئی نظم'' کے عنوان سے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں ان کے علاوہ صفدر میر، اختر احسن، گوہر نوشاہی، عزیز الدین احمد، عبدالحق کھامی، ڈاکٹر سید عبداللہ، تبسم کاشمیری، الطاف قریشی، ظہیر کاشمیری، جیلانی کامران اور انیس ناگی کے مضامین شامل ہیں۔ افتخار جالب اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت، اپنے اخلاقی تصورات اور اپنے فکری مفروضوں کو حال کے لمحوں کی تبدیل شدہ صورت حال سے اخذ کرتے ہیں۔ اُن کی بنائی ہوئی منفرد زبان، صحافت کی بیانیہ زبان اور روایتی کلاسیکی اور رومانوی زبانوں سے مختلف ہے۔ جالب کی شاعری کی پہلی کتاب ''ماخذ'' ان کی شہرت کی وجہ بنی۔ اس میں ان کی طویل نظم ''قدیم بنجر'' شامل ہے جو عصری ماحول میں فرد اور معاشرے سے بحران کی تفتیش کرتی ہے۔ یہ نظم روایتی شاعری کے انداز سے ہٹ کر مصرعوں کی تشکیل کے ایک نئے انداز میں انسان کے وجود کا اظہار کرتی ہے۔ ماخذ کے بعد افتخار جالب کی شاعری میں تبدیلی آئی اور اُنھوں نے سیدھے سادے اسلوب میں منظم جذبات کی شاعری کی۔ افتخار جالب سے شاعروں کی پوری نسل متاثر تھی۔ اَدبی دنیا میں اَدبی کام سرانجام دینے کے بعد 12 مارچ 2003ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: ماخذ۔ نئی نظم۔

نمونہ کلام: میں خزاں میں گرفتار ہوں/ دیکھوں خوابیدہ موجوں، خریدار روحوں/ اُمڈتے سمٹتے زمانوں سے/ ارض وسما کی سیاہی کا دامن نچوڑا ہے/ لیکن ہواؤں کے وہم وگماں میں نہیں/ کون سی خاک سے/ قطرہ آب تابندہ موتی کی آغوش لیتا ہے (سائبان)

تحریر: ام فروا

زہرا نگاہ
پیدائش: 1936ء

زہرا نگاہ نے 14 مئی 1936ء کو حیدرآباد دکن میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام فاطمہ زہرا ہے۔ اُن کے والد قمر مقصود کا شمار بدایوں کے ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا۔ معروف ڈراما نویس فاطمہ ثریا بجیا آپ کی بڑی بہن اور اور ڈرامہ نگار، مصنف اور شاعر انور مقصود، بھائی ہیں۔ زہرا نگاہ کے خاندان نے معاش کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں قیام کیا اور قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی ہجرت کر آئیں۔ یہیں پر اُنھوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ اُنھیں بچپن سے ہی شعر واَدب کا ماحول میسر آیا جس کی وجہ سے ان کی طبیعت میں پڑھنے لکھنے کا شوق اوائل عمری سے ہی سرایت کر گیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن بعد میں نظم کی طرف اُن کے قلم کا رخ مڑ گیا۔ اُن کی خوب صورت آواز نے اُنھیں مشاعروں میں بھی پذیرائی دلوائی۔ اُنھوں نے محض گیارہ سال کی عمر میں ایک نظم ''گڑیا گڈے کی شادی'' لکھی۔ ابتدا میں اُنھوں نے جگر مرادآبادی سے اصلاح لی۔ زہرا نگاہ کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے جذباتی معاملات ہیں۔ اُن کی نظموں میں جدیدیت کے غیر شاعرانہ جذبات کی عکاسی کا دُور تک کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ وہ رومانیت کی شاعرانہ آرایش پسندی کی بھی قائل نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری میں مبالغہ آرائی بہت کم پائی جاتی ہے کیوں کہ وہ اس سے نظر چرانا مناسب فعل سمجھتی ہیں۔ وہ جب شعر کہتی ہیں تو روایتی اور آرایشی رنگ سے اجتناب کرنا نہیں بھولتیں جو ان کے اسلوب کا خاصا ہے۔ وہ نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال کرتی بھی نظر آتی ہیں جس سے ان کا فن نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اُن کے قلم سے سادہ الفاظ اور خیال جنم لیتے ہیں۔ اُنھیں علامہ اقبال ایوارڈ کے علاوہ حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا ہے۔

تصانیف: شام کا پہلا تارا۔ ورق۔ فراق۔ مجموعہ کلام (کلیات)۔

نمونہ کلام:

عورت کے خدا دو ہیں حقیقی ومجازی — پر اس کے لیے کوئی بھی اچھا نہیں ہوتا
شب بھر کا تراجاگنا اچھا نہیں زہرا — پھر دن کا کوئی کام بھی پورا نہیں ہوتا

تحریر: ابدال رضا

گلزار
پیدائش: 1936ء

گلزار 18 اگست 1936ء کو گاؤں دینہ ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام سمپورن سنگھ کالڑا ہے۔ سوتیلی ماں کے ناروا سلوک کی وجہ سے وہ زیادہ وقت اپنے والد کی دکان پر گزارا کرتے تھے۔ نصابی کتابوں سے ان کی نہیں بنتی تھی لیکن ادب سے ان کو لڑکپن سے ہی لگاؤ تھا۔ وہ انٹرمیڈیٹ میں فیل ہو گئے تھے۔ 1947ء میں ہجرت کر کے پہلے امرت سر اور بعد میں دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ تعلیم کے خرچ کے لیے ان کو ایک پٹرول پمپ اور موٹر گیراج پر ملازمت کرنا پڑی۔ پھر تقدیر ان کو ممبئی لے گئی۔ یہاں اُنھوں نے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت کا آغاز کیا جس کی وجہ سے اُنھوں نے بہت سے ادیبوں سے تعلقات پیدا کر لیے۔ اُن کا پہلا گانا فلم "بندنی" کے لیے "مورا گورا انگ لئی لے، موہے شیام رنگ دئی دے" تھا جو بہت مشہور ہوا۔ فلم ساز بمل رائے نے اُنھیں اپنا اسسٹنٹ بنا لیا۔ گلزار اپنے طویل فلمی سفر کے ساتھ ساتھ ادب کے میدان میں نئی نئی منزلیں طے کرتے رہے۔ نظم میں وہ ایک نئی صنف "تروینی" کے بنیاد گزاروں میں ہیں جو تین مصرعوں کی غیر مقفیٰ نظم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے نظم میں جدت کے گل کھلائے اور بچوں کی نظم و نثر کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ اُن کے فلمی گیت ماضی اور حال دونوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ اُنھیں 2004ء میں "پدما بھوشن" کا خطاب ملا۔ اُنھیں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی حیدر آباد نے 2012ء میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا جب کہ 2013ء میں اُنھیں ہندستانی سینما کا سب سے بڑا اعزاز "دادا صاحب پھالکے ایوارڈ" بھی دیا گیا۔ اُن کے گیتوں کے انگریزی تراجم کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ اُنھیں 2013ء میں آسام یونی ورسٹی کا چانسلر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ فلم ہدایت کار، منظر نویس، فلم ساز، شاعر، مصنف، غنائی شاعر اور نغمہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

تصانیف: چاند پکھراج کا۔ دستخط۔ پچھلے پنے۔ راوی پار۔ منظر نامہ آندھی۔ مرزا غالب ایک سوانحی منظر نامہ

نمونہ کلام:

جس کی آنکھوں میں کٹی تھیں صدیاں — اس نے صدیوں کی جدائی دی ہے
شام سے آنکھ میں نمی سی ہے — آج پھر آپ کی کمی سی ہے

تحریر: وجیہہ سرور

ساقی فاروقی
1936ء تا 2018ء

ساقی فاروقی 21 دسمبر 1936ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے ان کا اصل نام قاضی محمد شمشاد فاروقی تھا۔ وہ 1948ء تک بھارت میں رہے۔ 1952ء میں ساقی فاروقی اپنے خاندان کے ہمراہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے پاکستان آ گئے کچھ عرصہ بعد ساقی کا خاندان کراچی منتقل ہو گیا۔ جہاں اُنھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں وہ ایک ماہنامہ "ہوائے" کراچی کے مدیر بن گئے۔ گریجویشن کے بعد چند سال بعد وہ مستقل طور پر انگلستان منتقل ہو گئے۔ ساقی فاروقی کا شمار 1960ء کی دہائی میں اس وقت کے اُردو زبان کے مشہور شعرا ناصر کاظمی، منیر نیازی، مشتاق احمد اور جمیل الدین عالی کے ساتھ ہوتا ہے۔ "آپ بیتی پاپ بیتی" ان کی مشہور اور بے باک بلکہ کافی حد تک متنازع خود نوشت ہے۔ جس میں بہت سی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو عموماً ادیب اپنی کتابوں میں نہیں لکھتے۔ ساقی ایسے داستان گو شاعر ہیں جو اپنے قاری کو نت نئی اور ڈرامائی کہانیاں سنانے میں مصروف رہتے تھے۔ اس دور کے جلتے ہوئے مسائل ان کی بیش تر نظموں کا عنوان ہیں۔ ان کی نظموں کو جدید طرز احساس اور ہیئتی تجربات کے حوالے سے امتیاز حاصل ہے۔ ساقی فاروقی زندگی کا سفر طے کرنے کی تگ و دو میں دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف وہ کراچی کا کلا ابالی نوجوان ہے جو اردو بولتا اور لکھتا ہے اور دوسری جانب لندن کا وہ دیسی ہے جو انگریزی پڑھتا اور سوچتا ہے۔ اس نے اپنے اندر کے دونوں آدمیوں کو شاعری میں یک جا کر کے خود کو مکمل کیا ہے۔ آپ نے لندن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد برطانیہ کو اپنا دوسرا گھر بنا لیا اور 81 برس کی عمر میں 19 جنوری 2018ء کو ان کا انتقال برطانیہ کے شہر لندن میں ہوا۔

تصانیف: پیاس کا صحرا۔ بہرام کی واپسی۔ رازوں سے بھرا بستہ۔ سرخ گلاب۔ بدر منیر۔ غزل ہے شرط۔ زندہ پانی۔ حاجی بھائی پانی والا۔ رات کے مسافر۔ راز دار۔ ہدایت نامہ شاعر۔ آپ بیتی پاپ بیتی۔

نمونہ کلام:

اے ہوائے خوش خبر کوئی نوید سنگ دے — میری جیب و آستین میرے ہی خون سے رنگ دے
میں تیرے ظلم دکھاتا ہوں اپنا ماتم کرنے کے لیے — میری آنکھوں میں آنسو آئے تیری آنکھیں نم کرنے کے لیے

تحریر: حبیبہ معظمیہ

فرخندہ لودھی

1937ء تا 2010ء

فرخندہ لودھی 21 مارچ 1937ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئیں، بچپن ہوشیار پور میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد ساہیوال میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ساہیوال سے میٹرک اور بی اے پاس کرنے کے بعد 1958ء میں لاہور آ گئیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کر کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئیں۔ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی میں ایک طویل عرصے تک بہ طور لائبریرین خدمات سرانجام دیں اور وہیں سے ریٹائر ہوئیں۔ فرخندہ لودھی کو شاعری اور موسیقی کا بھی بہت شوق تھا۔ آخری چند سالوں میں پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کی جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اُنھوں نے لائبریریوں کے فروغ کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ فرخندہ لودھی نے افسانے اور ناول لکھے۔ اُن کے خیال میں کہانیاں تخلیق کرنے سے انسانیت کی بے لوث انداز میں خدمت اور مسائل کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اُردو دنیا میں ان کا اولین تعارف ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ "اوراق" کے پہلے شمارے سے ہوا۔ فرخندہ تعمیر پر یقین رکھتی تھیں اور ملال کرتیں کہ آج کا انسان تخریب کاری میں مبتلا ہے۔ فرخندہ بنیادی طور پر مشرقی عورت کی افسانہ نگار ہیں جس کا جسم معاشرے نے مجروح کر دیا ہے اور روح بھٹک رہی ہے۔ اُنھوں نے اُردو کے بہترین افسانے لکھے۔ اُن کی اَدبی خدمات کی وجہ سے ان کا نام اَدبی دنیا میں تادیر زندہ رہے گا۔ اَدب کے شعبے میں شان دار کی خدمات پر حکومت پاکستان نے ان کو "صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی" بھی نوازا اور ان کی اَدبی سماجی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ فرخندہ لودھی زندگی کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم جزئیات سے غیر معمولی تاثر پیدا کرنے والی افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ فرخندہ لودھی کی بلند حوصلگی اور انسانی زندگی میں اعتماد کا حقیقی اظہار ہے۔ فرخندہ لودھی کا انتقال 5 مئی 2010ء کو لاہور میں ہوا۔

تصانیف: شہر کے لوگ۔ آرسی۔ رومان کی موت۔ خوابوں کے کھیت۔ جب بجا کٹورا۔ حسرت عرض تمنا۔

نمونہ کلام: "آج تو دن بھر رہا کہاں ہے؟ مت بھولو کہ میں سائے کی طرح تم لوگوں کے پیچھے لگا رہتا ہوں اور رتی رتی بتا دے۔ ان دو کا تو کوئی آگا پیچھا ہے نہیں۔ تیرا باپ تو میں ہوں۔ مجھ سے جھوٹ بولے گا؟"

تحریر: صبیحہ ارشاد

محمد منشایاد

1937ء تا 2011ء

محمد منشایاد 5 ستمبر 1937ء کو فاروق آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جائے ولادت ضلع شیخوپورہ کا ایک گاؤں ٹھٹھہ نستر ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُنھوں نے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ اس کے بعد راول پنڈی سے ایم اے اُردو کیا اور اُنھوں نے پنجابی میں بھی ایم اے کیا۔ سب انجینئر، ایگزیکٹو انجینئر، ڈپٹی ڈائریکٹر افسر تعلقات عامہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ منشایاد کی دل چسپی افسانوں سے رہی۔ ان کا تخلیقی سفر کلاسیکی افسانے سے شروع ہوا، افسانہ "تیرھواں کھمبا" سے اُنھوں نے علامت اور تجرید کو فنی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ منشایاد دیہاتی آگہی کے افسانہ نگار ہیں اُنھوں نے نچلے متوسط طبقہ کے کرداروں کو ان کے ذہنی خلفشار سمیت قبول کیا اور حقیقت کو نئی صورت میں ابھارا۔ ان کی کہانیوں کا ایک حصہ ان دیہاتی اور قصباتی لوگوں کا ہے جو اقتصادی دباؤ کے تحت بڑے شہروں میں آ بسے ہیں لیکن وہ نئے ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتے اور طرح طرح کی نفسیاتی کج رویوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس موضوع پر منشایاد کی موثر کہانی میرا گھر ہے۔ منشایاد ترقی پسندوں کے متوازی چلتے رہے۔ منشایاد کے افسانے اپنے اندر کئی فنی و فکری جہتیں سموئے ہوئے ہیں اپنے افسانوں میں کہانی پن کو بہت اہمیت دی ا۔ ان کے ہاں تجریدی خیالات بھی ملتے ہیں لیکن کہانی کو ایسی اہمیت مل جاتی ہے جو کہ ہر طرح سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ قاری خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ کہانی پن جیسی خوبی اس کے سامنے ہوتی ہے۔ عمر کا بقیہ حصہ اسلام آباد میں گزارا۔ آپ 15 اکتوبر 2011ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: بند مٹھی میں جگنو۔ ماس اور مٹی۔ خلا اندر خلا۔ وقت سمندر۔ درخت آدمی۔ دور کی آواز۔ تماشا۔ خواب سرائے۔ وگدا پانی۔ ٹانواں ٹانواں تارا۔

نمونہ کلام: "ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے۔ ہمارے درمیان دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن مجھے بھی اس کی پروا نہیں آخر نا تو میرے کس کام آ سکتا ہے۔" (ماس اور مٹی)

تحریر: شہرین فیاض

خالدہ حسین
1938ء تا 2019ء

خالدہ حسین کی پیدائش 18 جولائی 1938ء کو لاہور میں ہوئی۔ خالدہ نے لاہور کالج برائے خواتین سے بی۔ اے کیا۔ ان کے والد انجینئرنگ یونی ورسٹی لاہور کے وائس چانسلر تھے۔ وہ اسلام آباد میں قیام پذیر رہیں۔ 1954ء میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ خالدہ حسین اُردو افسانے کا ایک اہم اور نمایاں نام ہے جن کی کتابیں تو موجود تھیں مگر وہ خود منظر عام پر آنا پسند نہیں کرتی تھیں، اُنھوں نے اپنے افسانوں میں جو انداز اپنایا ہے وہ ان کا اپنا انوکھا اور منفرد انداز ہے جو ان کی تحریروں میں فطری طور پر موجود تھا۔ وہ افسانے کی تمام تحریکوں سے بھرپور واقفیت رکھتی تھیں۔ موضوع پر اصرار کے ساتھ اظہار کے پیرایے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور وہ واقعات اور تجربات کو قابل قبول ترتیب میں پیش کیا ہے یہ فنی ہنر مندی ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہے۔ اُنھوں نے معاشرتی مسائل کو تخلیقی انداز میں بیان کیا۔ اُن کے افسانوں میں سماج و ثقافت کی بھرپور عکاسی موجود ہے۔ وہ اپنی تحریر سے قاری کے اندر منفرد کیفیت جگاتی ہیں۔ اُن کے بیش تر افسانوں کا منظر نامہ متوسط درجے کے گھرانوں سے متعلق ہے اور کرداروں میں محسوساتی سطح پر ایک انجان سا خوف نظر آتا ہے۔ خالدہ حسین کی ایک پہچان ان کا اسلوب بھی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے جدت پسندوں میں خالدہ حسین وہ واحد افسانہ نگار تھیں جو باقاعدگی سے اور تخلیقی جواز کے ساتھ افسانے لکھتی رہیں۔ خالدہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ اپنے پیغام کو فطری انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتی تھیں۔ حکومت پاکستان نے اُنھیں 14 اگست 2005ء کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ اُن کی وفات 11 جنوری 2019ء کو اسلام آباد میں ہوئی۔

تصانیف: پہچان۔ دروازہ۔ مصروف عورت۔ خواب میں ہنوز۔ کاغذی گھاٹ۔

نمونہ کلام: ”میرے گھر میں ایک خاموش تاریک کمرہ ہے۔ اس کی دیواروں میں نیچے سے اوپر تک طاق بنے ہوئے ہیں اور ان سب میں وہ چہرے دھرے ہیں جنھیں میں ایک ایک کر کے پہنتی ہوں۔ دن کے مختلف حصوں میں اپنے کام نمٹاتی چلی جاتی ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔“ (مصروف عورت)

تحریر: عائشہ سعید

مستنصر حسین تارڑ
پیدائش: 1939ء

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ 1939ء کو لاہور میں پیدا ہوئے جہاں منٹو ان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے مشن ہائی سکول اور مسلم ماڈل سکول میں تعلیم حاصل کی۔ مستنصر حسین تارڑ کا آبائی تعلق گجرات سے ہے لیکن اس وقت لاہور میں رہتے ہیں۔ بچپن میں قیام پاکستان کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا، ایف اے کرنے کے بعد برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک کا رُخ کیا۔ جہاں فلم، تھیٹر اور اَدب کو نئے زاویے سے سمجھنے، پرکھنے اور برتنے کا موقع ملا۔ پانچ برس وہاں گزارے اور ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹے۔ ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کی اور ڈرامے تحریر بھی کیے۔ اندرون و بیرون ملک متعدد سفر کیے اور کئی شاندار سفر نامے تحریر کیے۔ اخبار جہاں میں ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ناول کے حوالے سے بھی ان کا اہم نام ہے۔ ٹی وی پروگراموں کی بھی میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی اَدبی خدمات پر صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور ان کے ناول ”راکھ“ کو 1999ء میں بہترین ناول کے طور پر وزیراعظم اَدبی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ آپ کو 2002ء میں دوہا قطر میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے مشہور ترین سفرنامہ نگار ہیں۔

تصانیف: بہاؤ۔ راکھ۔ خس و خاشاک زمانے۔ اے غزال شب۔ شہپر۔ ہزاروں راستے۔ پرندے۔ سورج کے ساتھ ساتھ۔ ایک حقیقت ایک افسانہ۔ کیلاش۔ فریب۔ نکلے تیری تلاش میں۔ اندلس میں اجنبی۔ خانہ بدوش۔ نانگا پربت۔ نیپال نگری۔ سفر شمال کے۔ سنو لیک۔ کالاش۔ سنہری اُلو کا شہر۔ کیلاش داستان۔ ماسکو کی سفید راتیں۔ پاک سرائے۔ نیو یارک کے سو رنگ۔ ہیلو ہالینڈ۔ الاسکا ہائی وے۔ چک چک۔ اُلو ہمارے بھائی ہیں۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں۔ شتر مرغ ریاست۔ تارڑ نامہ۔

نمونہ کلام: ”'''' نیو یارک دنیا کا سب سے بڑا نسل پرست شہر تھا.. صرف گوری نہیں ہر نسل.. بھوری.. ٹمیالی اپنی اپنی نسل کی پرستش کرتی تھی.. ہر نسل اپنی ثقافت اور شکل کی پجاری تھی.. ہسپانوی.. اطالوی.. یونانی.. صرف اپنے ہم وطنوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے.. جنوبی امریکی صرف اپنے ہم زبان پر بھروسہ کرتے تھے“

تحریر: اقرا شہزادی

عرفان صدیقی
1939ء تا 2004ء
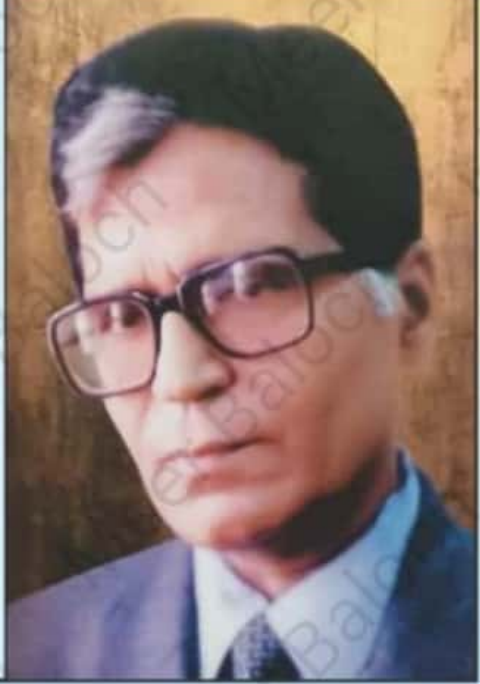
عرفان صدیقی 11 مارچ 1939ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔اُن کے خاندان میں شعر گوئی اور مذہب کی روایت کئی پشتوں سے چلی آ رہی تھی۔عرفان صدیقی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بدایوں سے ہی میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کیا۔ بریلی کالج بریلی سے 1957ء میں بی۔اے اور 1959ء میں ایم۔اے کیا۔انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن سے صحافت کا ڈپلوما کیا۔حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات و نشریات اور وزارت دفاع کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پندرہ سال کی عمر میں ان کے ذہن میں شاعری کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔غزل گوئی ان کی پہلی ترجیح تھی لیکن کچھ نظموں کا چشمہ بھی ان کے قلم سے پھوٹا۔وہ اپنی شاعری میں علامتوں،استعاروں اور اشاروں سے بھی اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں جمالیاتی رنگ عروج کی منازل طے کرتا دکھائی دیتا ہے جس کی بہ دولت ان کے کلام میں تازگی، جدت،انفرادیت اور اثر انگیزی کے جوہر روانی سے سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی جذبات وخیالات کے اظہار پر گرفت قوی شعور کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ان کے وضع کردہ اصولوں میں ان کی شاعری اس طرح سے ڈھل جاتی ہے کہ قاری کے سامنے فکری میلانات اور رجحانات کی ایک خوش گوار صبح طلوع ہوتی ہے۔ان کے ہاں شعری خیال ایسی انفرادیت سے ابھرتا ہے کہ نظر ثانی کرنا معیوب لگتا ہے۔انھیں جدید اردو شاعروں میں اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل ہے۔انھوں نے 15 اپریل 2004ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

تصانیف: کینوس۔شب درمیاں۔سات سماوات۔عشق نامہ۔ہوائے دشت ماریہ۔قصہ مختصر کرتا ہوں۔دریا (کلیات)۔شہر ملال (کلیات عرفان صدیقی،مرتب:سید محمد اشرف)۔رابطہ عامہ (صحافت)۔رت سنگھار (ترجمہ)۔

نمونہ کلام: جانے کیا ٹھان کے اٹھتا ہوں نکلنے کے لیے جانے کیا سوچ کے دروازے سے لوٹ آتا ہوں
مجھے یہ زندگی نقصان کا سودا نہیں لگتی میں آنے والی دنیا کو بھی تخمینے میں رکھتا ہوں

تحریر: ابدال رضا

انیس ناگی
1939ء تا 2010ء

انیس ناگی 10 ستمبر 1939ء کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔اُن کا خاندانی نام یعقوب علی ناگی تھا۔گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے (اُردو) کیا۔جامعہ پنجاب سے اُردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔بعد ازاں اُنھوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔اُنھوں نے شاعری ناول افسانہ تنقید اور تراجم میں طبع آزمائی کی۔اُن کی جدید اُردو نظم کو نہ صرف پاکستان میں بل کہ بیرون ملک بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔وہ ساٹھ کی دہائی میں نئی شاعری کی تحریک کے نام سے سامنے آنے والے لوگوں میں شامل تھے۔سعادت حسن منٹو پر ان کا بہت وقیع کام ہے۔اُن کا اہم ترین ناول ''زوال'' ہے اور دوسرے ناول ''دیوار کے پیچھے'' کو اُردو میں ناول کی نئی روایت کا آغاز کہا جاتا ہے۔انیس ناگی نے اپنے مضامین میں عورت کے حوالے سے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سے ہمارا اکثر سامنا ہوتا ہے۔انیس ناگی 7 اکتوبر 2010ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف: میری اَدبی بیاض۔نثری نظمیں۔غالب ایک شاعر ایک اداکار۔ہوائیں۔جہنم میں ایک موسم۔نیا شعری اُفق۔ناراض عورتیں۔مذاکرات۔میں اور وہ۔تصورات۔بشارت کی رات۔میراجی۔غیر منوعہ نظمیں۔نوحے۔جنس اور وجود۔روشنیاں۔زرد آسمان۔صداؤں کا جہاں۔نذیر احمد کی ناول نگاری۔ایک گرم موسم کی کہانی۔دیوار کے پیچھے۔نئے افسانے۔بیگانگی کی نظمیں۔تہ خانہ سے۔بے خیالی میں۔بیابانی کا دن۔بے خوابی کی نظمیں۔ابھی کچھ اور۔آگ ہی آگ۔زوال۔ایک لمحہ سوچ کا۔چوہوں کی کہانی۔درخت مرے وجود کا کیمپ۔گردش۔محاصرہ۔سکریپ بک۔قلعہ۔ایک ادھوری سرگزشت۔حکایات۔نثری نظمیں۔پاکستانی اُردو اَدب کی تاریخ۔شعری لسانیات۔وقت کی کہانیاں۔

نمونہ کلام: ''احمد کا مکان میرے مکان سے سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔میرے مکان کے سامنے سے ایک نسبتاً بے آبادی سڑک گزرتی ہے،مکان کے عقب میں ایک گنجان محلہ آباد ہے۔''(دیوار کے پیچھے)

تحریر: ہیبت خان

وسیم بریلوی

پیدائش:1940ء

وسیم بریلوی نے 8 فروری 1940ء کو بریلی میں آنکھ کھولی۔ اُن کا اصل نام زاہد حسن ہے۔ اُنھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے ایم۔اے اُردو کیا۔ اُنھوں نے ابتدا سے ایم۔اے تک امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اُن کی ملازمت کا سلسلہ دہلی یونی ورسٹی سے شروع ہوا اور پھر بریلی کالج کے شعبہ اُردو سے منسلک ہو گئے۔ دیگر ذمہ داریوں میں وہ روہیل کھنڈ یونی ورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے۔ اُن کی اَدبی زندگی کا سورج 1959ء میں طلوع ہوا۔ باقاعدہ شاعری کی ابتدا کی تو سب سے پہلے اپنے والد صاحب کو غزلیں دکھائیں۔ اُن کی غزل کی زبان بہت سلیس، دل کش اور مٹھاس سے لبریز ہے۔ وہ دکھ درد کو ایسے شیریں انداز سے زیرِ قلم لاتے ہیں کہ قاری کو اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ سی ہونے لگتی ہے کہ دکھ درد سے اس قدر مٹھاس کیسے ٹپک سکتی ہے؟ ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ اُن کے ایک ایک لفظ میں ایک آہ کا احساس ہوتا ہے جو قاری اور سامع کو اپنی جادوئی گرفت سے دوچار کر دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اُن کی شاعری میں پرکیف نغمگی بھی پائی جاتی ہے اور احتجاجی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے جدیدیت کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی اور وہ جدید رجحانات کا زمانہ بھی گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ غزل کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں اور نعت گوئی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا ابتدائی دور دراصل نعتوں، مرثیوں اور نوحوں کا تھا۔ شعری مجموعہ "مزاج" پر اُنھیں اُردو اکیڈمی لکھنؤ کی جانب سے ایوارڈ اور میرا کادمی کی جانب سے "امتیازِ میر" ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ اُن کے فن اور شخصیت پر مقالہ جات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ وہ دورِ جدید کے ایک اہم شاعر ہیں۔

تصانیف: تبسم غم۔ آنسو میرے دامن تیرا۔ مزاج۔ آنکھ آنسو ہوئی۔ میرا کیا۔ آنکھوں آنکھوں رہے۔ موسم اندر باہر کے۔ اندازِ گزارش۔ چراغ۔ آنسو بول۔ آخری پڑاؤ۔

نمونہ کلام:

آسماں اتنی بلندی پہ جو اتراتا ہے — بھول جاتا ہے زمیں سے ہی نظر آتا ہے

دکھ اپنا اگر ہم کو بتانا نہیں آتا — تم کو بھی تو اندازہ لگانا نہیں آتا

تحریر: ابدال رضا

رفیع الدین ہاشمی

پیدائش: 1940ء

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی 9 فروری 1940ء کو مصریال ضلع چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1966ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اُردو کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ 1969ء میں محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ ہوئے اور مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد 1982ء میں اورینٹل کالج لاہور میں تعینات ہوئے اور وہیں سے بہ طور پروفیسر سبک دوش ہوئے۔ کچھ عرصہ صدر شعبۂ اُردو بھی رہے۔ 1981ء میں جامعہ پنجاب سے "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد 2006ء سے 2008ء تک ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ممتاز پروفیسر بھی رہے۔ کئی اَدبی، علمی و تحقیقی رسائل کے مدیر و معاون مدیر بھی رہے وہ "بابائے اُردو ایوارڈ" اور "قومی صدارتی اقبال ایوارڈ" حاصل کر چکے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں اور نجی محفلوں اور دوستوں کے حلقوں میں وہ حسبِ موقع ظرافت اور مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ دل آزاری ان کا مسلک نہیں مگر حق گوئی اور بے باکی ان کا شعار ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک بڑا وصف ان کی سادگی اور بے تکلفی ہے بناوٹ اور ظاہرداری سے اُنھیں لگاؤ نہیں اور وہ عمل کے خوگر اور تحرک کے داعی ہیں اگر اُنھیں علامہ اقبال کا فلسفہ جدوجہد و تحرک کی عملی مثال قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

تصانیف: اصناف اَدب۔ خطوط اقبال۔ کتابیات اقبال۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ یادنامہ لالہ صحرائی۔ اقبال کی طویل نظمیں۔ فکری و فنی مطالعہ۔ 1885ء کا اقبالیاتی اَدب: ایک جائزہ۔ اقبال: مسائل و مباحث۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ۔ پوشیدہ تری خاک میں۔ سورج کو ذرا دیکھ۔ مکاتیب مشفق خواجہ۔ پاکستان میں اقبالیاتی اَدب۔ علامہ اقبال: شخصیت و فن۔ خطوط مودودی۔ جامعات میں اُردو تحقیق۔

نمونہ کلام: "جن لوگوں کو واصل جہنم دکھانے کی ضرورت تھی ان کو "فلک زحل" کے ایک قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب دکھا دیا ہے اور وہ ایسے لوگ نہیں جو خالص مذہبی یا اخلاقی نقطہ خیال سے مجرم و گنہگار ہوں۔" (اقبالیات کے سو سال)

تحریر: طیبہ حسین

رشید امجد
پیدائش: 1940ء

رشید امجد 5 مارچ 1940ء کو مقبوضہ کشمیر کے شہر سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام اختر رشید امجد ہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر لی اور راول پنڈی میں رہائش پذیر ہوئے۔ اُن کے والد کا مزاج فقیرانہ تھا۔ وہ فارسی اور پنجابی میں شاعری کیا کرتے تھے۔ اُن کی شاعری پر صوفیانہ رنگ غالب تھا اور طبیعت میں درویشی اور بے نیازی تھی۔ رشید امجد اُردو کے مشہور افسانہ نگار، ادیب اور سکالر ہیں۔ تدریسی اور تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ وہ افسانے بھی لکھتے رہے اور اُنھوں نے پاکستان اور بھارت سے کئی ایوارڈ حاصل کیے۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اُردو کے جن افسانہ نگاروں کے یہاں ادراک و اظہار کی بڑی اہم اور فن کے حق میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان میں رشید امجد کا نام بطور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے پاکستانی اَدب کو چھ جلدوں میں ترتیب دے کر شایع کیا ہے لیکن ان کی مرکزی حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ رشید امجد نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز 1960ء میں افسانہ ''سنگم'' سے کیا۔ ابتدائی دور کا اسلوب بیانیہ ہے لیکن ان کی افسانہ نگاری کی شناخت علامتوں سے ہوتی ہے۔ تصوف، روحانیت یا روحانی کیفیات کا موضوع رشید امجد کے یہاں نہ صرف بنیادی حیثیت رکھتا ہے بل کہ کئی عنوانات مکمل صورت میں تشکیل پاتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی جہدِ مسلسل نے افسانوی فن کو جلا بخشی ہے۔ رشید امجد کا شعری اسلوب، علامتی اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر جدید افسانے میں ایک منفرد نقش قایم کرتے ہیں۔

تصانیف: کاغذ کی فصیل۔ بے زار آدم کے بیٹے۔ ریت پر گرفت۔ سہ پہر کی خزاں۔ گم گشتہ آوازوں کی دستک۔ عکس بے خیال۔ رویے اور شناختیں۔ نیا اَدب۔ فکر و فن۔ تعلیم کی نظریاتی اساس۔ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے۔ ایک عام آدمی کا خواب۔ میرا جی شخصیت اور فن۔ میرزا ادیب شخصیت اور فن۔ پت جھڑ میں خود کلامی۔ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں۔ تمنا بے تاب۔

نمونہ کلام: ''مجھے معلوم ہے کہ اس کے پرانے پن اور چھوٹے سے احاطہ کے اندر ایک بڑا جہان چھپا بیٹھا ہے، میں نے اس جہان کو دریافت کر لیا ہے اور میرے بیوی بچے اسے دریافت نہیں کر سکے۔''

تحریر: تحسین فاطمہ

خواجہ محمد زکریا
پیدائش: 1940ء

خواجہ محمد زکریا نے 23 مارچ 1940ء کو امرت سر میں آنکھ کھولی۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور آ گئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا اور 1962ء میں اُنھوں نے جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے اُردو کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کی۔ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1974ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1979ء میں وہ بہاالدین زکریا یونی ورسٹی ملتان میں اُردو زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے اور صدر شعبہ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف لینگویجز کے عہدے پر فایز رہے۔ 1980ء میں وہ دوبارہ اورینٹل کالج لاہور آ گئے۔ 1993ء سے 1995ء تک ڈین کلیہ علوم اسلامیہ والسنہ شرقیہ کے فرائض سرانجام دیے۔ 1994ء میں اُنھیں گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ پھر اُردو زبان کی تدریس کے لیے جاپان چلے گئے اور وہاں سے واپسی پر دوبارہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل بنے۔ آپ 22 مارچ 2000ء کو ریٹائر ہو گئے۔ وہ تحقیق و تصنیف میں بھی مصروف رہے۔ اُنھوں نے ایم اے کی سطح پر ایک سو سے زیادہ طلبا کی تحقیقی مقالات لکھنے میں مدد کی اس کے علاوہ 20 سے زیادہ ریسرچ اسکالروں نے ان کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کے مقالات تحریر کیے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اُردو زبان و اَدبیات کے نام ور فاضل، شاعر، محقق، نقاد اور ماہر اقبالیات کا روشن ستارہ ہیں۔

تصانیف: اُردو کی قدیم اصناف شعر۔ نئے پرانے خیالات۔ اُردو کتابیں۔ اُردو میں قطعہ نگاری۔ پریم چند کے بہترین افسانے۔ اقبال کا اَدبی مقام۔ ان گنت سورج۔ اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ کلیات عدم۔ انتخاب زریں۔ اقبالیات: چند نئی جہات۔ شرح بانگ درا۔ شرح بال جبریل۔ آشوب۔ کلیات حفیظ جالندھری۔ Urdu for Beginners۔

نمونہ کلام: زندگی بھر تو سدا جبر سے صبر کیے — موت کے بعد مجھے کیا جو مری قبر جیے

''اکبر سرسید کے ان نظریات کے علمی پہلوؤں کی طرف بہت کم التفات کرتے ہیں۔ وہ محض ان کے نتائج کو بنیاد بنا کر تنقید کرتے ہیں۔'' (اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

تحریر: ابدال رضا

کشور ناہید
پیدائش: 1940ء

کشور ناہید 17 جون 1940ء میں بلند شہر میں ایک قدامت پسند سید گھرانے میں پیدا ہوئیں جہاں عورتیں پردے کی پابند تھیں۔ سات سال کی عمر میں کشور کو بھی برقع پہنا دیا گیا تھا لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی کے تمام فیصلے روایت سے ہٹ کر کیے۔ نویں جماعت میں اُنھوں نے اخبار لکھنا میں شروع کیا، میٹرک کے بعد اپنی ضد منوا کر اُنھوں نے کالج میں داخلہ لے لیا فرسٹ ایئر سے شعر کہنے کا سلسلہ شروع ہوا اور گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود ان کا علمی اَدبی سفر جاری رہا۔ تعلیمی و تقریری مقابلوں اور مشاعروں میں حصہ لیتی رہیں اور ان کا کلام اَدبی رسایل میں چھپتا رہا۔ پنجاب یونی ورسٹی میں معاشیات میں ایم۔ اے کے دوسرے سال میں تھیں جب ان کے گھر والوں کو دوستی کا علم ہوا اور اس جرم کی پاداش میں کشور اور یوسف کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ کشور کی شادی گو کہ پسند کی شادی تھی مگر اُن کے ازدواجی حالات کچھ ایسے خوشگوار نہ تھے۔ کشور اسلام آباد میں رہائش پذیر اور روز نامہ جنگ سے وابستہ رہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''لب گویا'' کے نام سے شایع ہوا اور آدم جی ایوارڈ حاصل کیا۔ اُنھیں منڈیلا ایوارڈ اور ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ اپنی شاعری میں ایسے نسوانی جذبات اور مسایل کا برملا اظہار کیا ہے جنھیں بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چھ شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ اُن کی آپ بیتی ''بری عورت کی کتھا'' کے نام سے شایع ہوئی۔ ان کی متعدد نظموں کا انگلش اور ہسپانوی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

تصانیف: لب گویا۔ بری عورت کی کتھا۔ میں پہلے جنم میں رات تھی۔ زخم برداشتہ۔ گم شدہ یادوں کی واپسی۔ شناسائیاں رسوائیاں۔ بے نام مسافت۔ کلیاں، دھوپ، دروازے۔ فتنہ سامانی دل۔ علامتوں کے درمیاں۔ سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ۔ ناوک دُشنام۔ عورت۔ جواب اور خاک کے درمیان۔ نوزائیدہ بچی کے نام۔

نمونہ کلام:

کون جانے کہ اڑتی ہوئی دھوپ بھی — کس طرف کون سی منزلوں میں گئی
دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت — سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

تحریر: محمد اشرف عباس شاہ

تبسم کاشمیری
پیدائش: 1940ء

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا اصل نام محمد صالحین ہے۔ وہ 29 جولائی 1940ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے اور یہیں پر تعلیم حاصل کی۔ 1964ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے اور 1973ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز 1965ء میں شعبہ تاریخ اَدبیات مسلمانان پاک و ہند، جامعہ پنجاب سے بہ طور تحقیق کار کیا، پھر یونی ورسٹی اورینٹل کالج اور اوساکا یونی ورسٹی جاپان کے شعبہ اُردو سے بہ طور استاد وابستہ ہے۔ 2005ء میں اوساکا یونی ورسٹی سے ریٹائر ہوئے۔ اسی برس جاپان فاؤنڈیشن نے اُنھیں خصوصی ایوارڈ دیا۔ واپس آ کر یونی ورسٹی آف ایجوکیشن اور جی سی یونی ورسٹی لاہور میں پڑھاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ آپ نے تراجم، تنقید، اَدبی تاریخ، شاعری اور ناول نگاری میں طبع آزمائی اور ہسپانوی شاعروں بالخصوص پابلو نیرودا کے کلام کے تراجم کیے ہیں۔ شاعری، تحقیق، تنقید کی متعدد کتب شایع ہوئیں۔ اُنھیں نظریہ ساز محقق کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ''اَدبی تحقیق کے اصول'' تحقیقی اصولوں کے بارے میں شایع ہونے والی ایک منفرد کتاب ہے جو 1992ء میں شایع ہوئی۔ ان کی مشہور کتاب ''اُردو اَدب کی تاریخ ابتدا سے 1857ء تک'' ہے جو کہانی کی شکل میں تاریخ اَدب بیان کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب 2003ء میں شایع ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری جدید نظم کے سرخیل اور نثری نظم کی تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ''پرندے، پھول، تالاب'' شعری کلیات ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُردو اَدب کی متعدد اصناف میں خدمات انجام دی ہیں جن کو سراہتے ہوئے حکومت پاکستان نے اُنھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا ہے۔

تصانیف: اُردو اَدب کی تاریخ۔ قصبہ کہانی۔ تمثال۔ نوحے تخت لہور کے۔ پرندے، پھول، تالاب۔ بازگشتوں کے پل پر۔ کاسنی بارش میں دھوپ۔ اَدبی تحقیق کے اصول۔ جاپان میں اُردو۔ اقبال اور نئی قومی ثقافت۔

نمونہ کلام: ''جوانی دھول بننے لگ گئی / جب کالے راستوں پر / تو پھر خوابوں کے ساحل پر / نہ کوئی پھول گرتا تھا / نہ بادل ہی برستا تھا / جدھر بھی دیکھتا تھا / انوکھے ہی لوگ ملتے تھے''۔

تحریر: زاہدہ حمید

خورشید رضوی
پیدائش: 1942ء

ڈاکٹر خورشید رضوی 19 مئی 1942ء کو امروہہ، مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہندستان کے وقت آٹھ سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور ساہی وال میں آباد ہوئے۔ گورنمنٹ کالج منٹگمری سے گریجویشن کرنے کے بعد لاہور آ گئے۔ انھوں نے 1961ء میں اورینٹل کالج سے ایم اے عربی میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور 1981ء میں اسی ادارے سے پی ایچ ڈی کی۔ ان کو جدید اُردو غزل گویوں میں نمایاں مقام حاصل ہے جن کے ہاں فکری تازگی بھی ہے اور غزل کی روایت سے انسلاک بھی موجود ہے۔ انھیں بہ یک وقت اُردو، عربی، انگریزی، فارسی اور پنجابی زبانوں پر عبور ہے۔ اُن کے سات شعری مجموعوں کے علاوہ مختلف زبانوں میں تالیف و ترجمہ کی متعدد کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ مختلف زبانوں میں تراجم بھی اُن کی خاص پہچان ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی قدیم عربی ادب اور مخطوطہ شناس کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے بغداد پر ہلاکو خان کے حملے کے دوران میں ضائع ہونے والی عربی زبان کی ادبی تاریخ کی تدوین کرنے کے علاوہ بنکنگ سود پر وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے فیصلے کا انگریزی سے عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ تیرھویں صدی کے عربی نسخے "قلعہ الجمان" کی تنقیدی تدوین اور عربی ادب کی قبل از اسلام مفصل تاریخ بھی ان کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز اور احمد ندیم قاسمی ایوارڈ، احمد فراز ادبی ایوارڈ، خالد احمد ایوارڈ، یو بی ایل ادبی ایکسی لینس ایوارڈ اور مجلسِ فروغ اُردو ادبی ایوارڈ قطر سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے بہ طور پروفیسر امریطس وابستہ ہیں۔

تصانیف: شاخ تنہا۔ سرابوں کے صدف۔ رائگاں۔ یکجا۔ دیریاب۔ شناخت۔ امکان۔ نسبتیں۔ مگر مچھ اور بندر۔ میاں مٹھو۔ اطراف۔ تالیف۔ عربی شاعری: ایک تعارف۔ عربی ادب قبل از اسلام۔ بازدید۔

نمونہ کلام:

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

زلف کب کی آتشِ ایام سے کملا گئی
زلف کا سایہ نہیں ڈھلتا سرِ مو آج بھی

تحریر: محمد عمران الحسن

عطاالحق قاسمی
پیدائش: 1943ء

عطاالحق قاسمی یکم فروری 1943ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مولانا بہاالحق قاسمی تھا۔ عطاالحق قاسمی نے ادبی زندگی کا آغاز کم عمری میں ہی کر دیا تھا۔ کالم نگاری ہو یا شاعری، وہ اپنا الگ اسلوب رکھتے ہیں۔ اُن کے کالم فکاہیہ ہوتے ہیں جن سے قاری خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُن کی کالم نگاری حقیقت نگاری سے مزین ہے۔ وہ مسائل جو پاکستان میں بکھرے نظر آتے ہیں ان کو وہ اپنے کالموں میں یک جا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی سوچ اُنھیں کالم نگار سے غم گسار بھی بناتی ہے۔ وہ الفاظ کو نت نئے پیرایے میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بہ یک وقت کالم نویس، ڈرامہ نگار، سیاست دان، شاعر، سفارت کار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ وہ تعلیم کے شعبے سے بھی منسلک رہے ہیں اور ایف سی کالج سے بہ طور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائرڈ ہوئے۔ اُنھیں چیئرمین پی ٹی وی کے عہدے پر بھی تعینات کیا گیا۔ "روزن دیوار سے" کے نام سے وہ روزنامہ جنگ میں باقاعدگی سے کالم لکھتے ہیں۔ ناروے اور تھائی لینڈ میں پاکستانی سفیر کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ حکومت پاکستان نے اُنھیں 14 اگست 1991ء کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور بعد ازاں ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز عطا کیا۔ آدم جی اَدبی ایوارڈ اور ای پی این ایس ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

تصانیف: روزن دیوار سے۔ عطایئے۔ خند مکرر۔ شوق آوارگی۔ گوروں کے دیس میں۔ جبس معمول۔ شر گوشیاں۔ جرم ظریفی۔ دھول دھپا۔ آپ بھی شرمسار ہو۔ دلی دور است۔ کالم تمام۔ بازیچہ اعمال۔ بارہ سنگھے۔ ملاقاتیں ادھوری ہیں۔ دنیا خوب صورت ہے۔ مزید گنجے فرشتے۔ ہنسنا رونا منع ہے۔ اپنے پرائے۔ علی بابا چالیس چور۔ ایک غیر ملکی کا سفرنامہ۔ حویلی۔ خواجہ اینڈ سن۔ شب دیگ۔

نمونہ کلام:

نکل پڑا ہوں کسی اور گھر کی خواہش میں
جہاں پہ گزری وہاں پہ زندگی بہت کم تھی

"یوں تو لاہور میں بہت سے شادی گھر ہیں تاہم ان میں مشہور ترین شادی گھر لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ دوپہر اور رات کے وقت میں یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ یہاں باراتیوں کے علاوہ بھی دوسرے لوگ زرق برق کپڑے پہنے آتے ہیں۔" (روزن دیوار سے)

تحریر: شازیہ پروین

افتخار عارف
پیدائش: 1943ء

افتخار عارف 21 مارچ 1943ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان کراچی منتقل ہو گیا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان میں بہ حیثیت نیوز کاسٹر کیا پھر پی ٹی وی سے منسلک ہو گئے۔ اس دور میں ان کا پروگرام ''کسوٹی'' بہت زیادہ مقبول ہوا۔ بی سی سی آئی بینک کے تعاون سے چلنے والے ادارے ''اُردو مرکز'' کو جوائن کرنے کے بعد آپ انگلینڈ چلے گئے جہاں سے واپس آنے کے بعد مقتدرہ قومی زبان کے چیئر مین بنے۔ اس کے بعد اکادمی اَدبیات کے چیئر مین کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے جب کہ نومبر 2008ء سے مقتدرہ قومی زبان کے چیئر مین کی خدمات سرانجام دینے کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران کے دارالحکومت تہران میں ''ایکو تنظیم'' کے ثقافتی شعبے کو سنبھالتے رہے جہاں ایران میں ہونے والی اَدبی اور علمی محفلوں کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں ان کی شرکت ایک لازمی امر بن گئی ہے۔ آپ کا شمار اپنی نسل کے شعرا میں سنجیدہ ترین شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے مواد اور فن دونوں میں ایک ایسی پختگی کا اظہار کرتے ہیں جو دوسروں میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ آپ کی مقبولیت کی وجہ آپ کی شاعری ہے جس میں جدیدیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جو سوچنا، محسوس کرنا اور بولنا جانتا ہے۔ آپ کو 1989ء میں تمغۂ حسن کارکردگی، 1999ء میں ستارۂ امتیاز اور 2005ء میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔

تصانیف: بارھواں کھلاڑی۔ مہر دو نیم۔ حرف باریاب۔ جہان معلوم۔ شہر علم کے دروازے پر۔ کتاب دل و دنیا (کلیات)۔

نمونہ کلام:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے — میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

دل پاگل ہے روز نئی نادانی کرتا ہے — آگ میں آگ ملاتا ہے پھر پانی کرتا ہے

تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں — جان بہت شرمندہ ہیں

دنیا بدل رہی ہے زمانہ کے ساتھ ساتھ — اب روز روز دیکھنے والا کہاں سے لائیں

تحریر: شاہد نواز

امجد اسلام امجد
پیدائش: 1944ء
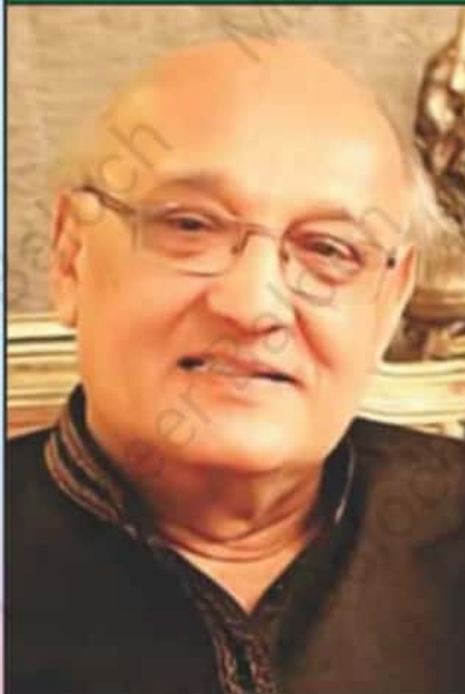
امجد اسلام امجد 4 اگست 1944ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔اے اُردو کیا۔ اس کے بعد ایم اے او کالج لاہور کے شعبہ اُردو میں تدریس سے منسلک رہے۔ 1975ء سے 1979ء تک پی ٹی وی سے وابستہ رہے، اس کے بعد اُردو سائنس بورڈ میں چیئر مین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1975ء میں مشہور ٹی وی ڈرامے ''خواب جاگتے ہیں'' لکھنے پر اُنھیں گریجوایٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ دیگر ڈراموں میں وارث، دن، فشار نے ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اُنھیں ستارہ امتیاز، صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی اور بہترین ڈرامہ نگار کے ایوارڈز عطا ہوئے۔ امجد اسلام امجد جدید نظم کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ اپنی شاعری میں آسان الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مشکل سے مشکل خیال کو بھی ایسی روانی سے کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دل میں ان کا کلام اتر جاتا ہے۔ اُن کو دسمبر 2019ء میں استنبول میں منعقدہ ایک تقریب میں ''نسیپ فاضل انٹرنیشنل کلچر اینڈ آرٹ'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اُن کے کئی شعری مجموعے، تنقیدی مضامین کی کتاب ''تاثرات'' اور چند عربی نظموں کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ''چشم تماشا'' کے نام سے کالم بھی لکھتے ہیں۔ وہ بہ یک وقت شاعر، نقاد، ڈراما نگار، مترجم اور کالم نگار ہیں۔

تصانیف: اسباب (حمد و نعت)۔ بارش کی آواز۔ شام سرائے۔ اتنے خواب کہاں رکھوں۔ نزدیک۔ یہیں کہیں۔ ساتواں در۔ فشار۔ سحر آثار۔ ساحلوں کی ہوا۔ محبت ایسا دریا ہے۔ برزخ۔ اس پار۔ پھر یوں ہوا۔ ذرا پھر سے کہنا۔ باتیں کرتے دن۔ رات سمندر میں۔ ہم اس کے ہیں (کلیات)۔ میرے بھی ہیں کچھ خواب۔ سپنوں سے بھری آنکھیں۔ ریشم ریشم (سفرنامہ)۔ یہ افسانے۔ اپنے لوگ۔ وقت۔ وارث۔ آنکھوں میں ترے سپنے۔ سپنے بات نہیں کرتے۔ عکس۔ سپنے کیسے بات کریں۔ خواب جاگتے ہیں۔ بانصیب کلینک۔ دھند کے اس پار۔ تیسرے پہر کی دھوپ۔ کوئی دن اور۔ چراغ راہ گزر۔

نمونہ کلام:

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی — اس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں — میری عمر بھر کا ریاض تھا

تحریر: ایمن اکرم

فہمیدہ ریاض
1946ء تا 2018ء

فہمیدہ ریاض 28 جولائی 1946ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ریاض الدین احمد تعلیم پسند شخص اور سندھ میں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں مصروف تھے۔ آپ کے والد کے تبادلے کے بعد آپ کا خاندان حیدرآباد آ گیا۔ اُن کی عمر چار برس تھی جب ان کے والد کے انتقال کے بعد والدہ نے آپ کی پرورش کی۔ انھی ایام میں آپ نے اُردو، سندھی زبان سیکھ لی اور فارسی زبان سے شناسائی حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں ملازمت شروع کی۔ کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کے خاندان والوں نے شادی پر راضی کیا جو کہ پہلے سے طے شدہ تھی۔ آپ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ برطانیہ میں کچھ عرصہ رہیں پھر طلاق لے کر پاکستان آ گئیں۔ ان دنوں بی بی سی اُردو ریڈیو میں کام کیا اور ساتھ ہی فلم کاری میں ڈگری حاصل کی۔ پھر ایک سیاستدان ظفر علی کے ساتھ دوسری شادی کی۔ کراچی میں ایک اشتہاری ایجنسی میں کام کرنا شروع کیا اور جلد ہی اپنا ایک سیاسی اور لبرل مجلّہ شایع کروایا۔ فوجی مارشل لا کے زمانے میں اس کو ناپسند کیا گیا اور اُن پر اور ان کے شوہر پر مقدمے ہوئے جس کی وجہ سے ظفر علی کو جیل جانا پڑا اور مجلّہ بھی بند ہو گیا۔ ان کے نزدیک تانیثیت کا مطلب یہ ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی ایک مکمل انسان ہے، اس پر کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ فہمیدہ ریاض کو اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور پھر ان کو اپنے خاندان سمیت بھارت بھیج دیا گیا۔ بھارت کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے اس بارے میں وقت کے موجودہ وزیرِ اعظم گاندھی سے بات کی اور جس وجہ سے آپ کو وہاں رہائش مل گئی۔ وہاں 7 سال گزارے اور ہندی زبان بھی سیکھ لی۔ اُنھوں نے 21 نومبر 2018ء کو لاہور میں وفات پائی۔

تصانیف: پتھر کی زبان۔ خطِ مرموز۔ گوداوری۔ گلابی کبوتر۔ بدن دریدہ۔ دھوپ۔ آدمی کی زندگی۔ حلقہ مری زنجیر کا۔ ادھورا آدمی۔ پاکستان لٹریچر اینڈ سوسائٹی۔ قافلے پرندوں کے۔ یہ خانۂ آب و گل۔ سب لعل و گوہر۔

نمونہ کلام:

کس سے اب آرزوئے وصل کریں — اس خرابے میں کوئی مرد کہاں
چار سو ہے بڑی دہشت کا سماں — کسی آسیب کا سایہ ہے یہاں

تحریر: ہما نذیر

افتخار نسیم
1946ء تا 2011ء

افتخار نسیم 15 ستمبر 1946ء کو لائل پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خلیق قریشی معروف صحافی تھے۔ اُن کا بچپن لائل پور میں گزرا۔ بڑے ہوئے تو ہیجڑوں کی سنگت اختیار کر لی۔ سات آٹھ برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور والد نے دوسری شادی کر کے افتخار (افتی) کو شہر کے مکان میں اکیلا چھوڑ دیا۔ افتی نے سکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ دس سال کی عمر میں اُنھوں نے نثر کا پہلا صفحہ لکھا۔ عدیم ہاشمی نے اُنھیں نثر سے شاعری کی طرف راغب کر دیا۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ لا کالج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب ان کو محسوس ہوا کہ وہ ہم جنس ہونے کے سبب غیر محفوظ ہیں تو وہ 1971ء میں ترکِ وطن کر کے امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں اُنھوں نے شکاگو میں قیام کیا۔ وہ حصولِ تعلیم کے لیے آئے تھے لیکن اُنھوں نے اپنا ذریعہ معاش قیمتی گاڑیوں کے خرید و فروخت کو بنایا اور اَدب و شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ وہ امریکہ میں چند ایک اعلانیہ مسلمان اور پاکستانی ہم جنس پرستوں میں شامل تھے۔ اپنے پسندیدہ شہر شکاگو کے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں افتخار نسیم کو اُردو کے مشہور شعرا اور ادیبوں کی میزبانی کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ وہ متنازع ہونے کے باوجود ہر آنکھ کا تارا تھے۔ اُن کے پرستار دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اُنھوں نے شکاگو میں ایک ایف ایم چینل بھی قایم کیا۔ امریکہ میں پڑھنے، کلب میں ناچنے کے علاوہ وہ سیلز مین بھی رہے۔ افتی وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے اُردو شاعری میں ہم جنس احساسات اور شناخت کی بات کی۔ اُن سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی انسان دوستی، مہمان نوازی اور کھرے پن کے معترف تھے۔ اُنھوں نے سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شکاگو میں اُنھیں دل کا دورہ پڑا وہ دو دن تک کومے میں رہ کر 22 جولائی 2011ء کو انتقال کر گئے۔

تصانیف: غزال۔ مختلف۔ ایک تھی لڑکی۔ نرمان۔ آب دوز۔ شہری۔ افتی نامہ۔ افتی نامہ 2۔

نمونہ کلام:

کٹی ہے عمر کسی آب دوز کشتی میں — سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا
اگرچہ پھول یہ اپنے لیے خریدے ہیں — کوئی جو پوچھے تو کہہ دوں گا اس نے بھیجے ہیں

تحریر: اقرا اقبال

زاہدہ حنا

پیدائش: 1946ء

زاہدہ حنا 5 اکتوبر 1946ء کو سہسرام میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد محمد ابوالخیر ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہوئے۔ ساتویں جماعت میں سکول داخل ہونے سے پہلے اُن کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ زاہدہ حنا پاکستان کی مشہور کالم نویس اور شاعرہ ہیں۔ جون ایلیا اَدبی رسالے ''انشا'' کے مدیر تھے جہاں اُن کی ملاقات زاہدہ حنا سے ہوئی اور پھر بعد میں دونوں نے شادی کر لی۔ جون اور زاہدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا لیکن ان کی شادی نہ چل سکی۔ زاہدہ حنا اپنے انداز کی ایک ترقی پسند دانش ور کالم نویس ہیں اور اب بھی دو روز ناموں روز نامہ ''جنگ'' اور ''ایکسپریس'' میں حالاتِ حاضرہ اور معاشرتی موضوعات پر دلیری اور بے باکی سے لکھتی ہیں۔ انھوں نے کالم نویسی کے علاوہ افسانہ اور ناول نگاری میں بھی اہم مقام حاصل کیا ہے۔ اُن کے رُجحان ساز افسانے قاری پر ایسا اثر چھوڑ جاتے ہیں جن کی تاثیر وہ بعد میں بھی محسوس کرتا رہتا ہے اور اُن کے افسانوں کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُن کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ انھیں ''زیتون کی شاخ'' سے اَدبی اہمیت حاصل ہوئی۔ زاہدہ حنا دورِ جدید کے افسانوی اَدب کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ ترقی پسند تصورِ حیات رکھتی ہیں۔ وہ تاریخ اور ماضی سے لگاؤ رکھتی ہیں مگر اس حد تک کہ آشوبِ عصر کی معنویت ہاتھ آ سکے۔ انھیں فیض ایوارڈ، ساغر صدیقی اَدبی ایوارڈ، کے پی ایوارڈ اور سارک اَدبی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ انھوں نے مارشل لا حکومت کی طرف سے پیش کردہ صدارتی تمغہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

تصانیف: قیدی سانس لیتا ہے۔ راہ میں اجل ہے۔ رقصِ بسمل ہے۔ تتلیاں ڈھونڈنے والی۔ عورت: زندگی کا زنداں۔ نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔ درد کا شجر۔ زرد پتوں کا بن۔

نمونہ کلام: ''تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کونسلیٹ کی عمارت سے نکل کر پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ عمارت سے باہر نکلتے ہی سوندھی مٹی کی خوشبو سے معطر ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا''۔ (قیدی سانس لیتا ہے)

تحریر: نائب حسن

محسن نقوی

1947ء تا 1996ء

سید محسن نقوی کا اصل نام سید غلام عباس تھا۔ وہ 5 مئی 1947ء کو محلہ سادات ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان سے گریجویشن اور پھر جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے اُردو کیا۔ اسی دوران ان کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور لاہور کی اَدبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے جہاں انھوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ایک خطیب کے روپ میں سامنے آئے اور مجالس میں ذکرِ اہلِ بیت اور واقعاتِ کربلا کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت پہ لکھی ہوئی شاعری بیان کرتے تھے۔ محسن نقوی نے کئی اصناف کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس میں غزل، نظم، مرثیہ، قطعہ، اور رباعی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے غزل کے میدان میں اپنا نمایاں مقام بنایا اور غزل کی کلاسیکی اٹھان کو نہ چھوڑا اور اس کو ایک نئی جدت عطا کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فلم کے لیے گیت بھی لکھا ''لہروں کی طرح تجھ کو بکھرنے نہیں دیں گے'' اس گیت کے لیے انھیں ایوارڈ بھی ملا۔ انھوں نے نبی پاک اور آپ کے اہلِ بیت سے عشق و عقیدت کو اپنے اشعار کے ذریعے عیاں کیا۔ وہ ایک خطیب کی طرح مجالس میں ذکرِ اہلِ بیت اور واقعاتِ کربلا کو اپنی شاعری کے خوبصورت موتیوں میں پرو کر ہدیہ کرتے۔ آپ کو مرثیہ نگاری میں بھی کافی مہارت تھی۔ آپ کی شاعری میں خون، گواہی، کربلا، ریت، فرات، پیاس، وفا، اشک، دشت، لہو، عہد، قبیلہ، نسل، چراغ، مقتل، قتل، مکتب جیسے الفاظ اور علائم و رموز اکثر نظر آتے ہیں جن کا تعلق واقعہ کربلا سے جڑا محسوس ہوتا ہے۔ وہ 15 جنوری 1996ء کو انتقال کر گئے۔

تصانیف: طلوعِ اشک۔ عذابِ دید۔ بند قبا۔ اوراک فکر۔ برگِ صحرا۔ ردائے خواب۔ ریزہ حرف۔ رختِ شب۔ فراتِ فکر۔ موجِ ادراک۔

نمونہ کلام:

تو آسمان کی صورت ہے گر پڑے گا کبھی / زمیں ہوں میں بھی مگر تجھ کو آسرا دوں گا

بڑھا رہی ہیں مرے دکھ نشانیاں تیری / میں تیرے خط تری تصویر تک جلا دوں گا

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق / میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

تحریر: انعم زہرا

سعادت سعید
پیدائش: 1949ء

سعادت سعید 15 مارچ 1949ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ڈاکٹر اللہ دتہ (الف۔د) نسیم بھی اُردو زبان کے اُستاد تھے۔ سعادت سعید نے ابتدائی تعلیم ساہیوال سے حاصل کی۔ سعادت سعید نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1967ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی۔اے کیا، اس کے بعد اعلا تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ 1969ء میں اُنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔اے اُردو کا امتحان پاس کیا اور بہترین کارکردگی پر اُنھیں طلائی تمغے اور بابائے اُردو گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ 1988ء میں اُنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے اُردو زبان واَدب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ سعادت سعید نے اپنے تدریسی کیرئیر کا آغاز 1970ء میں بہ طور لیکچرر گورنمنٹ کالج راوی روڈ سے کیا۔ اسی سال وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج لائل پور سے وابستہ ہوئے۔ تین برس بعد وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور آ گئے۔ جہاں اُنھوں نے 1986ء تک خدمات سرانجام دیں۔ بعدازاں وہ اسسٹنٹ پروفیسر منتخب ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ 2009ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی بہ طور سینئر وزیٹنگ پروفیسر تعینات رہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید اُردو زبان واَدب سے تعلق رکھنے والے معروف نقاد شاعر اور محقق ہیں۔ آپ کی وجہِ شہرت آپ کی نثری شاعری ہے جس کے آپ بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ سعادت سعید نے تنقید، شاعری اور تحقیق کے میدان میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

تصانیف: کلی بن (نظموں کا مجموعہ)۔ جہت نمائی (دستاویز مطبوعات)۔ راشد اور ثقافتی مغائرت۔ اقبال اور مجلہ راوی۔ تہذیب، جدیت اور ہم۔ فنون آشوب (طویل نظم)۔ شناخت (شعری مجموعہ)۔ اقبال ایک ثقافتی تناظر۔ بانسری چپ ہے (شعری مجموعہ)۔

نمونہ کلام:

توڑ ڈالیں گے وہ طبقات کے بُت — بُت شکن عظمت رب تک پہنچے
آنکھوں سے وہ کبھی مری اوجھل نہیں رہا — غافل میں اس کی یاد سے اک پل نہیں رہا
کتنے منظر تھے جنھیں خلد کے منظر کہیے — روپ کی نگری میں سنگیت کے ساگر کہیے

تحریر: اقرا شہزادی

مظہر الاسلام
پیدائش: 1949ء
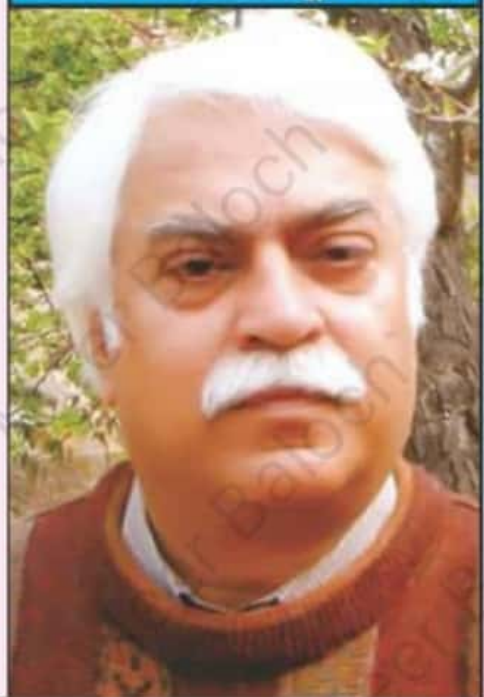
مظہر الاسلام 4 اگست 1949ء کو خانیوال میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محکمہ جنگلات میں تعینات تھے۔ مظہر الاسلام نے بچپن وزیر آباد میں گزارا اور مشن ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ وہ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں بھی زیرِ تعلیم رہے مگر والد کی وفات کے بعد مستقل طور پر اسلام آباد میں رہایش اختیار کر لی جہاں سے اُنھوں نے اُردو ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ ٹی وی، وزارتِ تعلیم اور ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہے۔ اس کے بعد ''لوک ورثہ'' کے قومی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ایک بے چین، پُردرد، دل چسپ اور حیران کن افسانہ نگار و ناول نگار ہیں۔ اُن کی کہانیوں کا موضوع محبت، انتظار، موت اور جدائی ہے۔ وہ محبت کی تلاش میں بھٹکنے والوں، بچھڑے ہوئے لوگوں، آزادی ڈھونڈنے والے اور روٹھے ہوئے کرداروں کی کہانیاں انوکھے انداز میں لکھتے ہیں۔ اُنھوں نے خاکروبوں، چٹھی رسانوں، کلرکوں، مدرّسوں، مزدوروں، کسانوں اور خانہ بدوشوں جیسے کرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے عہد کی روشنی میں ناقابلِ برداشت صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کی کہانیاں انگریزی، جرمن، چینی، فارسی، ہندی، گرمکھی اور سندھی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ وہ اکادمی اَدبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے اُنھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا ہے۔ اُنھیں لوک ورثہ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

تصانیف: محبت: مردہ پھولوں کی سمفنی۔ باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی۔ گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی۔ میں آپ اور وہ۔ خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر۔ بولیاں (ترجمہ)۔ فوک لور کی پہلی کتاب۔ لوک پنجاب۔ دعا: دکھ اور محبت کے موسموں کا پھول۔ گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو۔

نمونہ کلام: ''کہنے لگی، آج کل تو خوف کا موسم ہے۔ باتوں کی بارشوں کا موسم ہے۔ آنکھیں بھیگی ہوئی برساتیوں کی طرح ادھ کھلے دروازوں پر لٹکی ہوئی ہیں۔ سہمی ہوئی روشنی ان کے پیچھے چھپتی پھر رہی ہے۔''

تحریر: حبیب سلطان

صابر ظفر
پیدائش: 1949ء

صابر ظفر 12 ستمبر 1949ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام مظفر احمد اور تخلص ظفر ہے۔ انھوں نے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔ 1968ء سے شاعری کرنا شروع کر دی اور دو سال بہ ذریعہ ڈاک رئیس امروہوی سے اصلاح لی۔ ماہ نامہ "اپنی زمین" میں کچھ عرصہ بہ طور معاون مدیر کام کیا۔ اُن کی شاعری کی دو جہتیں ہیں، ایک تو روایتی غزل ان کا بنیادی حوالہ ہے اور دوسرا گیت نگاری۔ ظفر نے اپنی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کر کے لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ وہ غزل کی روایت کو مضبوط کرنے والے عہدِ حاضر کے شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ فنِ خطاطی کے بھی ماہر ہیں۔ اُن کے گیت "ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار" اور دوسرا فلم "جناح" کا "جنون سے اور عشق سے" بہت مقبول ہوئے۔ اُن کے کلیات میں اُن کے پہلے دس مجموعۂ کلام کو یک جا کیا گیا ہے۔ ظفر کی شاعری اپنے اندر بہت سے موضوعات کو سموئے ہوئے ہے۔ اُن کی غزلوں اور گیتوں کے اکتالیس مجموعے چھپ چکے ہیں۔

تصانیف: ابتدا۔ دھواں اور پھول۔ پاتال۔ جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی۔ دریچہ بے صدا کوئی نہیں۔ لہو ترنگ۔ دکھوں کی چادر۔ بارہ دری میں شام۔ عشق میں روگ ہزار۔ ایک تری یاد رہ گئی باقی۔ چین اک پل نہیں۔ بے آہٹ چلی آتی ہے موت۔ اپنے رنگوں میں ڈوب جانے والے۔ محبت کا نیل کنٹھ۔ کوئی لو چراغِ قدیم کی۔ نامعلوم۔ پرندوں کی طرح شاہین۔ محبت دور کی آواز تھی۔ سانول موڑ مہاراں۔ زنداں میں زندگی امر ہے۔ خاموش بدن کی خود کلامی۔ ہر چیز کلام کر رہی ہے۔ ستارہ وار سخن۔ آئینوں کی راہداریاں۔ غزل خطاطی۔ ابا سین کے کنارے۔ صندل کی طرح سلگتے رہنا۔ سب اپنے خیال کی دھنک۔ غزل اندر غزل، گردش مرثیہ۔ پلکوں میں پروئی ہوئی رات۔ سرِ بازار میں رقصم۔ جمال ماورائے جسم و جاں۔ رانجھا تخت ہزارے کا۔ اساطیر کم نما۔ آوارگی کے پر کھے۔ غزل نے کہا۔ لہو سے دستخط۔ شہادت نامہ۔ مذہبِ عشق۔

نمونہ کلام:

کوئی تو ترکِ مراسم پہ واسطہ رہ جائے
وہ ہم نوا نہ رہے صورت آشنا رہ جائے

میں نہ چاہوں کسی فانی میں فنا ہو جانا
تم اگر ملنا مجھے، میرے خدا ہو جانا

تحریر: اقصیٰ شفیق

راحت اندوری
1950ء تا 2020ء
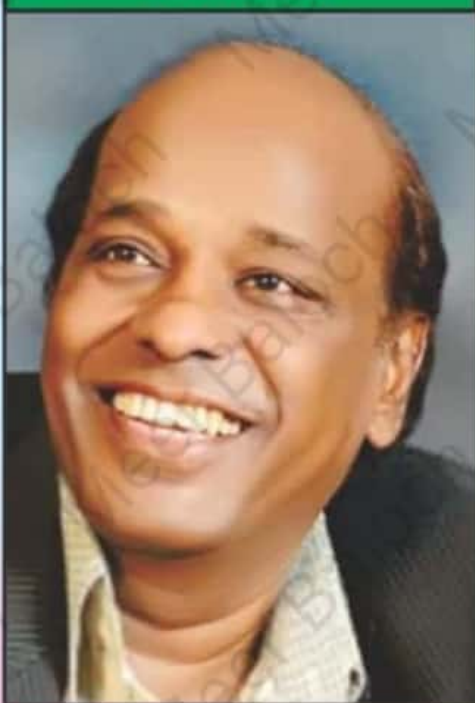
راحت اندوری یکم جنوری 1950ء کو اندور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اصل نام راحت قریشی ہے مگر اندور کی نسبت سے راحت اندوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کے والد رفعت اللہ قریشی ٹیکسٹائل مل میں ملازم تھے۔ اُن کی والدہ کا نام مقبول النسا بیگم تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم نوتن سکول اندور میں حاصل کی اور اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے بیچلر کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انھوں نے برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال سے اُردو ادب میں ایم اے کیا۔ انھوں نے مدھیہ پردیش کے مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونی ورسٹی سے 1985ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر اور گیت کار ہیں، انھوں نے بہت سے ایسے نغمے لکھے جو بالی وڈ فلموں میں گائے گئے جو کہ بہت مقبول اور ہر زبان زدِ عام بھی ہوئے ہیں۔ وہ اندور یونی ورسٹی میں اُردو ادب کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی بھارتی ٹیلی ویژن شوز کا حصہ بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے کئی گلوکاری کے ریلیٹی شوز میں بہ طور جج بھی حصہ لیا ہے۔ انھوں نے نوجوان نسل کو کئی اہم ترین باتیں بتائی ہیں جو ان کے فنی سفر، تلفظ اور گلوکاری میں معاون ثابت ہوئے۔ وہ ایک غنائی شاعر ہیں اور ادبی دنیا میں ترقی کی راہ پر رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وہ نوجوان نسل کے مقبول ترین شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب وہ اپنے مخصوص انداز میں لہک لہک کر اپنا کلام سناتے ہیں تو مشاعرے میں سماں باندھ دیتے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ 11 اگست 2020ء کو اندور میں کورونا وائرس اور دیگر امراض کے باعث انتقال کر گئے۔

تصانیف: ناراض۔ میرے بعد۔ موجود۔ دو قدم اور سہی۔ چاند پاگل ہے۔ رت۔ دھوپ بہت ہے۔

نمونہ کلام:

اس کی یاد آئی ہے سانسو ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

تم نے جو توڑ دیے خواب ہم ان کے بدلے
کوئی قیمت بھی لیتے تو خدائی لیتے

تحریر: ثنا منور

نیلم احمد بشیر

پیدائش: 1950ء

نیلم احمد بشیر 17 جنوری 1950ء کو ملتان میں پیدا ہوئیں۔ والدین کی پہلی اولاد تھیں۔ رسم کے مطابق اپنے ننھیال ملتان میں پیدا ہوئیں، اس سے زیادہ ان کا اس شہر سے اور کوئی تعلق نہیں۔ اُن کے والد کا نام احمد بشیر تھا جو ایک مشہور صحافی تھے۔ صحافت کے علاوہ ان کے والد اَدب اور فنونِ لطیفہ سے بھی منسلک تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں ادیبوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ممتاز مفتی اور ابنِ انشا نے نیلم کی بچپن میں رہنمائی بھی کی اور دوستوں کی طرح ان کے ساتھ وقت بھی گزارا۔ ابنِ انشا کی لائبریری میں اُنھوں نے کئی کتابیں پڑھیں اور مشاعرے میں بھی شرکت کیا کرتی تھیں۔ سکول کی تعلیم کراچی میں مکمل کی۔ کالج میں داخلے کے وقت لاہور آ گئیں۔ بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی نیو کیمپس میں سائیکالوجی میں داخلہ لیا۔ اُنھیں بچپن سے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن لکھنے کا کام دیر سے شروع کیا۔ شادی کے بعد امریکہ چلی گئیں۔ اُن کے تین بچے ہوئے لیکن خاوند سے نہ بن سکی اور اس طرح ان سے علاحدگی اختیار کر کے واپس کراچی آ گئیں اور دوبارہ قلم سے دوستی کر لی۔ اُن کی شہرت کی وجہ ان کی افسانہ نگاری ہے لیکن اُنھوں نے خاکے، ناول، شاعری اور سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتی ہیں۔ سہل پسندی کی قایل نہیں اور رواں لکھتی ہیں۔ انسانی معاملات کے نشیب و فراز کو وہ اپنی تحریر کا حصہ بناتی نظر آتی ہیں اور اُنھیں فن کارانہ انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔

تصانیف: گلابوں والی گلی۔ جگنوؤں کے قافلے۔ لے سانس بھی آہستہ۔ ستم گر ستمبر۔ ایک تھی ملکہ۔ وحشت ہی سہی۔ نیپال نامہ۔ چار چاند۔ ہزار جزیرے۔

نمونہ کلام: ''دونوں جوان تھے، خوبرو تھے۔ بلا کے ذہین اور ایک سی سوچ رکھنے والے۔ گھنٹوں گپ شپ کرتے، بحثیں کرتے اور فلسفے جھاڑتے رہتے۔ وہ اسے کبھی کبھار چھیڑ کر ''فلسفیہ'' بھی کہہ ڈالتا تھا جس پر وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جایا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کی اذیت سے خوف نہیں محسوس کرتے تھے بل کہ ایک دوسرے کو جگہ دیتے تھے، محسوس کرتے تھے۔'' (اجازت)

تحریر: اقرا شبیر

پروین شاکر

1952ء تا 1994ء

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ پروین شاکر کے والد کا نام سید شاکر حسن تھا۔ پروین ایک ہونہار طالبہ تھیں۔ دورانِ تعلیم وہ اُردو مباحثوں اور ریڈیو پاکستان کے علمی و اَدبی پروگراموں میں شرکت کرتی رہیں۔ انگریزی اَدب میں جامعہ کراچی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ٹرینٹی کالج اور ہاورڈ یونی ورسٹی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ پروین شاکر استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہیں اور بعد میں آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ پروین شاکر کو اُردو کی منفرد لہجے کی شاعرہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں وہ شہرت حاصل ہوئی جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہو پائی ہے۔ پروین کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی لیکن یہ رشتہ برقرار نہ رہ سکا۔ شاعری میں آپ کو احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل رہی۔ آپ کا بیش تر کلام ان کے رسالے فنون میں شایع ہوتا رہا۔ پروین شاکر کی پوری شاعری ان کے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ہے جو درد کائنات بن جاتا ہے اس لیے اُنھیں دورِ جدید کی شاعرات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اُن کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' میں ایک نوجوان دوشیزہ کے شوخ و شنگ جذبات کا اظہار ہے اور اس وقت پروین شاکر اس منزل میں تھیں۔ زندگی کے سنگلاخ راستوں کا احساس تو بعد میں ہوا جس کا اظہار ان کی بعد کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ماں کے جذبات شوہر سے ناچاقی اور علاحدگی، ورکنگ وومن کے مسایل کو اُنھوں نے بہت خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے۔ عشقیہ شاعری پر مرد شعرا کی اجارہ داری تھی لیکن پروین شاکر وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اس رسم پر ایسا ہتھوڑا چلایا کہ اس سے پڑھنے والے دنگ رہ گئے۔ پہلی بار شاعرات کو یہ احساس ہوا کہ عورتوں کی شاعری یوں بھی کی جا سکتی ہے۔ اُنھوں نے 26 دسمبر 1994ء کو اسلام آباد میں حادثے میں وفات پائی۔

تصانیف: خوشبو۔ خود کلامی۔ صد برگ۔ انکار۔ ماہِ تمام (کلیات)۔

نمونہ کلام:

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے — وہاں سے محبتوں کا زوال ہوتا ہے

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی — اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

تحریر: فیصل شہزاد

محمد ایاز راہی

پیدائش: 1958ء
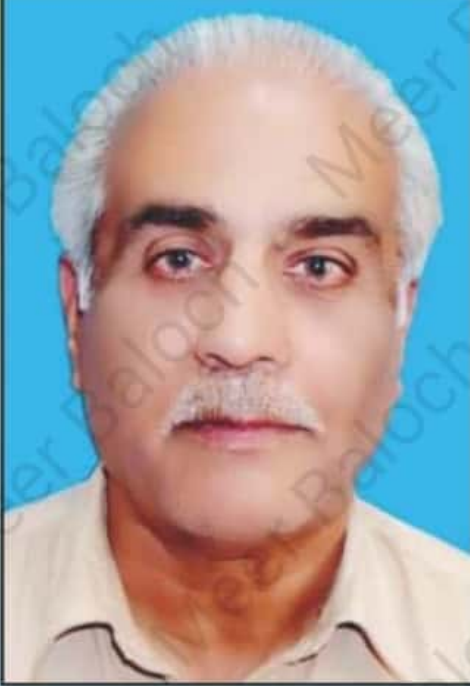
محمد ایاز راہی کی پیدائش 3 مارچ 1958ء کو مانسہرہ ہوئی۔ آپ کا تعلق مزدور گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد بہ طور کاریگر ایک ٹیکسٹائل مل سے وابستہ تھے۔ اُن کا بچپن مانسہرہ اور خانیوال میں گزرا، خانیوال میں ہی سکول کی تعلیم شروع کی۔ بچپن میں پڑھنے کے علاوہ کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ ہاکی اور باکسنگ سے بھی لگاؤ تھا۔ محمد ایاز راہی نے اپنی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں پرائمری سکول دی کوآپریٹو ٹیکسٹائل ملز کالونی خانیوال سے کیا۔ نویں جماعت میں پورے سکول میں نمایاں پوزیشن حاصل کی لیکن اس کے بعد آپ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور آپ کو فیکٹری میں ملازمت کرنا پڑی۔ آپ نے عملی زندگی کا آغاز خانیوال سے کیا۔ روزگار کے سلسلے میں آپ نے پنجاب اور خیبر پختونخوا کے مختلف شہروں میں قیام کیا اور مختلف کارخانوں اور نجی اداروں میں معمولی نوعیت کی نوکریاں کیں۔ ایاز راہی فنکا مائیکرو فنانس بنک سے بھی منسلک رہے۔ اُن کی پہلی کتاب ''یادوں کی بستی'' 2013ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اُن کے خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج ہیں۔ اس کے بعد اُن کی پانچ مزید کتابیں یکے بعد دیگرے اشاعت پذیر ہوئیں جن میں افسانے، خاکے، شذرات، مضامین اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ ایاز راہی کی سب سے بڑی خاصیت اُن کا وہ منفرد اور اچھوتا اُسلوب ہے جو اُنھوں نے انتہائی کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے اَدبی اظہار کے لیے تشکیل دیا ہے۔ اُنھیں اپنے اُسلوب کی وجہ سے جدید مصنفین میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ خطوط کے اس مجموعے ''یادوں کی بستی'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانے بے باک اور منٹو سے متاثر نظر آتے ہیں۔

تصانیف: یادوں کی بستی۔ دیارِ قلم۔ منٹو کی راہ پر۔ غالب کے حضور۔ قدرِ ایاز۔ غبارِ منٹو اور میں۔

نمونہ کلام: سکول سے فارغ ہو کر نوروز خان نے کالج کی نئی دنیا میں قدم رکھا تو اِدھر گاؤں میں پری جان کے شباب نے انگڑائی لی۔ گاؤں کی فضا دم بہ خود ہو کر ششدر رہ گئی۔ نور کے سانچے میں ڈھلا ہر ایک اَنگ۔ گورا رنگ۔ بال کالی گھٹا بلکہ اس سے بھی سوا۔ کشادہ پیشانی۔ تیکھے اور کھڑے نقوش۔''

تحریر: محمد معین

فرحت پروین

پیدائش: 1959ء

فرحت پروین نے یکم جنوری 1959ء کو بھکر میں آنکھ کھولی۔ اُن کا بچپن لاہور میں گزرا اور بھکر میں تعلیم حاصل کی۔ شادی کے بعد وہ سعودی عرب چلی گئیں اور اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اُنھوں نے اُردو اور انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد یونی ورسٹی آف راچیسٹر سے انشا پردازی (Creative Writing) کا کورس کیا اور طالب علموں کے ساتھ مل کر اُردو کے لیے بہت کام کیا اور یہیں اُن کا پہلا افسانہ ''سلگن'' منظرِ عام پر آیا جس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرحت پروین نے افسانوں کی دنیا میں اپنی منفرد اور الگ پہچان بنائی۔ وہ سادگی پسند اور ان کا وجود محبت کی مٹی سے بنا ہے۔ انسانی نفسیات کو وہ اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات انسانی نفسیات کے علاوہ معاشی ناہمواری، طبقاتی تفریق، انسانی حقوق کا استحصال، مفلس اور زردار کے مابین بڑھتا ہوا فاصلہ، گھٹی روایات، ٹوٹتی اقدار اور اخلاقی معیار پر مبنی ہیں۔ وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں لیکن پھر بھی ان کا اُردو افسانہ معیاری ہے۔ اُنھوں نے امریکی معاشرے کی ہی کہانیاں نہیں لکھیں بل کہ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے نازک مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ جذبات نگاری میں وہ ملکہ رکھتی ہیں اور منظر کشی کا اچھوتا انداز اُنھیں باقی افسانہ نگاروں سے ممتاز حیثیت دلاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان شستہ اور اسلوب رواں دواں ہے۔ وہ افسانے کے فن سے بہ خوبی آشنا ہیں۔ اُنھوں نے علامتی افسانوں میں بھی قلم آزمائی کی ہے۔ وہ رفاہی کاموں میں بھی پیش پیش رہتی ہیں، اس کے علاوہ وہ احمد ندیم قاسمی ایوارڈ کی بانی ڈائریکٹر بھی ہیں۔

تصانیف: منجمد۔ ریستوران کی کھڑکی سے۔ کانچ کی چٹان۔ صندل کا جنگل۔ بزمِ شیشہ گراں۔ گفتم (نظموں کا مجموعہ)۔ خوابِ زمستاں (عالمی اَدب سے منتخب کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ)۔ انگریزی سائنسی ناول "The Giver" کا اُردو ترجمہ۔

نمونہ کلام: ''آج میرے محسوسات کل سے مختلف تھے۔ زندگی بہت پُرکشش ہے اور یہ سارا نظام، یہ سارے سلسلے زندہ رہنے ہی کی تو کوشش ہیں۔'' (منجمد)

تحریر: ابدال رضا

عباس تابش
پیدائش: 1961ء

عباس تابش 15 جون 1961ء کو میلسی ضلع وہاڑی میں پیدا ہوئے۔ 1977ء میں اُنھوں نے میلسی سے میٹرک کیا اور مختلف مقامی اخبارات میں کام کرنے لگے۔ 1981ء میں پرائیویٹ ایف اے کیا اور لاہور آ کر روزنامہ جنگ میں ملازمت کرنے لگے۔ اس ملازمت کے دوران ہی اُنھوں نے 1984ء میں بی اے کیا اور 1986ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کیا جس کے بعد بہ طور لیکچرر اپنے فرائض مختلف کالجز میں سرانجام دینے لگے۔ آپ دورانِ تعلیم رسالہ ''راوی'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ گورنمنٹ کالج فار بوائز گلبرگ لاہور میں شعبہ اُردو کے سربراہ رہے۔ آپ موجودہ دور کی غزل کے نمایندہ شاعر ہیں جو مقبولیت کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔ آپ ناروے، دبئی، آسٹریلیا، مسقط، شارجہ، برطانیہ، ہندستان اور امریکہ کے کئی مشاعروں میں بھی شرکت کر چکے ہیں۔ آپ کو مختلف ملکی و غیر ملکی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اُن کی غزل میں زندہ اشعار ملتے ہیں۔ اُنھوں نے ماں جیسی عظیم ہستی پر کلام لکھا۔ اُن کی شاعری میں دکھ درد کی فضا بھی نمایاں پائی جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک شعر ایک ذاتی واردات کا درجہ رکھتا ہے، وہ اس کو کوئی نظریہ یا فلسفہ نہیں سمجھتے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے اُنھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی بھی عطا کیا گیا ہے۔

تصانیف: تمہید۔ آسمان۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔ پروں میں شام ڈھلتی ہے۔ عشق آباد (کلیات)۔ رقص درویش۔ جب تیرا ذکر غزل میں آئے (انتخاب)

نمونہ کلام:

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

تم مانگ رہے ہو مرے دل سے مری خواہش
بچہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا

کیوں نہ اے شخص تجھے ہاتھ لگا کر دیکھوں
تو مرے وہم سے بڑھ کر بھی تو ہو سکتا ہے

یہی اک شغل رکھنا ہے اذیت کے دنوں میں بھی
کسی کو بھول جانا ہے کسی کو یاد کرنا ہے

تحریر: حبیبہ منظور

ذیشان ساحل
1961ء تا 2008ء

ذیشان ساحل نے 15 دسمبر 1961ء کو حیدرآباد میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں ان کا پاؤں پولیو کی وجہ سے خراب ہوا اور اس کے علاوہ کائی فوسکولیوسس نامی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مرض کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ وہیل چیئر پر گزارا۔ 1977ء سے اُنھوں نے شاعری کو اپنا ذریعہ اظہار بنا لیا۔ ابتدا میں اُنھوں نے غزل کی طرف توجہ دی مگر پھر نثری نظم کی طرف ان کی طبیعت ایسی مائل ہوئی کہ نثری نظم ان کی وجہ پہچان بن گئی۔ اُن کی نظمیں ایسا منظر پیش کرتی ہیں جس کی سطح خوب صورت ہے اور رنگین بھی ہے۔ حیرت ہے کہ ذیشان ساحل نے بیماری کی حالت میں اپنے تجربات و مشاہدات کو گہری نظر سے کس طرح گزارا ہوگا۔ وہ اپنی نظموں میں معمولی واقعات کو پاکیزگی اور معصومیت سے پیش کرتے ہی ہیں لیکن ہول ناک اور دردناک واقعات کے بیان میں بھی وہ پاکیزگی و معصومیت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا توہین سخن سمجھتے ہیں۔ ذیشان کی شاعری ایک الگ ماحول میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے سرسری مشاہدات و تجربات سے گریز کیا کیوں کہ وہ گہری نظر سے ہر چیز کو دیکھنے کے عادی تھے اور اسے اپنی شاعری میں الفاظ کے حسین انتخاب سے اس طرح برتتے تھے کہ حقیقت کا روپ نکھر کر سامنے آ جاتا تھا۔ اُنھوں نے سادہ اور عام فہم الفاظ کا ستعمال کیا۔ اُن کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ تہمینہ احمد نے "On The Outside" کے نام سے کیا۔ آخری دنوں میں وہ ایک ناول لکھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ سانس کی دقت کی وجہ سے ان کا انتقال 12 اپریل 2008ء کو کراچی میں ہوا۔

تصانیف: ایرینا۔ چڑیوں کا شور۔ کہر آلود آسمان کے ستارے۔ جنگ کے دنوں میں۔ کراچی اور دوسری نظمیں۔ ای میل اور دوسری نظمیں۔ شب نامہ اور دوسری نظمیں۔ نیم تاریک محبت۔ ساری نظمیں۔ وجہ بیگانگی۔

نمونہ کلام:

کھڑکی کے رستے سے لایا کرتا ہوں
میں باہر کی دنیا خالی کمرے میں

''سفید کاغذ پر / پنسل کے چلنے کی آواز / بہت کم ہے / سڑک پر ٹینک گزرنے کی آواز / اس سے کچھ زیادہ ہے / اور شاید میری آواز / ان دونوں آوازوں سے زیادہ ہے'' (چڑیوں کا شور)

تحریر: ابدال رضا

مشرف عالم ذوقی
پیدائش: 1962ء

مشرف عالم ذوقی 24 مارچ 1962ء کو آرہ، بہار میں پیدا ہوئے۔ ذوق کے کلام کی پسندیدگی پر والد نے ان کا تخلص ذوقی رکھ دیا۔ ذوقی کے والد کا نام مشکور عالم بصیری تھا جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ انگریزی ادب، سائنس، قرآن شریف، حدیث، گیتا، رامائین ہر قسم کے مطالعے پر دسترس رکھتے ہیں۔ گھر کی لائبریری میں اُردو اور انگریزی کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ ادبی ماحول نے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا اور گیارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی لکھی۔ اُنھوں نے آرہ اور دلی سے تعلیم حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ملازمت کے بہ جائے ہمہ وقتی فکشن نگار بن گئے۔ مشرف عالم ذوقی کی وابستگی ادب کے علاوہ میڈیا سے بھی ہے۔ پہلا افسانہ ''کہکشاں'' تیرہ برس کی عمر میں شایع ہوا اور پہلا ناول سترہ برس کی عمر میں ''عقاب کی آنکھیں'' کے نام سے تخلیق کیا۔ ذوقی فلمز کے بینر تلے کئی دستاویزی فلمیں اور سیریل بھی بنائے۔ ذوقی نے گانے بھی لکھے اور سکرین پلے بھی اور ڈائرکشن بھی دی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے پندرہ برس تک وابستہ رہے۔

تصانیف: صبح۔ انجمن۔ اپنا آنگن۔ عقاب کی آنکھیں۔ لمحہ آئندہ۔ نیلام گھر۔ ذبح۔ شہر چپ ہے۔ مسلمان۔ بیان۔ پو کے مان کی دنیا۔ لے سانس بھی آہستہ۔ آتش رفتہ کا سراغ۔ اڑنے دو ذرا۔ نالہ شب گیر۔ سب سازندے۔ کہکشاں۔ بھوکا ایتھوپیا۔ منڈی۔ غلام بخش۔ صدی کو الوداع کہتے ہوئے۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے۔ ایک انجانے خوف کی ریہرسل۔ نفرت کے دنوں میں۔ جلتے بجھتے دیپ۔ لمحہ رشتوں کی صلیب۔ بازار میں ایک رات۔ فزکس، کیمسٹری، الجبرا۔ شاہی گل دان۔ مشرف عالم ذوقی کی رومانی کہانیاں۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی۔ ایک سڑک ایودھیا۔ گڈبائے راج نیتی۔ پنگوئن۔ راج محل۔ وائی۔ لپروسی کیمپ۔ آب روان کبیر۔ سرخ بستی۔ فسٹوی کہانیاں۔ وبھاجن کی کہانیاں۔

نمونہ کلام: ''زندگی لوڈو کا کھیل بن گئی تھی ہر خانے پر سانپ تھا آپ پانسہ کہاں چلیں گے ہر خانہ پر سانپ۔۔۔سانپ رینگ رہے ہیں مادہ اور نر کتا۔ لوڈو کا کھیل، سانپ، سیڑھی۔''

تحریر: عالیہ سعید

نوشی گیلانی
پیدائش: 1964ء

نوشی گیلانی 14 مارچ 1964ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا اصل نام نشاط مسعود ہے۔ اُن کے والد ڈاکٹر تھے۔ نوشی نے بہاول پور یونی ورسٹی سے گریجوایشن کی جب کہ اُردو ادب، اقبالیات اور فارسی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ 1995ء میں نوشی کی شادی فاروق طراز کے ساتھ ہوئی اور وہ امریکہ چلی گئیں مگر کچھ عرصہ بعد ان سے علاحدگی ہو گئی۔ نوشی گیلانی اسلامیہ یونی ورسٹی بہاولپور میں اُردو کی استاد کی حیثیت سے بھی کام کرتی رہیں۔ اکتوبر 2008ء میں نوشی گیلانی سڈنی میں مقیم ایک شاعر سعید خان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ نوشی بابا بلھے شاہ کی معتقد ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''محبتیں جب شمار کرنا'' 1993ء میں منظر عام پر آیا اور اسے خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُن کی شاعری بے تکلفی اور خالص نسائی لہجے کی وجہ سے جدید اُردو شاعری میں اہم مقام رکھتی ہے۔ نوشی کی بہت سی نظموں کے انگریزی میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ نوشی نے Less Murray کی شاعری کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اُردو اکیڈمی آسٹریلیا کی شریک بانی بھی ہیں۔ وہ غزل اور نظم دونوں ہیئتوں کی شاعرہ ہیں۔ نوشی کا مخاطب پورا سماج ہے جس کے خلاف اُن کی آواز ایک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے لہجے کی انفرادیت عہد آیندہ کی غماز ہے۔ اُن کے ہاں صرف جذبات کی جلد باز ترجمانی کا نام شاعری نہیں بل کہ وہ قدیم و جدید اُردو ادب، عالمی ادب، تہذیبی، تاریخی اور روحانی مکاتب فکر سے بھی استفادہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ بابا بلھے شاہ کے کلام سے بے حد متاثر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے ہاں تصوف کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ اُن کا کلام مشرقی عورت کے جذبات کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

تصانیف: محبتیں جب شمار کرنا۔ اداس ہونے کے دن نہیں۔ پہلا لفظ محبت لکھا۔ ہم تیرا انتظار کرتے رہے۔ اے میرے شریک وصل جاں۔

نمونہ کلام:

مزاروں پر محبت جاودانی سن رہے تھے
کبوتر کہہ رہے تھے ہم کہانی سن رہے تھے

کسی حرف میں کسی باب میں نہیں آئے گا
ترا ذکر میری کتاب میں نہیں آئے گا

تحریر: ہمیرا انصاری

وصی شاہ
پیدائش: 1976ء
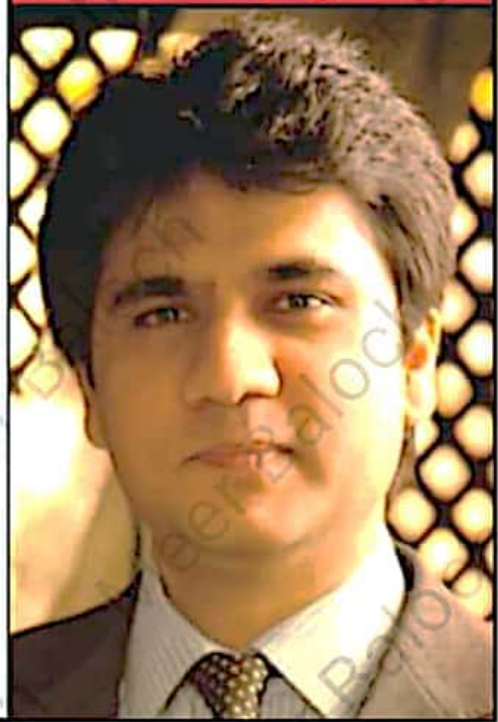
وصی شاہ ایک معروف اور کام یاب شاعر، صداکار، ڈرامہ نگار، کالم نگار، مصنف، اینکر اور اداکار ہیں۔ وہ یکم جنوری 1976ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ وصی شاہ نے اپنے کیریئر کا آغاز اپنے سکرپٹ پرمبنی سیریل میں اداکاری کر کے کیا، اُنھوں نے شاعری میں اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے لئے اداکاری چھوڑ دی۔ اُن کی عمر سات سال تھی جب ان کے والد کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وصی شاہ نے 2001ء میں شادی کی جس سے ان کے چار بچے ہیں۔ اُنھوں نے بیچلر آف کامرس ڈگری حاصل کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ نوکری نہیں کریں گے اور اَدب اور شاعری کو بہ طور پیشہ اپنائیں گے۔ معروف شاعر عباس تابش نے پہلے پہل وصی شاہ کی اَدبی حلقوں میں پہچان بنائی۔ اُنھوں نے اُنھیں اپنی پہلی کتاب "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" کا مسودہ عباس تابش کو دکھایا جنھوں نے اُس کی کم زوریوں اور خامیوں کو دور کرنے اور نوک پلک سنوارنے کے بعد اسے شایع کردیا۔ وصی شاہ کی کتاب نوجوانوں میں مقبول ہوئی اور اچھی خاصی تعداد میں فروخت ہوگئی۔ ان دنوں کاوش بٹ نے ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مل کر گجرات میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا جس میں عباس تابش نے شاعر کے طور پر وصی شاہ کو عوامی سطح پر متعارف کروایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وصی شاہ نے کسی بڑے مشاعرے میں براہ راست شاعری پیش کی۔ ڈراموں کے اسکرپٹ میں "تمھارے سوا"، "اک تمنا لاحاصل سے"، "تھوڑی سی جگہ چاہیے"، اور "بابل" شامل ہیں۔ اُنھیں اسکرپٹ کے لیے بہترین پلے مصنف کے زمرے میں نامزد کیا گیا تھا۔ وہ ٹی وی ٹاک شوز "سیاسی تھیٹر"، اور "رات گئے" کی میزبانی کرتے رہے ہیں۔

تصانیف: تھوڑی سی جگہ چاہیے۔ کان پور سے کٹاس تک۔ شکن۔ بابل۔ اک تمنا لاحاصل سی۔ مجھے صندل کردو۔ میرے ہوکے رہو۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ میرے خواب تمھاری آنکھیں۔

نمونہ کلام:

اپنے احساس سے چھوکر مجھے صندل کردو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کردو

نہ تمھیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کردو

تحریر: زوبیہ ظفر

عمیرہ احمد
پیدائش: 1976ء

عمیرہ احمد 10 دسمبر 1976ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مرے کالج سیال کوٹ سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور آرمی پبلک کالج سے بہ طور معلمہ وابستہ ہوئیں۔ عمیرہ احمد نے اپنے اَدبی سفر کا آغاز 1998ء میں کیا جب ماہ نامہ "خواتین" میں اُن کا قسط وار ناول "زندگی گلزار ہے" شایع ہوا۔ پھر کے بعد دیگرے اُن کے کئی ناول منظر عام پر آئے۔ اُن کا اُسلوب اُس دور میں رائج ڈائجسٹ کہانیوں سے بالکل مختلف تھا۔ عمیرہ احمد کے بیش تر ناولوں میں مذہب کی طرف رجوع کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں ضمناً رومان کی چاشنی بھی موجود ہوتی ہے۔ ان کے ناول اخلاقی اعتبار سے سبق آموز ہیں۔ اُن کا انداز اتنا مقبول ہوا کہ ان کی بہت سی ہم عصر لکھنے والیوں نے اس کی تقلید کی۔ نجی ٹی وی چینلوں کی آمد سے قسط وار کہانیوں کو ڈراموں کی صورت ڈھالنے کا سلسلہ شروع ہوا جو تا حال جاری ہے۔ اُسی دور میں عمیرہ احمد نے ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھنا شروع کردیے اور 2005ء میں انڈس ویژن کے لیے "وجودِ لاریب" نامی ڈراما لکھا۔ عمیرہ احمد ایک زود نویس مصنفہ ہیں۔ اُنھیں بیسٹ رائٹر ایوارڈ، پاپولر چوائس ایوارڈ فار بیسٹ ینگ ٹیلنٹ اِن سکرین رائٹنگ اور لکس سٹائل ایوارڈ فار بیسٹ ٹی وی رائٹر بھی دیا گیا ہے۔ اُنھوں نے فلموں کے سکرپٹ بھی لکھے جن میں "بے حد"، "مٹھی بھر مٹی" اور "ایک تھی مریم" قابلِ ذکر ہیں۔

تصانیف: پیر کامل۔ زندگی گلزار ہے۔ میری ذات ذرہ بے نشاں۔ ایمان، امید اور محبت۔ من و سلویٰ۔ حاصل۔ لا حاصل۔ شہر ذات۔ ہم کہاں کے سچے تھے۔ میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے۔ امر بیل۔ آبِ حیات۔ تھوڑا سا آسماں۔ کنکر۔ محبت صبح کا ستارہ ہے۔ عکس۔ سحر ایک استعارہ۔ حسنہ اور حسن آرا۔ واپسی۔ شیریں۔ دربارِ دل۔ اڑان۔ مات۔ ڈائجسٹ رائٹر۔ الف۔

نمونہ کلام: "انسان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اُس کا دل کسی چیز کی گواہی دے رہا ہو مگر اُس کی زبان خاموش ہو۔ جب اُس کا دماغ چلا چلا کر کسی چیز کی صداقت کا اِقرار کر رہا ہو مگر اُس کے ہونٹ ساکت ہوں۔" (پیر کامل)

تحریر: میمونہ سحر

A Pictorial History of URDU LITERATURE

Compiled by: **Dr. Irfan Pasha**

اُردو اَدب میں ایک زمانے تک رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" ایک سکہ بند کتاب سمجھی جاتی تھی، جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لکھی گئی تھی۔ اُس کے بعد ایک طویل مدت تک تاریخِ اَدب اُردو، سکسینہ کی بنائی ہوئی قدامت پسندی کی روایت سے باہر نہ نکل سکی۔ بالآخر انیس سو ستر کی دہائی کا ابتدائی زمانہ تھا جب اَدبی تاریخ کے تصورات اور نظریات میں سماجی علوم کے اثرات سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور اِن تبدیلیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہمارے اس نئے دور میں میرے لائق شاگرد ڈاکٹر عرفان پاشا نے اَدبی تاریخ کو ایک نئے پہلو سے دیکھنے کی سعی کی ہے اور یہ ہے "اردو اَدب کی تصویری تاریخ"۔ یہ ایک چونکا دینے والا موضوع ہے۔ اس وقت یہ جملے قلم بند کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی کوئی مصور تاریخ عالمی اَدب میں لکھی گئی ہے یا نہیں؟ جواب بھی فوراً مل گیا ہے کہ میری یادداشت کے مطابق ایسی

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

کوئی تاریخ شاید نہیں لکھی گئی ہے۔ اگر کبھی آپ کو مل جائے تو ضرور خبر دیجیے۔ عرفان پاشا نے ایم فل کے لیے "اردو اَدب کی تاریخ کے ماخذات" پر یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور میں تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ شائع ہو چکا ہے اور تحقیق شناسوں نے اس مقالہ کو ایک عمدہ ریسرچ ماڈل قرار دیا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ عرفان پاشا کی یہ نئی کتاب بھی اَدب اور تاریخ کے قارئین کے لیے دل چسپی اور معلومات کا سامان فراہم کرتی رہے گی اور وہ اَدبی دنیا میں اپنے نئے تنقیدی اور تحقیقی کارنامے پیش کرتے رہیں گے۔

"اردو اَدب کی تصویری تاریخ" اردو اَدب کے قارئین کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ بعض تاریخوں میں ادیبوں شاعروں کی چند تصاویر شامل کر کے اس خواب کی ادھوری تعبیر تو ہوئی مگر تشنگی باقی رہی۔ یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، فیصل آباد اور بنک روڈ کیمپس کے شعبۂ اُردو کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کو پہلی بار یہ امتیاز اور اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ اُردو شعر و اَدب کے ڈھائی سو سے زائد مشاہیر کی چہار رنگی دیدہ زیب تصاویر سے مزین "اردو اَدب کی تصویری تاریخ" طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔ زمانے کی گرد میں گم ہو جانے والی اَدبی شخصیات کی تصاویر کی تلاش اور حصول ایک کٹھن کام تھا۔ ڈاکٹر عرفان پاشا اور اُن کے معاون سکالرز ہمارے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور اپنے بے پایاں جذبہ اور جستجو سے اس دیرینہ خواب کو تعبیر سے ہم کنار کیا۔ "اردو اَدب کی تصویری تاریخ" محض تصاویر کی جامع نہیں بلکہ اس میں جملہ مشاہیر

اَدب کے سوانح، احوال و آثار اور ان مشاہیر کی لسانی و اَدبی اہمیت کو بھی اختصار اور جامعیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ مندرجات کی تاریخی ترتیب سے اُردو زبان و اَدب میں عہد بہ عہد ہونے والے موضوعاتی و لسانی تغیرات کا ایک خاکہ قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر عرفان پاشا ایک منجھے ہوئے سکالر اور ماہر استاد ہیں جو اَدبی تاریخ کے ماخذات پر اعلیٰ پائے کا تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ وہ شعر و اَدب کے ذوقِ سلیم سے بھی بہرہ یاب ہیں۔ مواد کی ترتیب میں حسنِ تناسب اور انتخاب میں ذوقِ سلیم کی کارفرمائی نے کتاب کو ایک اَدبی دستاویز بنا دیا ہے۔

Department of Urdu

University of Education, Lahore.

Faisalabad Campus & Bank Road Campus